قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

نومبر 2013، قیمت -/15

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

گوشہ علی سردار جعفری

ماہنامہ اُردو دُنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:15، شمارہ:11، نومبر 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

email: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 2

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو

جدید تنقید انحطاط کا شکار ہے: وارث علوی — شاہ فیصل 6

کوز اسٹوری

پندرہواں کل ہند اردو کتاب میلہ — شاہد اختر انصاری 10

گوشہ علی سردار جعفری

علی سردار جعفری: سوانحی خاکہ — رفیعہ شبنم عابدی 19

علی سردار جعفری: ایک علمی، ایک طلسمی شخصیت — علی احمد فاطمی 20

علی سردار جعفری: شخصیت اور فن — کرشن بھاوک 24

علی سردار جعفری کی نثری تحریریں — عمر رضا 27

امن کا شاعر: علی سردار جعفری — شکیل علائی 30

انتخاب کلام علی سردار جعفری 32

زبان و تعلیم

ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم — محمد احسن 37

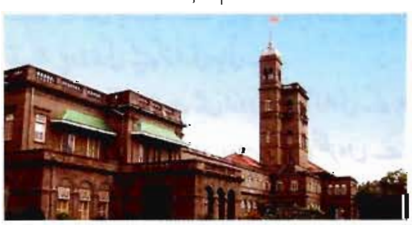

ادبی مباحث

اڑیسہ میں اردو کا ادبی و تہذیبی پس منظر — خاور نقیب 40

شمالی ہند کی مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی — ابن کنول 44

فیض احمد فیض: نئی تفہیم قدیم لفظیات — عبدالرشید اعظمی 47

علامہ اقبال اور قومی یکجہتی — ایس نسیم بانو 49

خراجِ عقیدت

پہلی جنگ آزادی اور بہادر شاہ ظفر — عبدالعزیز عرفان 51

شخصیت

مولانا آزاد: ہندوستان کی ایک عبقری شخصیت — ایس ایم رحمت اللہ 54

انسانی قدروں کے ترجمان

طوطیِ ہند امیر خسرو اور مہا کوی کبیر — رئیس الدین رئیس 57

ہم نے جنھیں بھلا دیا

شاعرِ حقیقت: نشور واحدی — فاروق ارگلی 59

طب

کوثر چاند پوری بحیثیت طبیب — شمیم ارشاد اعظمی 62

ہماری مطبوعات

مومن کے تذکرے — معید رشیدی 64

تہذیب و ثقافت

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی علامت

میلہ پھول والوں کی سیر — ابرار احمد اجراوی 68

دوسری زبانوں سے

ایتھنس کا ستیارتھی (ہندی کہانی) — سدرشن

مترجم: سرفراز جاوید 70

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 73

اشتہار

DAVP 82

خبر نامہ

ہماری بات

زبانوں کو لکھنے کی ہزار ہا سال پرانی تکنیک جب وجود میں آئی تھی تبھی سے کتابیں کسی نہ کسی شکل میں انسانی سماج کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔ کبھی یہ کتاب غاروں کی اندرونی دیواروں پر عبارتوں کی صورت میں تھی، کبھی فراعنہ مصر کی قبروں پر جا بجا نصب لوحوں و کتبوں کی شکل میں۔ اور آگے بڑھیے تو درختوں کی چھالوں پر لکھی ہوئی تختیوں کو جوڑ کر کتاب تشکیل دی گئی۔ پھر کاغذ کی ایجاد نے تو جیسے ایک انقلاب شروع کر دیا جسے تکمیل ملی چھاپہ خانے کی ایجاد سے، اور اس طرح کتاب غاروں، مقبروں، میدانوں اور عالیشان کاشانوں سے عام لوگوں کے گھروں تک پہنچ گئی۔ تب سے اب تک، یا یوں کہہ لیں کہ ماضیِ قریب تک، ہر علم نے اپنا سفر کتاب کے شانوں پر سوار ہو کر ہی طے کیا ہے۔ آج بھی جب جدید ترین انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں عالم گیر کمپیوٹرائزیشن، لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ، موبائل فون، ایجوکیشنل اور سوشل میڈیا نیٹ ورک اور طرح طرح کے سافٹ ویئرز نے، کتاب کا بہت سا روایتی کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اس کی اہمیت، ضرورت اور قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نئی ٹیکنالوجی کی بدولت کتابوں اور رسالوں کی اشاعت میں بھی انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں اور آج زیادہ خوب صورت کتابیں پہلے سے زیادہ تعداد میں چھپ رہی ہیں۔

اردو کتابوں کی اشاعت بھی نئی ٹیکنالوجی سے بہرہ مند ہوئی ہے۔ ان کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ لاگت میں کمی آئی ہے۔ لیکن دوسری زبانوں کے برعکس اردو میں صرف مذہبی کتابیں زیادہ چھپتی ہیں۔ بہت تھوڑے سے ادارے ہیں جو عصری علوم، فلسفہ، ادب، سائنس، طب، تہذیب اور ثقافت کے شعبوں کی ضرورتوں کو کچھ حد تک پورا کرتے ہیں۔ مگر وہ قدیم اور جدید کتابیں، جن کی طباعت غیر منافع بخش مانی جاتی ہے یہ ادارے بھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے۔ یہی وہ میدان ہے جس میں قومی اردو کونسل نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ ایسی کتابیں چھاپی ہیں جو علم کی سبھی ضرورتیں پوری کرتی ہیں یا نایاب ہو چکی ہیں۔ بچوں کے ادب کے سب سے زیادہ ٹائٹلز بھی اردو کونسل نے ہی شائع کیے ہیں۔ لیکن کتابوں کے تعلق سے اردو کونسل کی کارکردگی یہیں تک محدود نہیں ہے۔ اس نے اردو کتابوں کی پوری صنعت کو اردو عوام سے جوڑنے، پبلشرز کو بہتر تجارتی مواقع فراہم کرنے اور عوام میں اردو کی کتابوں کے شوق کو بیدار کرنے کے لیے پورے ملک میں کتابوں کے میلوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ بنگلور میں پچھلے دنوں کونسل کا پندرہواں کل ہند کتاب میلہ منعقد ہوا جو معیار اور مقدار کے لحاظ سے بے حد حوصلہ افزا ثابت ہوا کہ اس میں پہلے سے زیادہ پبلشر شریک ہوئے پہلے سے زیادہ اسٹال لگائے گئے، اردو خطاطی کے بہترین نمونوں کی نمائش اور فروخت کا سلسلہ پہلی بار شروع کیا گیا جس سے میلے کا معیار بلند ہوا۔ اس کی تمام تفصیلات آپ میلے کی کور اسٹوری میں پڑھیں گے۔ لیکن اردو کتابوں کی مجموعی فروخت 14 ویں میلے کی فروخت سے آگے نکل جانے کے باوجود ہماری توقعات پر پوری نہیں اتر سکی۔ ہمیں کتابوں کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ کی سمت میں یہ ایک مایوسی بھرے اشارے کے طور پر محسوس ہو رہا ہے جس کی طرف ہم اردو والوں کو توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔

یہ سال ترقی پسند اردو ادب کی سب سے بڑی ہستیوں میں شامل سردار جعفری کی پیدائش کا سوواں سال ہے۔ ملک کی تحریک آزادی اور ترقی پسند تحریک اور اردو زبان کی ترویج میں جو تاریخی کردار سردار جعفری نے ادا کیا اس سے سبھی واقف ہیں۔ اس شمارے کے لیے ان کے فن اور شخصیت پر ایک خاص گوشہ ترتیب دیا گیا ہے تاکہ انھیں جاننے والے اپنی یادوں کو تازہ کر سکیں اور نئی نسل کے لوگ یہ سمجھ سکیں کہ ملک سماج تہذیب اور پوری دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش میں ایک بھرپور زندگی کیسے گزاری جاتی ہے۔

آخر میں اتنا اور عرض کرنا ہے کہ آج کے حالات میں اردو زبان آزادی کے بعد کے سب سے اچھے اور سازگار دور سے گزر رہی ہے۔ بلندیوں کو چھونے کے لیے اس کے پر پھڑپھڑا رہے ہیں اور وہ امید بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔ ہم اردو والوں کی توجہ ہی اس کے بازوؤں کو قوت پرواز دے سکتی ہے۔ مگر یہ قوت اسے تب تک نہیں ملے گی جب تک ہم اپنے بچوں کی اردو تعلیم کو یقینی نہیں بنائیں گے، اردو کی کتابیں اور اخبار و رسائل نہیں خریدیں گے اور اس سے اپنے رشتے کو عملی شکل نہیں دیں گے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

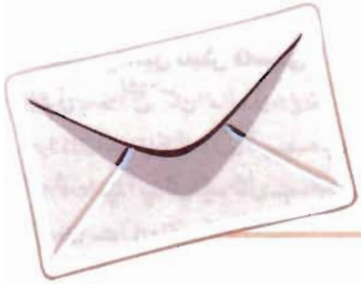

آپ کی بات

(پروفیسر) محمد اختر صدیقی

سابق چیئرمین این سی ٹی ای، حکومت ہند، فیکلٹی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

حسبِ سابق شمارے کے تقریباً سبھی اجزا دلچسپ محسوس ہوئے۔ البتہ اردو کی بین الاقوامی کانفرنس کی مختصر مگر جامع روداد بطور خاص دلچسپی کا باعث رہی۔ مجھ جیسا عام استاد جس کی رسائی ایسی معیاری کانفرنسوں تک ممکن نہیں۔ اس کے لیے یہ رپورٹ یقیناً بہت مفید ہے۔ کانفرنس میں شریک قومی و بین الاقوامی مندوبین کی آرا جہاں اردو کے تئیں ان کی سنجیدہ فکر کی غمازی کرتی ہیں وہیں ان آرا میں آئندہ تحقیق و تحریک کے لیے بہت سے اشارات بھی نظر آتے ہیں۔ شمارے میں شامل سید محمد اشرف کا کلیدی خطبہ بالخصوص توجہ کا حامل ہے اور ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل کی نہایت بے باکی سے صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اشرف صاحب نے اصل مسئلے کی جانب کیا خوب توجہ دلائی ہے۔ ان کا کہنا بالکل درست ہے کہ اردو کے تناور درخت کی صحت اور اس پر مستقلاً برگ و بار و ثمر آوری کے لیے جس نوع کی آبیاری اور غذا رسانی درکار ہے وہ دراصل اردو کی تعلیم و تدریس میں پنہاں ہے اور اس ہدف کا حصول حکومتِ وقت کے مخلصانہ اقدامات اور عوام کے دردمندانہ اور فعال اشتراک و جدوجہد کے بغیر تقریباً ناممکن ہے۔ آپ کی اردو دوستی اور اردو کے تئیں مخلصانہ کاوشوں کی بارآوری کے لیے میری نیک خواہشات قبول فرمائیں۔

شکیل خاں سہسرامی

اردو سیکشن، بہار لیجسلیٹیو کاؤنسل، پٹنہ 15

2013 کے دسویں ماہ کا اردو دنیا ہمدست ہوا۔ شاہد اختر نے حسین بھائی کا انٹرویو پیش کر کے دل خوش کر دیا۔ سہسرام کے تعلق سے حسین بھائی کا دلچسپ ماضی رقص کرنے لگا۔ تقریباً بلا ناغہ میرے آبائی مکان مولوی عبدالوحید منزل محلّہ کرنسرائے سہسرام کی طرف سے حسین بھائی کا مستانہ وار گزرنا۔ نئی نویلی ڈاک کے لیے ڈاک گھر جانا پھر ادھر سے کبھی کبھی شفق صاحب کے ساتھ واپس لوٹنا۔ مشاعروں میں شرکت کرنا۔ محفل میلاد میں تقریر کرنا وغیرہ مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا۔ میرے دادا مرحوم مغفور اسمٰعیل خاں مدرسہ خانقاہ کبیریہ کے ہی ملازم اور خادم تھے۔ میرے والد محترم اور بڑے بھائی سروار خاں نے اسی مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام سے فاضل کیا۔ بنیاد مدرسہ ہذا ہی تھا۔ بھائی عبدالحی نے قومی اردو کونسل کی پہلی بین الاقوامی اردو کانفرنس کی تفصیلی روداد پیش کر کے اردو کے اعلیٰ معیاری ارتقائی سفر کی اطلاع اہالیان اردو کو بہم پہنچائی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین انتہائی فعال شخصیت کا نام ہے۔ خدا طویل عطا کرے۔ ان کے دم قدم سے رسالہ اردو دنیا آج کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ 'معاملات اردو' کانفرنس کے تئیں مستزاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موقر مندوبین کی آرا اردو کی مزید صحت کے لیے کافی مفید ہیں۔ ادارے کی جانب سے قرارداد کی پیش کش اسی کڑی کا اگلا حصہ ہے جو کافی اہم اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بین الاقوامی مشاعرے کی رنگا رنگ روداد نے تو جیسے شمارے میں روح پھونک دی۔ سرسید کی تاریخ نگاری کو آنکھ بند کر کے مستند قرار دیا جاسکتا ہے۔ مرثیہ کی خواندگی کا فن پڑھ کر ایک مصرع یاد آ گیا: ہم زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے۔ مشتاق احمد نے مناسب عنوان کا انتخاب کیا ہے اور خامہ فرسائی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مرحوم وہاب اشرفی کے بعد 'اردو دنیا' کو ایک اور شدید دھچکا لگا، لطف الرحمٰن صاحب کی موت کی صورت میں۔ مضمون کو اور معیاری ہونا چاہیے تھا۔ یگانہ کی شعری چنگیزی ہر زمانے میں مسلم الثبوت رہنے والی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

'اردو دنیا' کا ستمبر 2013 کا شمارہ اپنی سابقہ امتیازی خصوصیتوں پر مبنی حسن طباعت اور کتابت اور متعدد گراں قدر اور معلوماتی مشمولات کے ساتھ موصول ہوا۔ ان گراں قدر مضامین اور علمی شہ پاروں میں علاقائی زبانوں اور ادب کے ساتھ یعنی پنجابی، اڑیا، بہار کی علاقائی زبانوں، تیلگو، مراٹھی کے ساتھ اردو کے گہرے رشتوں کا علم ہوا اور اردو کے جلیل القدر ادیب اور لاثانی طرز انشا کے مالک اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی پر پروفیسر عبدالستار دلوی کا فاضلانہ مضمون بھی بہت پسند آیا ان کے لیے آنجناب اور ان گراں قدر مضامین لکھنے والے حضرات قابل صد تبریک اور تہنیت ہیں۔

خطاب عالم شاذ

کانکی نارہ، شمالی 24، پرگنہ (مغربی بنگال)

ستمبر 2013 کا جریدہ 'اردو دنیا' دیکھا۔ علاقائی زبان، زبان و ادب اور مختلف زبانوں کے اتحاد اور امتزاج کو اس شمارے میں بحسن و خوبی پیش کیا گیا ہے جو زبانوں سے متعلق ایک خزینہ ہے۔ ہر زبان میں اردو کا عنصر موجود ہے جو مختلف زبانوں میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ یا قریب تر 'اردو' ہے۔ مشتاق احمد وانی کا مضمون 'جموں و کشمیر میں اردو تحقیق' بھی بہت خوب ہے۔ 'پیشاور اکسپریس' پڑھتے وقت میرے دل میں ایک قسم کی بے چینی یا اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی۔ رشدہ خاتون نے اڑیا زبان سے ایک کہانی کا ترجمہ 'لمس' بہت سلیقے سے کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین، وائس چیئرمین قومی اردو کونسل پروفیسر وسیم بریلوی اور مرکزی وزیر مواصلات و انفارمیشن ٹکنالوجی کپل سبل مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی کوششوں سے ڈیسک ٹاپ، لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ اور اینڈ رائڈ و ونڈوز فون پر بھی اردو کا استعمال اور اردو فونٹس، اردو کی وکی سائیٹ اور کی بورڈ کا اجرا ہوا اور اردو آن لائن و آف لائن ڈکشنری کی تیاری کر کے قومی اردو کونسل نے واقعی ایک تاریخ ساز پیش قدمی کی ہے۔

محمد میکائیل تابش قاسمی

استاذِ عربی جامعۃ الشیخ حسین احمد المدنی، دیو بند

ستمبر 2013 اردو دنیا کا شمارہ پیش نظر ہے۔ ویسے تو اردو دنیا کا ہر شمارہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ البتہ یہ شمارہ دیگر شماروں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس میں اردو زبان وادب کے عروج وترقی کے جتنے اسباب اخذ و عطا کے ہوسکتے ہیں وہ اس میں موجود ہیں کہ اردو زبان نے جس قدر دوسری زبان کی صحبت اختیار کی اور دیگر زبانوں کے مشکل الفاظ و تلفظ کتنے خوبصورت الفاظ و آسان تلفظ میں بدل ڈالا صاف نمایاں ہیں۔

محمد متین ندوی

مدرسہ ریاض المدارس، سرونج

'اردو دنیا' ستمبر 2013 اپنی جملہ خوبیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ اس میں ملک کی علاقائی زبان کے تعلق سے بہت ہی معلوماتی مضامین موجود ہیں۔ بنگلہ اور اردو جتنے دور اتنے پاس ف س اعجاز کا اچھا مضمون ہے۔ کرشن بھاؤک، کہکشاں فلک، کرامت علی کرامت اور سید یحییٰ نشیط وغیرہ کے مضامین کو اسٹوری کے تحت لکھے گئے اچھے مضامین ہیں کچھ مضامین میں زیادہ ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کا انٹرویو اچھا لگا عبدالستار دلوی کا مضمون مولانا عبدالماجد دریابادی کے تعلق سے اچھا اور معلوماتی ہے۔ کرشن چندر کا افسانہ تقسیم ہند کے وقت رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جیسے اسکرین پر دیکھ رہے ہیں۔ کون کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی مہارت اور شگفتہ ودلچسپ انداز سے انکار کرسکتا ہے۔ مرزا شوق کی مثنوی 'زہر عشق' کا اقتباس بہت ہی پسند آیا۔

محمد توحید الحق انصاری

اسمٰعیل پورہ، کامٹی

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ زبان نہ صرف اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے، بلکہ وہ بولنے والی قوم کی تمدنی، تہذیبی، سماجی اور مذہبی خصوصیات کا آئینہ بھی ہوتی ہے۔ مذکورہ شمارے میں جناب سید یحییٰ نشیط کا مضمون 'اردو مراٹھی کے باہمی روابط' بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھا گیا ہے۔ اُن کے مضمون میں مراٹھی کے معروف ادیب سانے گروجی کا نام نہ پاکر حیرت ہوئی۔ سانے گروجی نے جہاں اپنی تصنیفات سے مراٹھی ادب کو مالامال کیا وہیں اسلام اور آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ کو مراٹھی داں طبقے سے روشناس کروانے کی غرض سے 'اسلامی سنسکرتی' نامی کتاب لکھی۔ مضمون میں مراٹھی غزل کا ذکر بھی نہیں ہے۔ اردو کی غزلیہ شاعری ہمیشہ سے مراٹھی داں طبقے کے لیے دلکشی کا سبب رہی ہے۔ موجودہ دور میں سریش بھٹ مراٹھی غزل کے نمائندہ شاعر رہے ہیں اور ان کی غزلوں کے چند مجموعے شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔

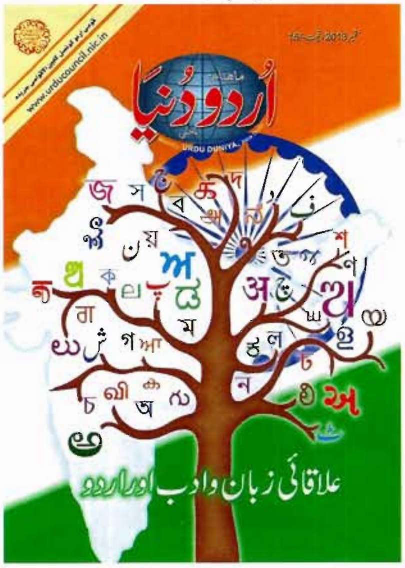

کرشن بھاؤک

A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر K-18، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' ستمبر کا شمارہ حسبِ معمول نایاب مشمولات کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس میں 'کور اسٹوری' کے کمیاب موضوع پر مضامین شائع کرنے کے موجب ادارہ قابلِ صد تحسین ہے۔ ف س اعجاز کا مضمون 'بنگلہ اور اردو...' ایک معرکۃ الآرا بطور یادگار محفوظ رکھنے والی تصنیف ثابت ہوئی ہے۔ کہکشاں فلک کا مقالہ بھی اختصار کے باوجود اعلیٰ درجے کا مضمون ہے۔ کور اسٹوری سے متعلق (خاکسار کے مضمون کو ایک استثنا مان کر الگ کردیں تو) بقیہ چھ مضامین مختلف موضوع پر تحریر کیے گئے ہیں اور بقول مشتاق احمد 'صبر آزما، محنت طلب، اور جانفشانی' کے تحقیقی کام کی تمام کسوٹیوں پر پورے اترتے ہیں۔ ڈاکٹر لئیق صلاح نے اپنے مضمون میں سردار جعفری کی بابت ہر ایک بات مافی الضمیر ہی کہی ہے، لیکن اس مقالے میں انھوں نے اردو میں تتسم اور تدبھو (انھوں نے 'تت بھو' لفظ غلط لکھا ہے، صفحہ 33) کے تصرف اور مثالوں کو ٹھیک پیش نہیں کیا ہے۔ اس سے اردو کے طلبا کو غلط فہمی ہونے کا خدشہ دور کرنے کے لیے میں وضاحت کر رہا ہوں۔ سنسکرت زبان کے (اور دوسری زبانوں کے بھی) اصل الفاظ مثلاً راتری، ہست، مستک، پنچ وغیرہ اور انگریزی کے 1.Canister 2. Pantaloon, 3. Platoon الفاظ ہی 'تت سم' کہلاتے ہیں۔ ہندی وغیرہ زبانوں میں ترتیب وار رات، ہاتھ، ماتھا اور پانچ اور 1. کنستر 2. پتلون اور 3. پلٹن وغیرہ ہوکر 'تد بھو' یعنی بگڑ کر اشتقاق یا تبدیل شدہ ہونے پر تد بھو' معنی 'اصل سے پیدا' کہلاتے ہیں۔ انھوں نے جو غلط مثال 'راتوں رات' کی دی ہے، وہ تو ایک ترکیب و مرکب شدہ الفاظ (ہندی میں سماس) کا ایک خاص زمرہ یا بانگی ہی ہے۔ ہاتھوں ہاتھ جیسے چند الفاظ ایسے ہی تشکیل پاتے ہیں۔ اس گراں قدر شمارے میں 'آپ کی بات' کالم کے تحت صابر شیخ برہان پوری نے صد فی صد صحیح فرمایا ہے کہ 'سوال' لفظ کا اصل ہی مطلب 'پوچھنا' ہے۔ اس لیے 'سوال پوچھنا' میں فعل 'پوچھنا' زائد ہے۔ ہندی میں بھی اسی طرح کی غلطی کرتے ہوئے 'پرشن پوچھنا' غلط ہے۔ کیونکہ جس 'پرچھ' مصدر (دھاتُو) سے یہ 'پرشن' لفظ بنتا ہے، اس کا معنی بھی 'پوچھنا' ہی ہے۔ صحیح استعمال ہے پرشن کرنا یا پرشن کیا وغیرہ۔ موصوف کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ انگریزی زبان میں 'ٹو آسک کوئسچن' To Ask Question کے غلط استعمال نے دوسری زبانوں پر غلط اثر مرتب کیا ہے۔

کرشن گوتم

3251، سیکٹر D-44، چنڈی گڑھ

'ہماری بات' میں آپ کا نظریہ کہ زبان کا ایک 'حیاتیاتی نظام' ہوتا ہے، بالکل درست ہے۔ کیونکہ ہر زبان میں پیدا ہونے والی فطری تبدیلیاں قدرتی اور داخلی اثرات سے دوچار ہوکر، اس کی نشو ونما میں معاون بن کر اسے مزید سجاتی اور سنوارتی رہتی ہیں۔ یہ عمل اتنا سہج ہوتا ہے کہ نئی نئی تبدیلیاں بغیر کسی سعی و ناگوار کے اس میں غیر محسوس طور پر ہوتی رہتی ہیں۔ اردو زبان کی ہر دلعزیزی کی نمایاں وجوہات، جن کی طرف اشارہ آچکا ہے، ان میں اس کا کھڑی بولی کی جڑوں سے جڑے رہ کر فارسی، عربی اور دیگر علاقائی زبانوں سے اس حسین ڈھنگ کا ملاپ ہے کہ ان کے الفاظ اسی کا ہمیشہ کے لیے حصہ بن گئے۔ جوں جوں علاقائی زبانوں کا اشتراک بڑھتا گیا اردو زبان عوام کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتی گئی۔ یہ لمبا سفر 'حیاتیاتی نظام' کے مطابق فطری طور سے سلاطینِ غزنہ کے پنجاب کے بڑے علاقے پر کافی عرصے کے دورِ حکومت سے شروع ہوکر دکن میں تغلقوں اور بعد ازاں مغلوں کی افواج کی آمد و رفت تک جاری رہا۔ اس میں پنجاب اور دلی کی علاقائی زبانیں ہی نہیں بلکہ دوسری بولیاں بھی گھلتی ملتی چلی گئیں۔ اس طرح یہ زبان لوگوں کے بہت نزدیک ہوتی چلی گئی۔ اگرچہ سرکاری کام کاج فارسی میں ہوتا رہا۔ بعد میں سرکاری کام کاج میں بھی اردو اپنی جڑوں کی مضبوطی کی وجہ سے علاقائی زبانوں کو لے کر شامل ہوتی چلی گئی حتی کہ عام کام کاج میں بھی اردو کا بول بالا ہوگیا۔ 'اردو دنیا' کے اس اسپیشل نمبر

سے تقویت پا کر اُمید ہے اردو داں طبقے اردو زبان کو پھر عوام کے زیادہ سے زیادہ نزدیک لانے کے لیے اسے قدرتی طور پر علاقائی رجحانات سے مستفید ہونے کا موقع دیں گے کیونکہ یہ اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے۔

پروفیسر جمال نصرت

روشنی، 509/148، اولڈ حیدرآباد، لکھنؤ (یوپی)

آپ سب لوگ برابر تعریف کے لائق کام سرانجام دے رہے ہیں۔ خدا کرے کہ کسی شیطان کی نظر نہ لگے۔ آمین۔ آپ لوگ برابر قلم اور طلسم دونوں ہی توڑ رہے ہیں۔ اس قدر خوبصورت اور معلوماتی اور دلچسپ بچوں کی دنیا اور ماہ در ماہ نئی طرح کا 'اردو دنیا' دے رہے ہیں۔ اس میں ایک خاص نقطۂ نگاہ سے مضامین، اردو کا فروغ، اردو سے محبت جگانے کی کامیاب کوشش اور ماند پڑے حوصلوں میں نئی جان پھونک رہے ہیں۔ میں نے اپنے قریب 60 سالہ مطالعے میں اس قدر خوبصورتی اور معیار نہیں دیکھا۔ رسالہ بھی یکم سے تین تاریخ کے درمیان میں ضرور موصول ہو جاتا ہے۔ ستمبر 2013 کو 'علاقائی زبان و ادب' پر مشتمل رسالہ ملا جو مضامین پنجابی، اڑیہ، بنگلہ، مہاراشٹرین، تمل، کشمیری، بہاری وغیرہ کے سلسلے میں ہیں۔ بہت خوب ہیں۔ ان کی افادیت اور ضرورت بہت تھی۔ اردو کے سپاہیوں اور شیدائیوں کے بارے میں بھی برابر آپ قارئین کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا (مدھیہ پردیش)

اگست 2013 کا شمارہ ملا۔ عبدالصمد سے احمد صغیر کی بات چیت پسند آئی۔ افسانے کے کرداروں کی اندرونی کیفیت اور نفسیات کا اظہار ضروری ہے۔ افسانے میں ہماری تخلیق کا اظہار بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ مکالمہ ہمارے افسانوی کرداروں کے اظہار کا ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے کردار کی ذہنی سوچ کا اظہار کرتے ہیں۔ افسانے میں مکالموں کی بے وجہ بھرمار بھی افسانے کو کمزور بنا دیتی ہے۔ تلوک چند محروم کی شاعری میں ایک وقار نظر آتا ہے۔ ان کے خیال اور اظہار میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ نظیر بنارسی نے ایسی ایسی شخصیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جو دیگر شعرا کے قلم کی رسائی سے دور رہے ہیں۔ دل شاہجہاں پوری کی شاعری ان کے دل کے ایسے دل کش محسوسات اور اظہار ہیں جنھیں دل کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

عبدالسلام صدیقی

پارزا پلازا، ماتھر کمپاؤنڈ، جگت نرائن روڈ، لکھنؤ 18

'اردو دنیا' (جون 2013) میں ادارے کی جانب سے مولانا صفی لکھنوی پر مضمون نظر نواز ہوا۔ مولانا کا نام دو جگہوں پر 'علی تقی' لکھا گیا ہے جب کہ صحیح نام 'علی نقی' ہے۔ اسی طرح وفات کی تاریخ 15 جنوری تحریر کی گئی جب کہ یہ 24 جون 1950 بروز سنیچر سہ پہر تقریباً چار بجے ہے۔ تدفین اگلے دن 25 جون کو امام باڑہ غفران مآب سبزی منڈی چوک سے متصل مقبرہ راجا نواب علی خاں میں عمل میں آئی۔ مولانا صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی سید مقبول حسین ظریف لکھنوی (1937-1870) زندہ دل، فن ظرافت کے ایک کامیاب شاعر تھے۔ دونوں لکھنؤ کے محلّہ مولوی گنج میں نالا فتح گنج گلی میں رہتے تھے۔ ظریف کی رہائش راجا صاحب محمود آباد کی لال کوٹھی میں تھی جس کے سامنے تھوڑے سے فاصلے پر صفی قیام پذیر تھے۔ ان کی ولادت اور رحلت دونوں یہیں اِسی آبائی مکان میں ہوئی۔ لال کوٹھی کے دو حصے تھے۔ بیرونی حصے میں ظریف اور اندرونی حصے میں جہاں شہ نشین ہے، راقم کی رہائش بعد میں ہوئی تھی۔ مہاراجا سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد (1931-1878) اور ان کے فرزند راجا محمد امیر احمد خاں (1973-1914) دونوں کی سرپرستی ظریف کو حاصل تھی۔ مولانا صفی، ظریف کو بہت چاہتے تھے اور اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے۔ ظریف کا انتقال تقریباً 67 برس کی عمر میں 3 دسمبر 1937 بروز سنیچر ہوا۔ اس صدمے نے مولانا کی کمر توڑ دی۔ بھائی کی مجلسِ چہلم پر انھوں نے یہ شعر کہا:

جو اٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شورِ محشر اٹھا کے اٹّھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رُلا کے اُٹّھا

حسن امام فدائی

ٹیچر (شعبۂ اردو) سنٹ کولمبس، کالجییٹ، ہائی اسکول، ہزاری باغ

'اردو دنیا' اپریل 2013 کا شمارہ دیکھا۔ یہ اردو کا مقبول ترین رسالہ ہے۔ بے حد پسند آیا۔ اس شمارے کے بیشتر مضامین معلوماتی ہیں۔ انتخاب کلام منیر احمد نیازی قابل تعریف ہے کتابوں کی دنیا میں تبصرہ و تعارف پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ خبرنامہ میں محمد سرورالزماں سرور پڑھا۔ یہ میرے استاد ہیں۔ ان سے رموز شاعری سیکھ رہا ہوں۔ جناب سرور میرے کلام پر اصلاح کر دیتے ہیں۔

شبانہ ساجد

کیئر آف محمد ساجد، 44/303، مچھلی ٹولہ، راجا لوک ہاؤس، کانپور

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اتنا عمدہ اور معیاری رسالہ شائع کرنے کے لیے قابل مبارکباد ہے۔ جولائی کے شمارے میں ادب مذہب اور اردو پر لکھی گئی کور اسٹوری بے حد عمدہ ہے۔ مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ ہماری اردو زبان اپنی شیریں زبانی کی وجہ سے تمام مذاہب کی پسندیدہ زبان ہے۔ اردو دنیا کے لیے دعا گو ہوں۔ خدا کرے یہ رسالہ مزید ترقی کرے۔

فرقان احمد غوری خان

مقیم کنور، بیلگام، کرناٹک

رسالہ 'اردو دنیا' تمام اردو داں افراد کے لیے انمول تحفہ ہے۔ الحمدللہ! اردو زبان و ادب کے فروغ و ترویج کی خاطر آپ کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسالے میں اکثر و بیشتر صرف ادبیات پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ادارے کو اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے موضوعات پر بھی مضامین شائع کرنے چاہیے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ چند گنے چنے افراد ملیں گے جو اردو کی ترقی کے لیے اخلاص کے ساتھ کوشاں ہیں۔ اردو کے اساتذہ ہوں، محقق ہوں، اسکالر ہوں کہ ادیب ہوں یا شاعر، ان میں اردو کے مخلصین خال خال ملیں گے۔ ہم میں کتنے ایسے ہیں جو اردو کو اپنی اولاد تک منتقل کرتے ہیں؟ اردو رسالے و اخبار خریدتے ہیں؟ ظاہر ہے گنے چنے افراد ہی ہیں۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم خود تو اپنی روزی روٹی کے لیے اردو کو ذریعہ بنائیں اور خود ہماری اولاد اردو سے بے بہرہ ہو۔ ہم خود تو دوسرں کو اردو رسالے اخبار خریدنے کی ترغیب دیں اور ہمارے مطالعے کا کمرہ، اردو کی کتابوں، رسالوں، اخبار سے خالی ہو۔ پھر کس منہ سے ہم اردو کی محبت کے دعویٰ کرتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے۔ آن لائن کے ذریعے اردو سکھانے کے متعلق رسالے میں بار بار خبر آرہی ہے۔ جب کہ اردو کے بہت سارے ادارے، مدارس و اسکول ناکافی سہولیات کی وجہ سے اس سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ ضرورت ہے کہ درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کے روایتی طریقے بھی update کر کے رسائل میں اِس سے متعلق مضامین شائع کیے جائیں۔

رسالے میں زبان دتعلیم کا ایک کالم ہوتا ہے جس کے تحت لگاتار مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ (ادارہ)

■

شاہ فیصل

جدید تنقید انحطاط کا شکار ہے

وارث علوی

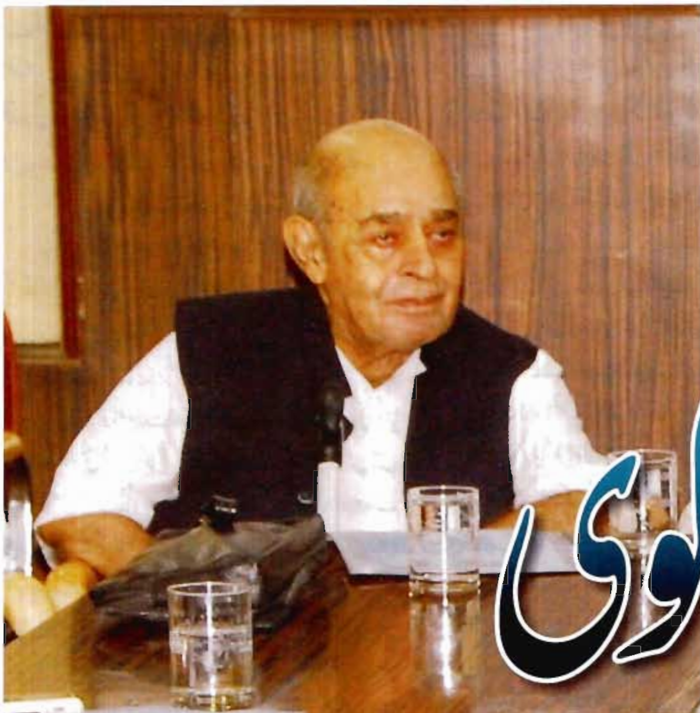

وارث علوی اردو میں عصر حاضر کے صف اول کے نقادوں میں شامل ہیں۔ انہوں نے بے باک لب ولہجے میں اردو تنقید کو نئے امکانات سے روشناس کیا ہے۔ اپنے وسیع مطالعے اور منفرد تجزیاتی شعور کی بنا پر وارث علوی نے نہ صرف اردو شعر وادب کے مختلف رجحانات، تحریکات، اسالیب اور تخلیقی روّیوں کا غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کیا ہے، بلکہ اپنے بعض مضامین کے ذریعے اردو تنقید کی سطحیت اور کم مائیگی کی طرف بھی واضح اور مدلل اشارے کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہماری بیشتر تنقید مدلل مداحی اور بے جا عیب جوئی سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔ یہ ایں سبب وارث علوی نے اپنے معاصر ناقدین کی تنقیدات کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندھی کی ہے۔ ان کا لہجہ چونکہ جارحانہ اور بے رحمی کی حد تک حقیقت پسندانہ ہے، اس لیے اردو کے اکثر و بیشتر ناقدین ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کو تسلیم تو کرتے ہیں، لیکن ان کو وہ مقام دینے کے لیے تیار نظر نہیں آتے ہیں جو ان کو ملنا چاہیے۔ تاہم نئی نسل کے قلم کار اس حقیقت کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ وارث علوی کا شمار عہد حاضر کے مقتدر نقادوں میں ہے۔ پیش ہے ان سے ڈاکٹر شاہ فیصل کا طویل انٹرویو:(ادارہ)

شاہ فیصل : اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیں۔

وارث علوی: میرے والد صاحب سید حسینی پیر طریقت تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور گجراتی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ خاندانی مخطوطات کو سنبھالا اور بڑی تحقیق کے بعد حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے حالاتِ زندگی 'تذکرۃ الوجیہ' کے نام سے اشاعت پذیر کی۔ سال میں ایک مرتبہ مریدوں میں جاتے' مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ نوجوان مرید مجھے گھیرے رہتے کیونکہ میں آزاد کی آب حیات سے کہانیاں سناتا اور شام کو ان کے ساتھ باغ میں جا کر ہری گھاس پر بیٹھتے اور میں فلموں کی کہانیاں سناتا۔ ابّا کے بعد میں نے پیری مریدی کا سلسلہ تو نہیں رکھا لیکن والد صاحب کا اثر لیتا گیا تھا کہ لوگ اب بھی آتے ہیں۔ میں خوش دلی سے ملتا ہوں۔ میری صورتِ حال ایبسرڈ ڈرامے کے اس ایکٹر کی ہوگئی ہے جس کا سٹیج کی setting سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے لیکن وہ اپنے مکالمے بولتا جارہا ہے۔ یہ میری زندگی کا عجیب پیراڈوکس رہا ہے۔ نام ہے میرا بغاوت کام ہے میرا اطاعت۔ ہر دقیانوسی چیز کے خلاف بغاوت کی لیکن دقیانوسیوں کے ساتھ علیک سلیک بھی رہی۔ آخر میں صرف والدہ مرحومہ کا ذکر کر کے خاندانی کوائف کے اس تذکرے کو ختم کروں گا۔ نام حفیظ النساعرف دوشی بی بی تھا خدا نے انھیں ظرافت کا وہ مادہ دیا تا کہ جہاں سہلیوں کے بیچ بیٹھ گئیں ہنسی کے فوارے بلند ہوتے اسی حسِ مزاح کے ورثے نے راقم الحروف کی تنقید کو زعفران زار بنایا۔

ش ف: آپ نے کب لکھنا شروع کیا؟

وارث علوی: ممبئی سے ایک رسالہ عادل رشید نکالتے تھے۔ 'شاید' اُس کا نام تھا۔ اس میں، میں نے دو مضامین لکھے۔ ایک مضمون احمد ندیم قاسمی کے رسالے نقوش پر تھا اور اس میں بہت برائیاں تلاش کی تھیں، جس پر احمد ندیم قاسمی نے محمد علوی کو خط میں لکھا کہ وارث علوی نے اندھیرے میں بہت تیر چلائے ہیں۔ دوسرا مضمون بھی شاعری ہی پر تھا۔ لیکن اہم مضمون مرزا شوق کی مثنویوں پر ایک کتاب عطاء اللہ پالوی کی آئی تھی، اس پر لکھا اور مرزا شوق پر خوب گہرا مطالعہ کیا اور مصنف کے اختلافات میں علمی گہرائی پیدا کی۔ یہ مضمون میرے

مضامین کی کتاب اوراق پارینہ میں 'تذکرہ شوق' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس زمانے میں میرا دوسرا اہم مضمون جو میری کتاب میں شامل ہے وہ مرزا سودا کی ہجویات پر تھا اور اس سلسلے میں میں نے طنز کیا ہے؟ مزاح کیا ہے؟ اس قسم کے موضوعات پر اچھا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ یہ مضمون کافی پسند کیا گیا۔

ش ف: کن اساتذہ اور قلمکاروں سے متاثر ہوئے؟

وارث علوی: میں انگریزی بہت زیادہ پڑھتا رہا اور اس میں میرے پسندیدہ قلمکار جو تھے ان کی تمام تخلیقات کا مطالعہ کرنے کا ایک جنون ذہن پر سوار تھا۔ لیکن میں نے اپنی زبان کے شعرا اور ادبا سے چشم پوشی نہیں کی۔ شروع سے میں غالب اور اقبال کو بہت پڑھتا رہا۔ اس کے بعد جو نئے شعرا سامنے آئے جن میں فیض، مجاز، علی سردار جعفری، ن م راشد، مجید امجد، محمد علوی، ندا فاضلی میرے پسندیدہ شاعر رہے۔ افسانہ نگاروں میں پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، عزیز احمد، اوپیندر ناتھ اشک اور بلونت سنگھ میرے مطالعے کا دلچسپ سامان فراہم کرتے رہے۔ تنقید میں شروع شروع میں احتشام حسین اور آل احمد سرور کو بہت گہرائی سے پڑھا۔ بعد میں حسن عسکری نے بہت متاثر کیا۔ پھر سلیم احمد کے اسلوب نے مجھ پر اپنا گہرا اثر ڈالا کہ آج بھی لوگ کہتے ہیں کہ وارث علوی اسلوب میں سلیم احمد سے بہت متاثر ہیں۔ حالانکہ میں نے ان کے اسلوب سے الگ اپنا منفرد اسلوب پیدا کیا۔

ش ف: کلاسیکی شعر و ادب سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

وارث علوی: دراصل ادب کے سبھی طالب علموں کے مطالعے کا آغاز کلاسیکی شعر و ادب سے ہی ہوتا ہے۔ ان ہی میں سے اپنے پسندیدہ شاعر ادبی ذہن کا نقش بن جاتے ہیں۔ اردو میں میر تقی میر، حالی، اقبال، میر حسن، دیا شنکر نسیم، انیس اور دبیر یہی شعرا ہیں جنھیں ادب کا طالب علم شروع شروع میں پڑھتا ہے اور پھر ان میں سے کچھ کو اپنی زندگی بھر کا ساتھی بنالیتا ہے۔ کلاسیکی شعر و ادب کے بغیر ذوق سخن میں حسن و خوبی پیدا نہیں ہوسکتی۔ کلاسیکی پس منظر کے بغیر محض جدید شاعروں سے وابستگی ذوق سخن میں ایک خاص نوع کا مزاج پیدا نہیں کرسکتی ہے۔

ش ف: سرسید تحریک کی ادبی اہمیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وارث علوی: سرسید کو میں ہی نہیں بلکہ پورا ہندوستان ایک عظیم شخصیت مانتا ہے، جس نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے ہندوستان کے مسلمانوں میں انقلاب پیدا کردیا۔ سرسید نے مذہبی معاملات میں لگ بھگ ایک سو ستاون (مجھے ٹھیک سے عدد یاد نہیں) اجتہادات کیے۔ Father Troll کی حالیہ کتاب میں انھوں نے بتایا، جو اس سے قبل حالی بھی بتا چکے ہیں کہ یہ اجتہادات اسلامی فقہ کے عین مطابق تھے۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین نے مسلمانوں کے رسم و رواج اور آداب محفل تک میں انقلاب پیدا کردیا۔ سرسید پر لکھی گئی تمام کتابوں کا مطالعہ میں نے کیا ہے اور آج بھی جو نئی کتاب ان پر آتی ہے وہ میرے مطالعے میں رہتی ہے۔ سرسید کے دور کو عناصر خمسہ کا دور کہا جاتا ہے اور یہ پانچوں عناصر اردو کے اہم ارکان تھے۔

ش ف: حالی کے تنقیدی شعور کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وارث علوی: حالی پر میں رائے کیا دیتا، میں تو ایک پوری کتاب لکھ چکا ہوں اور میں ہی نہیں بلکہ اردو کے تمام جید نقاد یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حالی ایک غیر معمولی تنقیدی ذہن لے کر آئے تھے۔ ان کا مقدمہ شعر و شاعری آج بھی اردو تنقید کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

ش ف: کچھ لوگ شبلی کو حالی سے بڑا نقاد مانتے ہیں یہ غلط یا صحیح؟

وارث علوی: اس میں غلط یا صحیح کو میں دیکھتا ہی نہیں۔ دراصل اس قسم کے مقابلوں کو میں طبعاً پسند نہیں کرتا۔ چند نکات لے کر کسی بھی نقاد کو دوسرے نقاد سے بڑا ثابت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں اس نقاد کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ میں آج بھی حالی کو اردو کا سب سے بڑا نقاد مانتا ہوں۔ جو لوگ شبلی کو بڑا نقاد مانتے ہیں۔ ان کی دلائل سے میں مرعوب نہیں ہوتا۔

ش ف: ترقی پسند تحریک سے آپ بھی وابستہ رہے ہیں۔ آپ کتنے عرصے تک اس تحریک سے وابستہ رہے؟

وارث علوی: میں 1946 تا 1951 یعنی چار پانچ سال لگ بھگ وابستہ رہا۔ پھر تو تحریک بھی ختم ہوگئی اور اس میں آنا جانا بھی کم ہوگیا۔ خیالات بدل گئے، نظریات بدل گئے۔ ایشیا کے اندر روس میں خروشیف آگیا۔ بڑی تبدیلیاں آئیں اور اس طرح سے کمیونسٹ آئیڈیولوجی میں بھی بہت فرق پیدا ہوا اور لوگ اس کی آئیڈیولاجی پر سوالات اٹھانے لگے۔ تو ان چیزوں کی وجہ سے ہم آہستہ آہستہ تحریک سے الگ ہوتے گئے، دور ہوتے گئے اور یہ بھی سمجھیے کہ تحریک خود کمزور پڑتی گئی، نہ اس کی میٹنگیں ہوتی تھیں، نہ اس کی کوئی آفس تھی، نہ اس کے کوئی جلسے ہوتے تھے۔ اس لیے وہاں پر آنا جانا بھی ہمارے لیے ممکن نہیں رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم نے تحریک میں راضی نامہ دیا تھا۔ راضی نامہ دیتے بھی ہم تب بھی کوئی وہاں قبول کرنے والا نہیں تھا۔ نہ راضی نامہ دیا نہ کچھ کیا، خود بخود دونوں چیزیں ٹھنڈی ہوگئیں تحریک بھی اور ہم بھی۔

ش ف: آپ پر پہلی بار کب اور کس طرح آشکار ہوا کہ آپ کے اندر لکھنے کی صلاحیت موجود ہے؟

و ع: یہ احساس کسی خاص مضمون سے پیدا نہیں ہوا لیکن مختلف اوقات میں قلم اس طرح چل نکلتا کہ میں جملے کو اس گیند کی مانند دیکھتا جو بونڈری کراس کرنے والی ہے اور ایک عجیب خوشی اور خود اعتمادی کے ساتھ دوسری گیند پھٹکارنے کے لیے قلم کاغذ پر رکھتا۔ کسی ایسے ہی لمحے میں میں نے نقاد بننے کا فیصلہ کیا ہوگا۔

ش ف: افسانہ ہی آپ کی توجہ کا مرکز کیوں بنا؟

وارث علوی: اس لیے کہ افسانہ اور ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ اس میں آرٹ کے ساتھ ساتھ زندگی اور معاشرے کے مسائل پر بھی گفتگو ہوسکتی تھی۔ ناول کو دورِ جدید کی فلسفیانہ سرگرمی کہا گیا ہے۔ دور جدید کو شاعری کا نہیں ناول کا ہی عہد کہا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ انگریزی کے سبب دنیا کی تمام زبانوں کے بہترین ناولوں سے آپ واقف ہوسکتے ہیں۔ مطالعے کا اتنا بڑا سرمایہ کسی اور صنف میں نہیں مل سکتا اور ادب کے مطالعے میں شخص اور شوقیہ ترجیحات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ میں انگریزی ادب کا استاد رہا ہوں۔ ادب کے نظریات ارسطو سے لے کر ایلیٹ تک پڑھاتا رہا ہوں لیکن کلاس روم نوٹس کو میں نے مضامین میں تبدیل نہیں کیا۔ البتہ ادب کے ان تصورات پر جن پر ہمارے یہاں گفتگو ہوتی رہی ہے مثلاً آئیڈیولوجی کا مسئلہ، کمٹ منٹ کا مسئلہ، پروپگنڈے کا مسئلہ وغیرہ پر دل کھول کر لکھا ہے۔

ش ف: تنقید کے عصری منظرنامے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وارث علوی: عصری منظر نامہ بہت مایوس کن ہے۔ اس وجہ سے جو کچھ ہم پڑھتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے پاس بحث کرنے کے لیے موضوعات نہیں ہیں۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں کا مطالعہ بہت ہی سطحی ہوگیا ہے۔ اول یہ کہ انگریزی کا مطالعہ بہت ناقص ہے، بہت ہی کمزور ہے اور محدود ہوگیا ہے۔ انگریزی کے جدید نقاد، کلاسیکی نقاد اور کلاسیکی تصورات سے بھی وہ واقف نہیں ہیں۔ اس طرح جدید دور میں تنقید انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اور انگریزی میں دلچسپی ختم ہوجانے کی

وجہ سے، بہت زیادہ اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ نقادوں کے پاس اچھے موضوعات اور writers نہیں ہیں جن پر لکھا جائے جیسا کہ ترقی پسندوں کے زمانے میں ہم لوگوں کو منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، جوش، فراق، فیض وغیرہ ملے، ایسے بڑے writers اب پیدا نہیں ہوتے۔ اس طرح تنقید لکھنے والوں کو بھی یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ اُن کے پاس بہت بڑے writers نہیں ہیں، جن پر لکھا جائے۔ تو اس طرح سے جدید تنقید ایک طرح کے انحطاط کا شکار ہوگئی ہے۔ اس میں فکر نہیں ہے، سوچ وچار نہیں ہے۔ اس کا مطالعہ نہیں ہے۔ نہ خود اُردو تنقید کا اچھا مطالعہ ہے، نہ انگریزی تنقید کا مطالعہ ہے۔ لکھنے والے صرف جدید لوگوں کو پڑھتے ہیں تو انھیں جدید لوگوں پر لکھتے ہیں۔ اس طرح وہ دوسرے بڑے writers اور شاعروں سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے اُن کی نظر بھی محدود ہوگئی ہے۔

ش ف: جدیدیت کے رجحان کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟ کیا جدیدیت ختم ہوچکی ہے؟

وارث علوی: جدیدیت ختم نہیں ہوئی۔ جدیدیت کا رجحان بہت ہی اہم رجحان تھا اور آج بھی ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو آدمی کو زندگی میں، فنکار کو اپنے فن میں، اپنے وقت کے جو نئے رجحانات، میلانات اور تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے پر اُکساتا ہے۔ فنکار کے لیے بہت مشکل یہ ہے کہ اس کا جو کلاسیکی ورثہ ہے وہ اسے بہت جلد جدید بننے نہیں دیتا۔ اس لیے اس کو کلاسیکی ورثے کے ساتھ جھگڑا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں سے کون سی چیزیں زندہ رہیں گی، زندہ رہنی چاہیے۔ اس کے کام آسکتی ہیں، وہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے جیسا کہ ٹی ایس ایلیٹ نے بتایا کہ روایت آدمی کو ورثے میں نہیں ملتی بلکہ آدمی کو روایت خود حاصل کرنی پڑتی ہے اور جو روایت وہ حاصل کرتا ہے اس میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ روایت جیسی ہوتی ہے ویسی وہ حاصل نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ جدیدیت ایک بہت Powerful اور بہت زبردست تحریک ہے اور یہ فنکار کو آزادی دیتی ہے کہ وہ جس طرح چاہیے اپنے فن کو برتے اور اس کے علاوہ جدیدیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دور جدید کے مسائل کو پیش کرتی ہے۔ لیکن بعض اوقات دور جدید کے مسائل اس طرح پیش کرتی ہے کہ بات بالکل سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ جیسے جدید دور کے اکثر ڈرامے بہت ساری نظمیں ناقابلِ فہم ہیں۔ جدیدیت میں ابہام کو بڑی اہمیت دی گئی اس میں 'کافکا' کے ڈرامے بھی ناقابلِ فہم ہیں۔ جدیدیت میں ابہام کے پہلو پر بہت کچھ لکھا گیا۔ مثال کے طور پر جیمس جوائس (James Joice) کی جدیدیت پر بہت کچھ لکھا گیا اور اس میں Stream of Consciousness پر بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن یہ نظریہ جہاں مشکل و مبہم تھا بہت سارے فنکاروں پر یہاں آسان بھی تھا، آسان بھی تھی اور اس کا انھوں نے استعمال بھی کیا، جدیدیت کے بہت سے پہلو ہیں اور ہر پہلو پر الگ طریقے سے غور کرنا چاہیے۔ ترقی پسند تحریک ایک مارکسی آئیڈیولوجی کی تحریک تھی اور آئیڈیولوجی کے ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ تحریک بھی ختم ہوگئی۔ جدیدیت کوئی آئیڈیولوجی لے کے نہیں آئی۔ جدیدیت ایک رجحان ہے۔ ایک میلان ہے۔ وہ ایک طرح کی Tendency۔ فنکار کے اندر خود یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ وہ دور جدید میں کس طرح سے شاعری کرے۔ لوگوں سے مخاطب ہو۔ لہٰذا وہ ایک منفرد اسلوب میں اظہارِ خیال کرتا ہے، جس میں وہ استعارے اور کنائے کا استعمال کرتا جو کسی قدر مبہم ہوتے ہیں۔

ش ف: آپ کے زمانے کا ادبی ماحول کیا تھا؟

وارث علوی: میرے زمانے کا ادبی ماحول بہت پُر جوش تھا۔ ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی اور اس تحریک سے احمد آباد کے چند نوجوانوں کا ذہن بھی بہت متاثر تھا۔ اس شہر میں بھی اس کی ایک شاخ قائم کی گئی اور مجھے اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ یہ 1946 تا 1951 کا زمانہ تھا۔ میری قیادت میں شہر میں بہت شاندار جلسے ہوئے اور ہنگامہ خیز مشاعرے ہوئے۔ جن عظیم شخصیتوں نے ان جلسوں میں شرکت کی، اُن میں سید سجاد ظہیر، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جوش ملیح آبادی، مجاز، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، نیاز حیدر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین شاخ احمد آباد کی سرگرمیوں نے جن All India Fame شعرا کو پیدا کیا اُن میں سب سے نمایاں نام محمد علوی اور عادل منصوری کا ہے۔

ش ف: نئی نسل کو تحقیق وتنقید کے حوالے سے آپ کا کیا مشورہ ہے؟

وارث علوی: نئی نسل کو میں کیا مشورہ دوں۔ نئی نسل میں مختلف المزاج لوگ پیدا ہوتے ہیں کوئی کمپوٹر میں جاتا ہے، کوئی ادب میں جاتا ہے۔ جو ادب میں آنا چاہتا ہے اس کو میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر آپ کو ادب سے، کتابوں سے، کتابیں پڑھنے سے محبت نہیں تو برائے مہربانی آپ ادب یا آرٹس کی طرف نہ آئیں۔ آپ کو نظمیں پڑھتے وقت ایک طرح کا جوش وخروش محسوس نہیں ہوتا یا آپ کو ناول اور افسانہ پڑھتے وقت ایک طرح کی فرحت محسوس نہیں ہوتی یا آپ کو ڈراما دیکھتے وقت یا ڈرامے پڑھتے وقت ایک زبردست ذہنی اور فکری اختراع نہیں ہوتا تو آپ ادب یا آرٹس کی طرف نہ آئیں۔

قومی اردو کونسل میں وارث علوی، محمد علوی اور مظہر الحق علوی کو دئے گئے استقبالیہ کا منظر

ش ف: فکشن کا زریں عہد کونسا تھا؟

وارث علوی: اردو فکشن کا زریں عہد ترقی پسند تحریک تھی کیونکہ وہ حقیقت نگاری کا عہد تھا۔ Realism کا عہد تھا اور Realism ناول اور افسانے کی Methodology ہے۔ جس میں شاہکار افسانے، ناول تخلیق کیے گئے۔ معیاری غزلیہ ونظمیہ ادب وجود میں آیا۔ لیکن جیسے ہی حقیقت نگاری ختم ہوئی۔ Symbolism آیا Myth آئی جو جدیدیت کی دوسری لائی ہوئی Absurd چیزیں تھیں۔ جس کی وجہ سے Realism اور حقیقت نگاری کا دور ختم ہوا اور افسانہ محض تجربات بن کر رہ گیا۔

ش ف: علامت نگاری اور تجریدیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

و ع: علامت نگاری اور تجریدیت کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان چیزوں کو میں سمجھ نہیں پاتا اس لیے ان چیزوں سے بہت لطف حاصل نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ان چیزوں کو میں پڑھتا رہتا ہوں، دیکھتا رہتا ہوں محض یہ جاننے کے خاطر کہ آخر یہ ہیں کیا؟ یہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کس قسم کی بات کرتے ہیں؟ اس میں جتنی Symbolic چیزیں ہیں وہ دل کو چھو جاتی ہیں، اچھی لگتی ہیں، افسانوں میں بھی اور نظموں میں بھی۔ لیکن کتنی چیزیں اتنی عظیم وشاندار رہیں میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لیے آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ تاج محل جیسی چیز اس آدمی نے تیار کی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اس کی معنویت کیا ہے۔؟

ش ف: گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

وارث علوی: اولاً گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی دونوں جدیدیت کے حامی وہم نوا تھے۔ پڑھے لکھے ہیں اور جدیدیت کے بارے میں اچھی چیزیں لکھیں، اچھی باتیں کہیں اور اُن کی تنقیدوں سے جدیدیت کے رجحان کو تقویت پہنچی۔ لیکن دونوں میں کمزوریاں بھی کافی ہیں۔ اُن کی کمزوریاں خوبیوں کی مانند مختصر نہیں ہیں۔

ش ف: اپنی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ؟

وارث علوی: میں ہائی سکول اور کالج کی زندگی اور گھر میں والد صاحب سے لے کر تمام اردو و فارسی کے اساتذہ، ہم جماعت طالبِ علموں جن کا ایم اے تک ساتھ رہا محققین سے گھرا رہا۔ اتفاق سے والد صاحب کا ایک چھوٹا موٹا آپریشن صابرمتی ندی کے پل کے اس پار ایک بڑے اسپتال میں ہوا۔ مضافات کا یہ علاقہ میرے لیے ایک نئی دنیا تھا۔ خوبصورت عمارتیں، کشادہ سڑکیں، صاف ستھرے خوش پوش لوگ، میں شہر کے جس علاقے سے آیا تھا وہ گلی کوچوں، مسجدوں، قبرستانوں، قصاب کے منگینیوں، چھیچھڑوں، اجابت کے ڈھیروں میں بیٹھے بیڑیاں پیتے مدقوق مہتروں اور مہترانیوں کا نہایت ہی غلیظ بدبودار علاقہ تھا۔ جس اسپتال میں والد صاحب کا آپریشن ہوا تھا اس کے سامنے ایک نہایت ہی دلکش عمارت رنگ بہ رنگ کے پھولوں سے جنتِ نظارہ بنی ہوئی کھڑی تھی۔ اس پر گجراتی حروف میں کندہ تھا۔ سیٹھ مانک لال جیٹھا لال لائبریری۔

میں نے لائبریری کے اندر قدم کیا رکھا کہ ایک طلسماتی دنیا نظروں کے سامنے آئی۔ وہ بڑے سے ہال میں دیواروں سے چسپاں اخبارات پڑھتے ہوئے لوگ۔ وہ میزوں پر کھلے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اور اندر سیکڑوں شیلف پر سجی ہوئی کتابیں۔ یکایک میں نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ سفید براق کھادی میں ملبوس گورے رنگ اور سفید بالوں میں ایک من موہنی صورت والے شخص نے مجھ سے پوچھا۔ کہاں پڑھتے ہو۔ میں نے کہا انجمن اسلام ہائی سکول میں۔ انھوں نے مجھے لائبریری فارم لاکر دیا۔ دوسرے روز لائبریری کے دو کارڈ میری جیب میں تھے۔ دنیا بھر کے ادب سے مالا مال الماریاں میرے لیے کھل جاتیں۔ اس لائبریری نے میرے لیے کالج کے اساتذہ کی جگہ لے لی ورنہ محققین کی صحبت کے زیر اثر کسی کاظم علی خان یا کسی ناظم علی خان پر ایک مقالہ لکھ کر خوش ہو لیتا اور دنیا کے کتنے تخلیلی کارنامے میری نظروں سے اوجھل رہتے۔

مانك لال لائبریری جس نے وارث علوی کی علمی و ادبی آبیاری کی

ش ف: ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل خطرے میں ہے یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

و ع: یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کیونکہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں لسانی تعصب بہت ہے اور بعض اداروں سے یہ کوشش بھی کی جارہی ہے کہ اردو زبان کو ختم کیا جائے۔ اس کی سب سے خطرناک صورت تعلیمی نظام سے اردو کو نکال دیا جائے۔ تاکہ بچے اردو میں تعلیم حاصل نہ کرسکیں۔ اس لیے اردو سکول بند ہورہے ہیں، اسکولوں میں اردو کلاسز ختم ہورہی ہیں۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان تو ہم لوگ نہیں کہتے لیکن اب آہستہ آہستہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہی بن کر رہ گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مسلمان معاشرے میں بھی یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ اُردو اُن کے کوئی کام کی چیز نہیں ہے۔ اردو میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بچوں کو اچھی ملازمت نہیں ملتی۔ تو یہ اردو کے لیے خطرہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ زبان کی ترویج و اشاعت میں جو حصہ لائبریریز و کتب خانوں کا ہوتا ہے اور ساتھ ہی جو Contribution کتب فروشوں کا ہوتا ہے وہ اب لگ بھگ ختم ہوگیا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو Labrieries کے ممبر ہوں، باقاعدہ لائبریری جاتے ہیں۔ اردو کتابیں ویسی بھی آج کل بہت مہنگی ہوگئی ہیں اور اس کے علاوہ لائبریری میں لوگ جاتے نہیں ہیں۔ اس لیے کتابوں سے ان کا رابطہ ختم ہوگیا ہے۔ لہٰذا جو کتابی کلچر تھا یا کلچر میں جو حصہ کتابوں کا تھا وہ اب نہیں رہا ہے۔ ایک زمانے میں خواتین رسالے 'عصمت' و دیگر راشد الخیری وغیرہ نکالتے تھے وہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پورے ہندوستان کے شرفا کے گھرانوں میں پائے جاتے تھے۔ خواتین انھیں پڑھتی تھیں اب ایسے رسالے کہیں نظر نہیں آتے۔ لہٰذا خواتین اردو سے بالکل بے بہرہ ہوگئی ہیں۔ پڑھنے کے لیے کوئی چیز اُن کے پاس نہیں ہے۔ اس طرح سے دیکھیں تو ہندوستان میں اردو کا چلن بہت کم ہوتا جارہا ہے بے شک یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض مدرسے بعض اسکول اردو کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کوشش منظّم نہیں ہوتی۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کوششوں سے متوقع نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ انفرادی کوششیں ہیں اور انفرادی کوششیں کچھ ہی کامیاب ہوتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ختم ہوجاتی ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل بہت ہی زیادہ مایوس کن ہے۔

■

Dr. Shah Faisal, R/O: Zaloora (Sopore), Distt.: Baramulla - 193201 (Kashmir)

شاہد اختر

پندرہواں کل ہند اردو کتاب میلہ

قومی اردو کونسل کا پندرھواں کل ہند کتاب میلہ اس بار جنوبی ہند کے اہم ترین شہر بنگلور میں منعقد کیا گیا تاکہ اردو زبان و ادب کے فروغ کو ملک کے اس خطے میں، جسے عام طور پر اردو سے دور سمجھا جاتا ہے، اور بھی آگے کی طرف لے جایا جاسکے اور جنوبی ہند میں اردو کتابوں کی اشاعت و فروخت کا بہتر ماحول تیار ہوسکے۔ 9 روز تک بنگلور کے وسط میں ایک بے حد کشادہ مقام پر اردو کتابوں کا میلہ سجایا گیا جس میں صرف کتابوں کی خرید و فروخت پر ہی زور نہیں دیا گیا بلکہ اردو تہذیب و ثقافت سے وابستہ محفلیں اور جلسے بھی منعقد ہوئے۔ پیش ہے بنگلور کے اردو حلقوں میں خوش گوار یادیں چھوڑ جانے والے اس کتاب میلے کی ایک تفصیلی رپورٹ:

ادبی اور تاریخی نقطۂ نظر سے اردو زبان و ادب پر نظر ڈالیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس زبان کی تخم ریزی گلستان ہند کے شمالی چمن کی صحت مند گنگا جمنی آب و ہوا میں ہوئی جب کہ اسے تناور درخت کی صورت عطا کرنے میں گلزار دکن کی کرشنا، گوداوری و موسی کی وادیاں معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوہ وِندھیا چل کا جنوبی حصہ علم و ہنر کی ترقی میں ملک کے کسی بھی خطے سے کم نہیں رہا ہے۔

نصیرالدین ہاشمی اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں کہتے ہیں کہ ''اس سرزمین نے بھی وہ باکمال ہستیاں پیدا کیں، جنھوں نے گلشن گیتی کے چمن کو رنگ برنگ کے علمی گل بوٹوں سے آراستہ و مزین کیا اور اپنی ظاہری ہستی کو نابود کرنے کے بعد بھی صفحہ روزگار پر سرسبز اور شاداب علمی گلشن کی اپنی یادگار چھوڑ گئیں۔''

اسی دیار کے شہر گلستان بنگلور میں 15واں کل ہند کتاب میلے کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے اشتراک سے عمل میں آیا جو 14 سے 22 ستمبر 2013 تک جاری رہا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے محکمہ برائے فروغ انسانی وسائل کا ایک خودمختار فعال ادارہ ہے جو اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور ہمہ جہت ترقی کے لیے ملکی سطح پر بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ کونسل نے کئی جہتوں پر کئی منصوبے و اسکیمیں چلا رکھی ہیں جن کا مقصد لوگوں میں اردو بیداری کے ساتھ گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کی پاسداری بھی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو خصوصی مقام حاصل ہے کہ مرکزی حکومت کا یہ واحد ایسا ادارہ ہے جو قومی سطح پر اردو کو فروغ دینے اور اسے عہد جدید کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے سے متعلق نو بہ نو اسکیموں اور منصوبوں کے ذریعے اپنے ہدف کو پانے کی سمت میں پروفیسر

شمع روشن کرتے ہوئے الحاج قمرالاسلام، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام اور عبیداللہ شریف

خطاطی کے نادر نمونوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے قمرالاسلام، مفتی اشرف علی باقوی، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

وسیم بریلوی اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کی سربراہی میں گامزن ہے۔

اس وقت ملک کی 26 ریاستوں کے 197 اضلاع میں کمپیوٹر کے 425 مراکز قائم ہیں۔ کیلی گرافی یا خطاطی کا فن اردو زبان سے وابستہ ایک ایسا فن ہے جس کی وقعت اور قدر کو تسلیم کرتے ہوئے 11 صوبوں کے 33 اضلاع میں 45 مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح فاصلاتی نظام تعلیم کے ملک گیر پیمانے پر تقریباً 235 اضلاع میں 1707 اسٹڈی سینٹر جاری ہیں۔ اس کے علاوہ کونسل کے ذریعے غیر سرکاری تنظیموں کے اسٹڈی سینٹر میں دوسالہ عربی ڈپلومہ کورس اور ایک سالہ سرٹیفکیٹ کورس بھی چلایا جاتا ہے۔ انھیں خدمات میں ایک خدمت محبان اردو اور قارئین کے لیے نہ صرف کتابیں شائع کرنا بلکہ سستی قیمتوں میں اردو بستیوں، قصبوں اور شہروں تک پہنچانا بھی شامل ہے۔ کونسل اس کام کو دو سطح پر انجام دیتی ہے ایک موبائل وین اور دوسری کتاب میلے کے ذریعے۔ موبائل وین سال میں مرحلہ وار ریاستوں کا دورہ کرتی ہے تاہم کتاب میلہ سالانہ تقریب ہے۔ کتاب میلے کے انعقاد کے لیے کونسل ایسی جگہوں کا انتخاب کرتی ہے جہاں محبانِ اردو کی کثیر تعداد ہو تاکہ اردو زبان سے والہانہ لگاؤ کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کے تئیں قارئین کے درمیان بیداری پیدا کی جاسکے۔ اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے مرکزی حکومت کس حد تک سنجیدہ ہے۔ اس پیغام کو کونسل اپنی کارکردگی کے ذریعے عوام تک پہنچاتی ہے۔ اردو خواص وعوام کی زبان تھی، ہے اور رہے گی۔ اسی لیے محبّ اردو کو مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ یونیسکو کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے جو دنیا کے مختلف حصوں اور بستیوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

یہ اردو کا وہ گہوارہ ہے جہاں اس زبان نے چلنا اور بولنا سیکھا۔ اکیسویں صدی کے اس جدید ترقی سے ہم آہنگ شہر میں اردو سے محبت رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے جس کا واضح ثبوت چار ہزار سے زائد اردو میڈیم اسکول ہیں۔ آج بھی تمام سائنسی و تکنیکی تبدیلیوں اور ترقی کے باوجود یہ شہر اردو زبان وتہذیب کا گہوارہ ہے۔

14 ستمبر سے 22 ستمبر تک چلنے والے اس میلے کے لیے کونسل نے بنگلور کے شیواجی نگر میں واقع چھوٹا میدان کا انتخاب کیا۔ یہاں اردو سے محبت رکھنے والے کثیر تعداد میں ہیں جہاں خوبصورت مساجد اور مدارس کی دلکش عمارتیں روح پرور نظارہ پیش کرتی ہیں۔

کتاب میلے کے آغاز سے قبل قومی کونسل کے فعال رکن 'روزنامہ پاسبان' کے ایڈیٹر عبیداللہ شریف، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، کرناٹک اردو اکادمی کے رجسٹرار سید مرزا اعظمت اللہ، کونسل کے دیگر افسران کی موجودگی میں ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ پریس میڈیا سے خطاب کرتے ہوئے عبیداللہ شریف نے کہا کہ پہلی بار شہر بنگلور میں اردو کتاب میلے کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ یہ کتاب میلہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کرناٹک اردو اکادمی کے اشتراک سے انعقاد کیا جارہا ہے۔ انھوں نے میلے کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس میلے کا مقصد قارئین تک آسانی کے ساتھ کتابوں کی رسائی کرنا ہے۔ کونسل کے عہدیداران ڈاکٹر کلیم اللہ اور شاہنواز محمد خرم نے بھی قومی اردو کونسل کی کوششوں اور کتاب میلے کے حوالے سے جانکاری فراہم کی۔ اس پرکشش کانفرنس میں جناب محمد اسیم، جناب محمد احمد، جناب ایم اے خان وغیرہ موجود تھے۔

پہلا دن: 15 **ستمبر** 2013

میلے کا افتتاح مہمانِ خصوصی وزیر اوقات حج و اقلیتی بہبود ریاست کرناٹک کے ہاتھوں فیتا کاٹنے کے بعد ہوا۔ اس طرح بنگلور کی تاریخ میں اولین اور سب سے

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین میلے کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے

معزز مہمانان ایس وشوناتھا کی تیار کردہ تعلیمی سی ڈی کا اجرا کرتے ہوئے

اردو میلے کے تعلق سے مشاہیر کی آرا

شفیق عابدی (مشہور شاعر): یہ قومی اردو کونسل کا مبارک قدم ہے۔ اردو ادب کے فروغ میں دکن کا اہم کردار ہے۔ کرناٹک میں شمالی ہندوستان کے مقابل زیادہ اردو اسکول ہیں۔ اس سے اردو نوازی کا ثبوت ملتا ہے۔

ضیا کرناٹکی (مشہور شاعر): میلے میں تقریباً پچاس کتب فروش اسٹال لگائے گئے ہیں۔ افتتاح کے دن میں نے تقریباً نصف اسٹال کا دورہ کیا۔ بہت ساری کتابیں ایسی ہیں۔ جنھیں ہم شہر کے کتب فروش کے پاس نہیں پاتے ہیں۔ ہمیں اس نمائش کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

سید حامد محسن (چیئرمین سلام سینٹر): میں اس کتب میلہ سے متاثر ہوا۔ کتابیں ذہن کی غذا ہیں۔ اگر ملت اسلامیہ حکمت و دانش کے میدان میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنا رشتہ کتابوں سے جوڑنا ہوگا۔ یہ نمائش اپنے کھوئے مقام کو حاصل کرنے کی طرف ایک قدم ہوگا۔

ملنسار اطہر احمد (آل انڈیا ریڈیو، بنگلور): کتب میلہ بہت سلیقے سے منعقد کیا گیا ہے۔ کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ اردو داں طبقے کو اس نمائش تک لانے کی مختلف تدابیر اختیار کی جانی چاہییں۔ پتہ نہیں یہ موقع بنگلور والوں کو کب نصیب ہو۔

اعظم شاھد (کالم نگار): اردو کتاب میلہ دراصل بنگلور میں اردو جشن ہے۔ یہ ہمارے لیے بہترین موقع ہے کہ ہم اپنی ذاتی لائبریریوں کو زیادہ سے زیادہ کتابوں سے آراستہ کریں۔

محترمہ شائستہ یوسف: بنگلور میں اردو کتاب میلے کا انعقاد یقیناً ایک بڑی بات ہے۔ سب سے پہلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور کرناٹک اردو اکادمی کو مبارکباد دیتی ہوں۔ اردو کتاب میلہ گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہمیں اس میلے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ریاض خان (محبِّ اردو): میلے کے اوقات اور جگہ بہت موزوں ہیں، ٹرانسپورٹ کی سہولت ہے، اذاں ہوتی ہے تو ہم نماز ادا کرنے چلے جاتے ہیں اور دوبارہ کتابوں کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ شام ہونے تک تھک جاتے ہیں اور ثقافتی پروگراموں سے محظوظ ہوتے ہیں۔

بڑے اردو کتاب میلے میں اردو کے قارئین اور شائقین کے ہجوم کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ وزیر موصوف نے میلے میں تشریف فرما عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ ٹیپو سلطان اور خواجہ بندہ نوازؒ کی سرزمین ہے جن کے دور میں دکنی اور اردو زبان کو ابتدا میں فروغ حاصل ہوا۔ اس سرزمین پر اردو کے فروغ کے لیے حکومت اور اردو داں طبقہ دونوں اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں گے۔ نعرہ بازی اور احتجاجی مظاہرے سے تہذیب کو زندہ نہیں رکھا جا سکتا بلکہ تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے کتابوں کی اشاعت کو فروغ دینا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ہندوستان کے دستور میں سیکولرزم، جمہوریت اور زبانوں کے حقوق کے اختیارات باقی رہیں گے۔ اردو کو کوئی فنا نہیں کر سکتا۔ یہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے، جس کی جھلک روزمرہ کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ وزیر موصوف نے اسٹالوں کے معائنے کے دوران کتب میلے میں اسکول کے طلبا کے ذریعے پیش کیے گئے خطاطی کے نمونوں سے متاثر ہو کر اردو اکادمی کے ذریعے ایک لاکھ روپے میں ان کے تیار کردہ خطاطی کے بے مثال نمونے خریدنے کی ہدایت دی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ دکن کا (جس میں ریاست کرناٹک بھی شامل ہے) فروغ اردو میں بہت اہم رول رہا ہے۔ دکن اردو کی ابتدا سے ہی شعرا اور ادیب حضرات کا مسکن رہا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنا پندرھواں کل ہند اردو کتاب میلہ یہاں منعقد کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بنگلور علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک بھر میں کونسل نے فن خطاطی کو زندہ رکھنے کے لیے 42 خطاطی مراکز قائم کیے ہیں اور میلے روزنامہ سیاست کے مینیجنگ ڈائرکٹر زاہد علی خاں کے اشتراک سے خطاطی کے نمونوں کی نمائش و فروخت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو ملک بھر کا دورہ کر کے جگہ جگہ اردو کا چراغ روشن کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے۔

عبیداللہ شریف ممبر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و ایڈیٹر 'روزنامہ پاسبان' نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس کتب میلے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اردو زبان میں نہ صرف مذہبی کتابیں ہیں بلکہ عصری، علمی، اور سائنس و ٹیکنالوجی کے علاوہ دیگر موضوعات پر کثیر تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ اس سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اردو زوال پذیر نہیں بلکہ ترقی پذیر زبان ہے۔ لہٰذا ہم اپنی نئی نسل کو اردو زبان اور اس کی تہذیب و ثقافت سے واقف کرائیں۔

طلبا و طالبات کے ہاتھوں میں ماہنامہ بچوں کی دنیا

اسکولی بچوں کے ذریعے قوالی کا دلکش منظر

مفتی اشرف علی نے محبان اردو سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کونسل نے اردو سے محبت رکھنے والوں کے لیے ایک نادر موقع فراہم کیا ہے۔ حکومت ہند کا ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو کی بقا اور اس کو عام کرنے کی مستقل کوشش میں مصروف ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی زبان قرآن کی زبان ہے اس کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ اسی طرح اردو اس دنیا کی آخری زبان ہے اس کے بعد شاید ایسی کسی اور زبان کی تخلیق نہیں ہوگی۔ اردو کو اگر خاتم اللسان کا درجہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

افتتاحی جلسے میں اردو داں طبقے کے ساتھ ساتھ لفٹیننٹ اینڈ کرنل شیو نارائن مکنڈ اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے کے سی گووند سوامی بھی شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک قومی زبان ہے اسے صرف مسلمانوں کے ساتھ جوڑنا غلط ہے۔ اس زبان کے فروغ میں ہندو مسلم اور سکھوں کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ اعظم شاہد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جب کہ اردو اکادمی کے رجسٹرار ایس مرزا اعظمت اللہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس افتتاحی جلسے کے اختتام پر ثقافتی پروگرام کا آغاز ہوا۔ ثقافتی پروگرام میں حصہ لینے کے لیے بنگلور و اطراف بنگلور کے سرکاری اسکول کے بچوں کا جم غفیر دیکھنے کو ملا۔ حاضرین کے بیٹھنے کی جگہ اور اسٹیج کو پھولوں اور روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ اس پروگرام کی نظامت سیف اللہ کر رہے تھے۔ بچوں نے ثقافتی پروگرام کا آغاز حمد و نعت سے کیا۔ بچوں کی مترنم آواز نے سامعین کو داد تحسین دینے پر بار بار مجبور کیا۔ حاضرین میں سب سے زیادہ تعداد خواتین کی تھی جو پوری یکسوئی کے ساتھ ثقافتی مظاہرے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ بچیوں کے ایک گروپ نے حب الوطنی کے نغمے سنائے۔ پروگرام میں حصہ لینے والے بچے اور بچیوں کو کونسل کی جانب سے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' بطور تحفہ عنایت کیا گیا۔

میڈیا کے دریچے سے

عبیداللہ شریف (مدیر روزنامہ پاسبان، بنگلور): پہلی بار شہر بنگلور میں اردو کتاب میلے کا انعقاد کر کے کونسل نے اس ریاست کے اردو کے شیدائیوں پر احسان کیا ہے۔ اس میلے میں نئے نئے موضوعات پر شائع کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے جس سے استفادہ حاصل کرنا چاہیے۔

صدیق آلدوری (روزنامہ سالار، بنگلور): کرناٹک کی تاریخ میں یہاں کے اردو داں طبقے کے لیے یہ کتاب میلہ ایک بہت بڑی نعمت کہی جا سکتی ہے۔ اس اردو کتاب میلے میں بیک وقت ہزاروں کی تعداد میں اردو ادب سے متعلق کتابیں دیکھنے کو ملی ہیں۔ اردو کتاب میلے کا انعقاد بنگلور میں کرنا ایک اچھی کوشش ہے اور شمالی ہند اور جنوبی ہند کے درمیان راستہ اور رشتہ استوار کرنے کی اچھی پہل ہے۔

نعمت اللہ حمیدی (روزنامہ راشٹریہ سہارا، بنگلور): قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کی ایک اچھی کوشش ہے کہ اس نے کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے اشتراک سے یہاں پر اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا ہے۔ اس میلے میں کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو داں طبقہ کے ذوق کی تسکین کے لیے متعدد ادبی ثقافتی اور مزاحیہ پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ اس میلے کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔

عبدالخالق (پبلشرز، ملت پیجس): مرکزی وزارت برائے ترقی انسانی وسائل کے ماتحت اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ملک کے کئی حصوں میں فروغِ اردو کے لیے سرگرم ہے جس کا ایک حصہ اردو میلہ بھی ہے۔ اس کتاب میلے کا انعقاد شہر بنگلور میں کیا گیا ہے۔ بنگلور کے باشندوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کرنا چاہیے۔

دوسرا دن: 16 ستمبر 2013

میلے کے دوسرے دن بنگلور اور اطراف بنگلور سے آنے والوں کی خاصی تعداد دیکھی گئی۔ کتاب میلے میں 75 اسٹال لگائے گئے تھے۔ جن کی ترتیب اس انداز سے دی گئی کہ قارئین و کتب شائقین کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو اور حسب منشا اپنی پسند کی کتابوں تک ان کی رسائی ہو سکے۔ دوسرے دن جن بک اسٹالوں پر بھیڑ دیکھی گئی ان میں قومی کونسل کے بک اسٹال، الحسنات پبلی کیشنز نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اردو اکادمی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، راجستھان اردو اکادمی، دہلی، اقرا ایکس اینڈ ملٹی میڈیا اکولہ، ادارہ کتاب الشفا، نئی دہلی، فردوس میڈیا ملی گزٹ نئی دہلی شامل ہیں۔

اقرا ایکس اینڈ ملٹی میڈیا اکولہ بک اسٹال پر اسکولی بچوں اور بچیوں کی لمبی قطار لگی تھیں۔ یہاں DVD کے ذریعے کلاس 3 سے لے کر 8 تک سائنس، جغرافیہ اور ریاضی کی درس و تدریس کی تفصیلات پیش کی گئی۔

پرتھم بکس نئی دہلی کے اسٹال پر خصوصاً بچوں کے لیے بہت ساری کتابیں دستیاب تھیں۔ بچے اپنے والدین کے ساتھ اس اسٹال سے کتابیں خریدنے میں مصروف تھے۔

ثقافتی پروگرام کے آغاز میں مہمانِ خصوصی محمد محسن کمشنر آف پبلک انسٹرکشن نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں اساتذہ کی ذمے داری اور فرائض زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اس مسابقتی دور میں اساتذہ کو بہت زیادہ چاق و چوبند رہنا چاہیے۔ اس موقعے پر

آن فائر گروپ کے ذریعے اسٹریٹ پلے کا منظر

مدرسہ و اسکول کے طلبا/ طالبات کا روح پرور منظر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اس ملک گیر کتاب میلے میں ملک کے مختلف شہروں سے کتب فروش اور علم و دانش سے وابستہ ادارے حصہ لے رہے ہیں۔ کونسل کے مختلف پروگراموں میں اردو کتاب میلہ بھی ایک اہم تقریب ہے۔ اس کے ذریعے فروغ اردو اور اردو ادب کی ترویج میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس جلسے میں جناب سابق ایم ایل سی عظیم الدین نے خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ کتاب میلہ محبان اردو کے لیے ایک نعمت ہے۔ اردو داں طبقہ جوق در جوق حاضر ہوکر اردو سے اپنے لگاؤ کا ثبوت پیش کرے۔

پروگرام میں سرکاری اسکول کے بچے اپنے اپنے فن کو خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کررہے تھے۔ تقاریر کے مقابلہ جاتی پروگرام کا بھی انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں کئی اسکول کے بچوں نے حصہ لیا۔ بچوں کو کونسل کی جانب سے کرناٹک اردو اکادمی کے رجسٹرار مرزا عظمت اللہ کے ہاتھوں انعامات دیے گئے۔ اسی مقابلہ جاتی نشست کے بعد سرکاری اسکول کے بچوں نے ساز وآواز کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ قوالی کے ساتھ غزل سرائی بھی کی۔ اس میں حصہ لینے والے زیادہ تر بچے 5ویں سے آٹھویں جماعت کے تھے جنھوں نے اپنی مسحور کن آواز و انداز سے ناظرین کے دل جیت لیے۔ بنگلور میں قائم آن فائر گروپ کی طرف سے اسٹریٹ پلے کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان 'اپنا خیال رکھیے' تھا۔ اس اسٹریٹ پلے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ سہ لسانی زبان پر مشتمل تھا۔ حاضرین مجلس نے اس پیش کش کی بھرپور ستائش کی۔

سرکاری اسکول کے بچوں میں یہ فنی صلاحیت اور فنکارانہ جوش و جذبہ اور اردو زبان سے بے حد لگاؤ اردو کے خوش آئند مستقبل کی ضمانت ہے۔ ثقافتی پروگرام کی نظامت سیف اللہ نے کی۔

قومی اردو کونسل کے کتاب میلوں میں

اردو کتابوں کی فروخت کا قومی ریکارڈ

	ماہ	سال	مقام	مجموعی فروخت
1	نومبر	2000	لال قلعہ، دہلی	10 لاکھ روپے
2	نومبر	2001	لال قلعہ، وہلی	12 لاکھ روپے
3	جنوری	2003	انجمن اسلام، صابوصدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	16 لاکھ روپے
4	ستمبر	2003	سری نگر، جموں کشمیر	22 لاکھ روپے
5	جنوری	2004	انجمن اسلام، صابوصدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	23 لاکھ روپے
6	دسمبر	2004	حیدرآباد، آندھراپردیش	24 لاکھ روپے
7	وسمبر	2005	لکھنؤ، اترپرویش	23 لاکھ روپے
8	دسمبر	2006	کولکاتہ، مغربی بنگال	16 لاکھ روپے
9	نومبر	2007	پٹنہ، بہار	14 لاکھ روپے
10	جنوری	2009	ممبئی، مہاراشٹر	26 لاکھ روپے
11	فروری-مارچ	2010	حیدرآباد، آندھراپردیش	52 لاکھ روپے
12	مارچ	2011	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	15 لاکھ روپے
13	جنوری	2012	انجمن اسلام، صابوصدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	52.4 لاکھ روپے
14	نومبر	2012	لکھنؤ، اترپردیش	25 لاکھ روپے
15	ستمبر	2013	شیواجی، چھوٹا میدان، بنگلور، کرناٹک	31 لاکھ روپے

تیسرا دن: 17 ستمبر 2013

شہر گلستان بنگلور وندھیاچل اور نیل گری پہاڑوں کی آغوش میں ہونے کی وجہ سے اس شہر کا درجہ حرارت بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے۔ موسم کا مزاج صبح سے ہی شوخی لیے ہوئے تھا۔ ابر آلود آسمان اور رم جھم بارش نے محبان اردو اور شائقین کے جذبات اور احساسات کو دوبالا کردیا تھا۔ اس موسم میں بھی شائقین کتب میلے میں نظر آئے۔ یوں تو اس کتاب میلے میں فن خطاطی کے نمونے پہلے ہی دن سے عوام و خواص کی خصوصی دلچسپی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا ایک بڑا مجمع اس اسٹال پر امڈا پڑا تھا۔

الحسنات کے اسٹال پر پروفیسران وکالج کے طالب علموں کا جم غفیر تھا۔ یہاں پاکستان کی نایاب اور نادر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ثقافتی پروگراموں کے تحت چھوٹے عزیز نازاں اینڈ پارٹی نے قوالی کی تہذیبی وراثت یاد دلا دی۔ عزیز نازاں نے صوفی کلام کے علاوہ بھی دیگر کلام کو اپنے مخصوص لب و لہجے میں پیش کیا اور داد و تحسین حاصل کی۔ قوالی کے شائقین آخری لمحے تک یکسوئی کے ساتھ سنتے رہے۔ پروفیسر ن م سعید، صدر شعبہ بنگلور یونیورسٹی، سابق صدر کرناٹک اردو اکادمی

مشہور قوال چھوٹے عزیز نازاں اینڈ پارٹی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے

مشہور و معروف خطاط نعیم صابری اپنے فن کا جوہر دکھاتے ہوئے

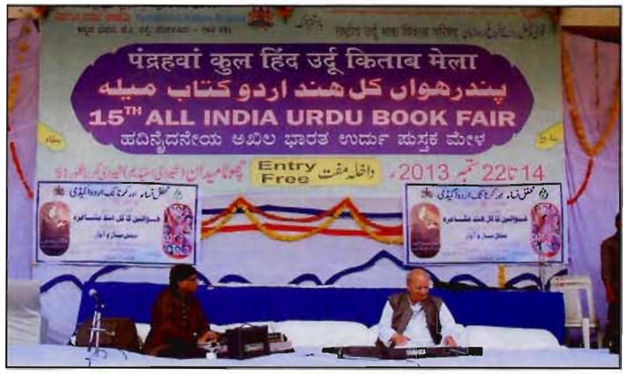

ہر کشن پاہوا کے غزل سرائی کا دلکش منظر

بزرگ خواتین کتاب خریدتے ہوئے

اور ماہر تعلیم سید سیف اللہ نے میلے میں شریک ہوکر یہاں کے انتظامات اور ادبی ثقافتی پروگرام کو سراہا۔ پروفیسر ن م سعید نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور یہ ہندوستانی تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس موقعے پر مرزا عظمت اللہ اور حافظ محمد کفایت اللہ نے دونوں مہمانوں کی گل پوشی کی اور عبدالکریم دیسائی نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ محکمہ اقلیتی بہبود کے انڈر سکریٹری عباس شریف اور سماجی کارکن سید شجاع الدین نے تمام فنکاروں کی گل پوشی کی۔

چوتھا دن: 18 ستمبر 2013

میلے کے چوتھے دن بھی گزشتہ دنوں کی طرح گہما گہمی کا ماحول بنا ہوا تھا۔ شہر کے چہار جانب سے اردو شائقین کتابوں کی خریداری کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ اردو کتاب میلے کے متعلق اردو داں طبقے میں جوش وخروش دیکھا جا رہا تھا۔ محفل نساء کی صدر محترمہ شائستہ یوسف کا کہنا تھا کہ اردو کتب میلہ بنگلور اور ریاست کرناٹک کے اردو داں طبقے کے لیے بہترین موقع ہے کہ ہم اپنی ذاتی لائبریریوں کو زیادہ سے زیادہ کتابوں سے سجائیں۔ جن بک اسٹالس میں بھیڑ دیکھی جا رہی تھی ان میں اقرا بکس اور ملٹی میڈیا خاص تھے۔ یہاں سائنس اور ماحولیاتی تعلیم کے لیے بہترین سی ڈیز موجود تھیں۔ یہ ادارہ غیر تجارتی بنیادوں پر کام کر رہا ہے۔ شائقین کی بھیڑ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس کی جانب بڑھ رہی تھی جہاں قرآنی نسخے تھے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ اردو کے لیکن انگریزی رسم الخط میں شائع شدہ ہے۔ علمائے کرام اور مدارس کے بچے میلے میں خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ان حضرات نے فقہ اکادمی دہلی کا مشاہدہ کیا۔ اس اسٹال پر جدید مسائل سے متعلق علمائے کرام کے فتاوے اور ان پر مباحث پر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔

اس کتاب میلے میں محفل نسا کی جانب سے خواتین کا کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے سے پہلے محفل نسا کی صدر شائستہ یوسف کی صدارت میں محفل ساز وآواز کے تحت بنگلور کے مشہور گلوکار ہری کشن پاہوا نے چند شاعرات کی غزلوں کو اپنی خوبصورت اور مسحور کن آواز میں سنا کر حاضرین سے داد وتحسین حاصل کیں۔ شائستہ یوسف نے اس موقعے پر کہا کہ مشاعرہ ہمارا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہے۔ ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ اس اجلاس کے مہمانِ خصوصی رہے۔ محفل نسا کی نائب صدر ڈاکٹر زبیدہ بیگم نے نظامت کے فرائض انجام دیے، سکریٹری ڈاکٹر مہ نور زمانی بیگم نے مہمانوں کا استقبال کیا اور جوائنٹ سکریٹری محترمہ فریدہ رحمت اللہ نے شکریہ ادا کیا۔ مشاعرے کی نظامت محفل نسا کی نائب صدر ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے کی اور سکریٹری ڈاکٹر زمانی نے شاعرات کو گلدستے پیش کیے۔ مشاعرے کی صدر شائستہ یوسف کے کلام پر مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ شہریان بنگلور کی کثیر تعداد بشمول پروفیسران، ادبا وشعرا اور باوقار ہستیوں نے مشاعرے میں شرکت کی۔ جن معزز اور مشہور شاعرات نے مشاعرے میں شرکت کی ان کے نام حسب ذیل ہیں: ریشما طلعت شبنم، شہنواز بانو شاہین، تسنیم جوہر، صادقہ نواب سحر، مونا ایلیز ابیتھ کورین، شاکرہ بیگم صبا، فریدہ رحمت اللہ، شفیق پروین، ڈاکٹر فرزانہ فرح، نجیبہ خانم نرگس، ڈاکٹر فاطمہ زہرا اور محترمہ شائستہ یوسف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

پانچواں دن: 19 ستمبر 2013

پچھلے چار دنوں سے میلے میں ریاست بھر سے محبانِ اردو ادبا، شعرائے کرام علما، اساتذہ، طالب علم، ریسرچ اسکالر، صحافی میڈیا پرسن اعلیٰ افسران وغیرہ نے شریک ہوکر کتابوں کی نمائش وخریداری میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ کتاب میلے کا بنگلور میں انعقاد کرنا قومی کونسل کی قابل ستائش کارنامہ ہے۔ میلے کے پانچویں دن اسکولی بچے خطاطی کے اسٹال پر بیٹھے

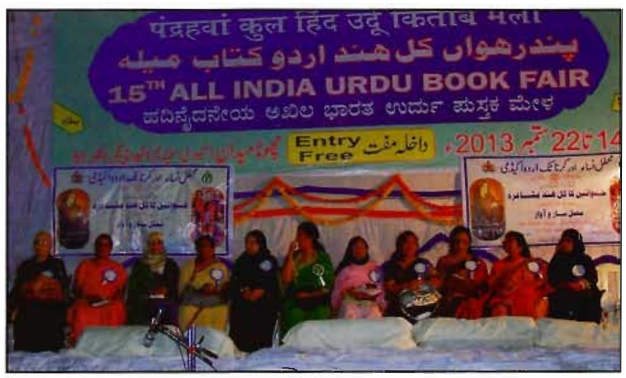

کل ہند خواتین مشاعرے میں شرکت کرنے والی شاعرات

مشاعرے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بنگلور کی ادب نواز خواتین وحضرات

مفتی اشرف علی کتابوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے

اسٹال پر مدرسے کے طالب علم اپنی پسندیدہ کتابوں کی تلاش میں

معروف خطاط جناب نعیم صابری کی راست خطاطی کو دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آئے۔ اس نمائش میں حیدرآباد کے ایسے خطاطوں کے نایاب نمونے نمائش کے لیے رکھے گئے جو بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ ان کے فن کی ندرت اور دلکشی نظروں کو خیرہ کرگئی۔ کم و بیش سبھی بک اسٹالوں پر بھیڑ تھی۔ اپنی پسند کی کتابوں کی تلاش میں شائقین تھک کر نڈھال ہوجاتے۔ طبیعت میں تازگی اور چستی لانے کے لیے ثقافتی پروگرام کی طرف رجوع کرتے۔ پانچویں دن ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے میں شرکت کے لیے ریاست کرناٹک کے معروف و مشہور شعرائے کرام مدعو کیے گئے تھے۔ مشاعرے کی صدارت ایڈووکیٹ ضیا کرناٹکی نے فرمائی جب کہ نظامت شفیق عابدی نے کی۔ محبان اردو شعرا کے کلام سے محظوظ ہوئے۔ اس مشاعرے میں بحیثیت مہمانِ خصوصی جناب سید احمد ایثار اور ڈاکٹر راہی فدائی جلوہ افروز تھے۔ جنھوں نے شعرا کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ سبھی نے اس مشاعرے کو کامیاب قرار دیا۔ اس مشاعرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کالج کی طالبات کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ ادب و تہذیب اور روایت کی پاسداری کرتے ہوئے شہر گلستاں کے محبانِ اردو اور شائقین نے اپنے اردو ذوق کا بھرپور ثبوت دیا۔ جن معروف شعرائے کرام نے اپنے کلام پیش کیے ان میں مبین منور، مولانا حنیف افسر عزیزی، اختر علوی، عزیز ڈار، جناب عبدالحلیم راہی، شیخ حبیب، نیاز الدین نیاز، ڈاکٹر احمد اللہ حمید، الف احمد برق اور اثر جعفری قابل ذکر ہیں۔ مشاعرے کے اختتام پر اردو اکادمی کرناٹک کے رجسٹرار جناب مرزا عظمت اللہ نے شائقین اور شعرائے کرام کا شکریہ ادا کیا۔

چھٹا دن: 20 ستمبر 2013

15 واں کل ہند اردو کتاب میلہ شہر بنگلور ہی نہیں بلکہ جنوب کے محبانِ اردو کے لیے ایک جشن کی کیفیت لیے ہوئے تھا۔ اس تاریخی کتب میلے میں ہزاروں سے زائد عنوانات پر کتابیں دستیاب تھیں۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک کے لیے، مذہبی کتب کے شائقین ہوں کہ تاریخی کتب کے قارئین۔ یہ میلہ تمام قسم کے ذوق رکھنے والوں کی ادبی آبیاری کر رہا تھا۔ بعض اسٹالس پر بیرونی ممالک کی بہت ساری نایاب اور نادر کتابیں بھی دستیاب تھیں۔ محبان اردو اس ذخیرے کا بھرپور فائدہ اٹھانے میں مصروف نظر آئے۔ اردو داں طبقے میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کی غرض سے امیر شریعت مفتی محمد اشرف باقوی بلا ناغہ کتاب میلے میں قارئین کی حیثیت سے دینی کتب خریدنے میں مشغول تھے۔ ان کے ساتھ علما کی ایک بڑی جماعت بھی تھی۔ کالج کے طالب علموں کا ہجوم ساہتیہ اکادمی دہلی کے اسٹال پر دیکھا گیا۔ اس بک اسٹال پر 50% رعایت پر کتابیں فروخت کی جارہی تھیں۔ میلے میں پیش کیے جانے والے ثقافتی پروگرام میں انجمن خوش دلان کی جانب سے مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا، مشاعرے کے آغاز سے قبل کئی اہم ادبی رسالے اور کتب کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ سہ ماہی طنز و مزاح رسالے کا اجرا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے بدست کیا گیا۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی مرتب کردہ تصنیف 'لطیفوں کا خزانہ' کی رونمائی جناب ریاض احمد سابق رکن کے بی سی کے ہاتھوں ہوئیں۔ وہاب عندلیب کی تصنیف 'سلیمان خطیب شخص شاعر اور نثر نگار' کا اجرا بدست سید مصطفی کمال مدیر ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد کے ہاتھوں ہوا۔ رسم اجرا کی تقریب کے بعد مزاحیہ مشاعرے کا آغاز ہوا۔ اس مشاعرے میں مہمان خصوصی مصطفیٰ کمال نے آج کے دور میں مزاحیہ شاعری کو ضروری قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ لوگ آج مسکرانا بھی بھول گئے ہیں۔ اس کرب کا مداوا مزاحیہ شاعری سے ممکن ہے۔ تمام شعرا نے

کل ہند مشاعرے کا منظر

اسکول کے بچے پروگرام ساز و آواز پیش کرتے ہوئے

میلے میں انجمن خوش دلان کی جانب سے خلیل احمد، معروف ادیبہ فوزیہ چودھری کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے

طنز و مزاح کی کتابوں کے اجرا کا منظر

اپنے مزاحیہ کلام سے سامعین کو ہنسنے پر مجبور کیا۔ اس مشاعرے کی نظامت شفیق عابدی نے کی۔ اردو اکادمی کرناٹک کے رجسٹرار نے تمام محبان اردو اور ریاست بھر سے تشریف لائے شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

ساتواں دن: 21 **ستمبر** 2013

ساتویں دن مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل انسانی ڈاکٹر ایم ایم پلم راجو کی آمد نے شہر گلستاں بنگلور کے باشندوں میں جوش و خروش پیدا کر دیا۔ میلے کے منتظمین ان کی آمد کو لے کر صبح سے جلسہ گاہ کی تیاری میں لگے تھے۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر نے بذات خود اپنی نگرانی میں تمام تیاریوں کا جائزہ لیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ شائقین اور محبانِ اردو وقت سے پہلے اپنے ہر دل عزیز رہنما کی جھلک پانے کے لیے بڑی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے بتایا کہ وزیر موصوف محبانِ اردو میں سے ایک ہیں اور ان کی ذاتی دلچسپی اردو زبان و ثقافت سے بہت رہی ہے۔ آپ کا تعلق حیدرآباد سے ہے جو جنوب میں اردو کا ایک اہم مرکز ہے۔ وزیر موصوف کے استقبال کے لیے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پدم شری پروفیسر اختر الواسع، رکن کونسل جناب مولانا علیم الدین اسعدی، کرناٹک اردو اکادمی کے رجسٹرار مرزا عظمت اللہ بیگ، ڈاکٹر کلیم اللہ اور کونسل کے ایڈمنسٹریٹیو آفیسر جناب کمل سنگھ اور دیگر ارکان موجود تھے۔ وزیر موصوف نے میلے میں اپنی شرکت سے اردو دوستی کا ثبوت پیش کیا اور خصوصاً خطاطی کی نمائش دیکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

اردو زبان دنیا میں بولی جانے والی چوتھی سب سے بڑی زبان ہے۔ اس کی ایک عظیم تاریخ ہے۔ بہتر روزگار کے لیے مادری زبان اور تہذیب سے روگردانی اچھی علامت نہیں ہے۔ اس عظیم زبان کو اپنا کھویا ہوا مقام دلانے کے لیے وزارت فروغِ انسانی وسائل ہر ممکنہ کوشش کر رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب ایم ایم پلو راجو وزیر برائے انسانی وسائل نے قومی کونسل برائے فروغ اردو اور کرناٹک اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقدہ کتاب میلے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو تعلیم کے ساتھ ہنر کی واقف کرنے کے لیے وزارت کی طرف سے کئی اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو صرف ایک مخصوص طبقے کی زبان قرار دینا غلط ہے۔ اردو کو ذریعہ معاش سے جوڑ کر نہ دیکھا جائے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملک کی یہ خوش نصیبی ہے کہ آج وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ ایک ماہر معاشیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر اردو داں بھی ہیں۔ عموماً وہ اپنی تقاریر اردو رسم الخط میں تحریر کرتے ہیں جو اردو سے ہمدردی اور اردو نوازی کا ثبوت ہے۔ وزیر موصوف نے سیاست آرٹ گیلری میں رکھے گئے خطاطی کے نمونے سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دنیا بھر میں خطاطی ایک مایہ ناز فن ہے۔ اس کا تحفظ کرنا ہر ایک کی ذمے داری ہے۔ انھوں نے کہا کہ رواں ماہ میں یونیسکو کی جانب سے فرانس کی راجدھانی پیرس میں خطاطی پر ایک عالمی نمائش کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ سیاست آرٹ گیلری میں خطاطی کے نمونوں کو پیش کرنے والے معروف خطاط نعیم صابری کو آئندہ سال اس بین الاقوامی نمائش کا حصہ بنایا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے رکن اور دہلی اردو اکادمی کے نائب چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو زبان کسی ایک خاص طبقے یا قوم تک محدود نہیں ہے۔ اردو کو فروغ دینے میں ملک میں جہاں مدرسوں نے اپنا نمایاں رول ادا کیا وہیں فلموں سے بھی اس زبان کی ترویج کافی حد تک ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کا رشتہ پیٹ سے نہیں بلکہ دل سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو

کرناٹک کے معروف مزاح نگار اپنے مزاحیہ مضامین پیش کرتے ہوئے

ریاست کرناٹک کے محبان اردو

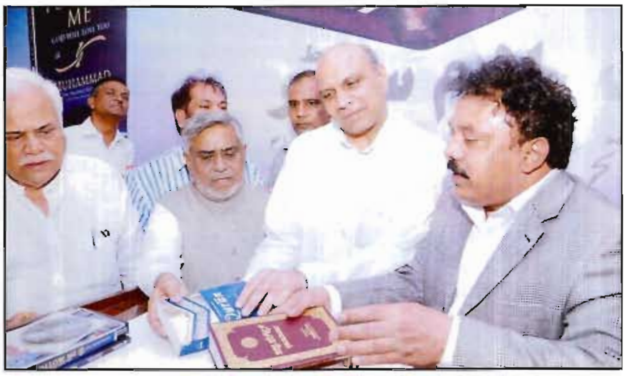

ڈاکٹرایم ایم پلم راجوسلام سینٹر کے اسٹال پر قرآنی نسخے کا معائنہ کرتے ہوئے، سید حامد محسن، پروفیسر اخترالواسع و کرناٹک کے وزیر دیش پانڈے

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین وزیر موصوف کو خطاطی کا نمونہ دکھاتے ہوئے، ساتھ میں پروفیسر اخترالواسع

زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور جناب وزیر موصوف کی خدمت میں خطاطی کا ایک نمونہ پیش کیا۔

اردو کتاب میلے میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ناشرین کو وزیر موصوف کے ہاتھوں انعامات سے نوازا گیا۔ کتابوں کی سب سے بہترین نمائش کے لیے 'الحسنات پبلشرز' نئی دہلی کو انعام پیش کیا گیا۔ کتابوں کے بہترین مجموعے کا انعام ادارہ کتاب الصفا نئی دہلی کو دیا گیا۔ جب کہ سب سے زیادہ اردو کتابیں فروخت کرنے کا سہرا بھارت سیوک فاؤنڈیشن کے سر گیا۔ اِس تقریب میں کرناٹک کے وزیر تعلیم جناب دیش پانڈے، کمشنر برائے ایجوکیشن جناب محمد محسن اور رکن کونسل جناب مولانا علیم الدین اسعدی مہمان ذی وقار کی حیثیت سے جلوہ افروز تھے۔ اس پروگرام کے بعد ثقافتی پروگرام کا آغاز ہوا جن میں مختلف کالجوں اور اسکولوں کے تدریسی عملے طلبا و طالبات نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ شائقین اس ثقافتی پروگرام سے کافی لطف اندوز ہوئے۔ اس کے بعد شام غزل کے عنوان سے ایک پروگرام عمل میں آیا جس میں مشہور غزل گلوکار اکبر یوسفی اور گروپ نے اپنے کمالاتِ فن کا مظاہرہ کیا۔ شائقین نے داد تحسین سے نوازا۔

آٹھواں دن : 22 ستمبر 2013

اردو کتاب میلے کی شکل میں جاری اردو کا جشن پوری شان و شوکت کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ آخری دن اردو کتابوں کے شائقین بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنی پسندیدہ کتابوں کا انتخاب کرتے نظر آئے۔ کتب میلے کے آخری دن شہر کے اطراف و جوار اور پڑوسی ریاستوں کے اضلاع سے بھی شائقین حاضر ہوئے۔

کتاب میلے کا باضابطہ افتتاح 15 ستمبر کو جناب قمرالاسلام وزیر برائے وقف حج و اقلیتی بہبود کے ہاتھوں ہوا تھا۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور شہر کی معزز ادبی شخصیات بشمول امیر شریعت مفتی اشرف علی باقوی، افتتاحی تقریب میں شامل تھے۔ اردو کی عظمت، اہمیت اور ملک کے سیکولر کردار میں اردو کا رول ان موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اس پندرہویں کتاب میلے کا بنگلور میں انعقاد کو دکن میں اردو کی عظمت رفتہ کی احیا کا نام دیا۔ میلے کے لیے گزشتہ دنوں بڑے دلچسپ پروگرام منعقد کیے گئے۔ ان میں خواتین کا مشاعرہ، بچوں کا مقابلہ جاتی پروگرام، ڈرامہ، قوالی، مزاحیہ مشاعرہ، اور غزل سرائی میں اکبر یوسفی اور ہر کشن پاہوا کا پروگرام قابل ذکر ہے۔ اس تاریخی کتاب میلے میں عزت مآب جناب ایم ایم پلو راجو کی شرکت اور ان کی نیک خواہشات نے محبانِ اردو میں جوش و جذبہ بھر دیا۔ وزیر موصوف کے ہاتھوں کتب فروشوں کی کارکردگی پر انعامات دیے گئے۔ اس میلے میں کل کتابوں کی فروخت لگ بھگ 31 لاکھ بتائی گئی۔

کتاب میلے کے کامیاب انعقاد پر ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شہریانِ بنگلور، صحافیوں، اخبارات کے مالکان، مختلف ادارہ کے ذمے داروں اور فن کاروں کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ گزشتہ دس دنوں کے دوران اردو کے ناشرین، شہر بنگلور کے مہمان تھے۔ ان کی شہر میں شایانِ شان مہمان نوازی کی۔ کتاب میلے کے اختتامی پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارکان جناب مولانا علیم الدین اسعدی و جناب عبیداللہ شریف نے بھی تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ اس پندرہویں کل ہند کتاب میلے کے میڈیا انچارج ڈاکٹر شاہد اختر انصاری نے تمام حاضرین کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔

■

Dr. Shahid Akhtar Ansari,38/7, Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

ڈاکٹر ایم ایم پلم راجو، وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کی آمد پر اسکول کی طالبات قومی ترانہ پیش کرتے ہوئے

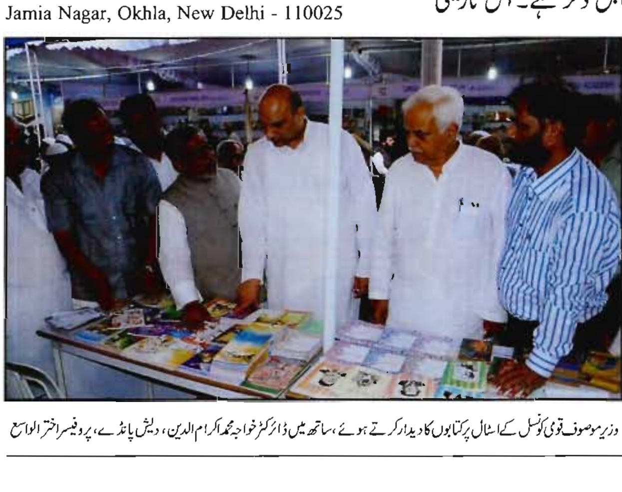

وزیر موصوف قومی کونسل کے اسٹال پر کتابوں کا دیدار کرتے ہوئے، ساتھ میں ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، دیش پانڈے، پروفیسر اخترالواسع

ترتیب: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

سوانحی خاکہ

علی سردار جعفری

نام: علی سردار جعفری، **خاندان:** ساداتِ جعفری، **وطن:** بلرام پور، ضلع گونڈہ
والد کا نام: سید جعفر طیار جعفری، **والدہ کا نام:** زاہدہ خاتون جعفری
دادا کا نام: سید مہدی حسن جعفری، **بہن بھائی:** سات بہنیں (بالترتیب زبیدہ خاتون، جعفری خاتون، فخر النسا، صادقہ خاتون، قمر النسا، رباب بانو اور شہر بانو۔ ایک بھائی ظفر مہدی۔

تاریخ پیدائش: 29 نومبر 1913 (بلرام پور ضلع گونڈہ)
تاریخ وفات: 1 اگست 2000، ممبئی

تعلیم: (1) بی اے (دہلی یونی ورسٹی دہلی) (2) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (1936 میں انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمی کے جرم میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے نکلنا پڑا) (3) ایم اے (سال اوّل)، لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ (40-1939 میں اپنی شاعری میں مخالف جنگ پروپیگنڈا کرنے پر انھیں فائنل امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا اور گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور جیل سے رہائی پر بلرام پور میں نظر بند رہے)

اساتذہ: پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد اشرف، خواجہ منظور حسین، پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر سدھانت وغیرہ۔

شادی: 1948 (سلطانہ منہاج سے) **اولاد:** دو بیٹے اور ایک بیٹی

پسندیدہ رنگ: سرخ، سبز، نیلا

جیل، معیادِ قید اور نوعیت سزا: (1) لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل اور بنارس سنٹرل جیل آٹھ ماہ، مخالف جنگ شاعری کرنے پر (2) آرتھر روڈ جیل اور سنٹرل جیل ناسک، ڈیڑھ سال (بقول سردار جعفری بلاوجہ)

مشاہیر عالم سے ملاقاتیں: ٹیگور، سروجنی نائیڈو، جواہر لال نہرو پبلو نرودا، ولاتھول، جولو کیوری، ایلیا اہرن برگ، پال روبسن، لوئی آراگاں، فدئیف، ترسون زادہ، خروشچوف، یوری گگارین، ناظم حکمت، شیخ محمد عبداللہ اوما شنکر جوشی، پنڈت اودے شنکر، پنڈت وی شنکر، استاد اللہ رکھا (طبلہ نواز)، پنڈت اوم کارناتھ ٹھاکر (موسیقی) ایم ایف حسین (مصور)، جیمنی رائے (پینٹر)، ستیہ جیت رے، یوسف خاں (دلیپ کمار)، پرتھوی راج کپور، راج کپور، نرگس

زبانوں سے واقفیت: اردو، فارسی، انگریزی

سیر و سیاحت: پاکستان، عراق، خلیجی ممالک، قطر، یمن (شمال وجنوبی)، لبنان، مصر، یونان، فرانس، ڈنمارک، سویڈن، ناروے، انگلستان، امریکہ، کناڈا، جرمنی، چیکوسلواکیہ، بلغاریہ، سوویت یونین (تاجکستان، ازبکستان، روس، سائبریا، جارجیا، آذربائیجان) وغیرہ۔

تحریکات یا سیاسی جماعتیں جن میں نمایاں حصہ لیا: (1) کمیونسٹ پارٹی (2) کانگریس

ملازمت یا پیشہ: کبھی نہیں کی۔

تصانیف: (شاعری): (1) پرواز، 1943 (2) خون کی لکیر 1949 (3) نئی دنیا کو سلام، 1948 (4) امن کا ستارہ، 1950 (5) ایشیا جاگ اٹھا، 1951 (6) پتھر کی دیوار، 1953 (7) ایک خواب اور، 1964 (8) پیراہنِ شرر، 1965 (9) لہو پکارتا ہے، 1978، (10) سرحد (آڈیو البم جسے سیما سہگل نے آواز دی تھی اور 1999 میں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اسے لے کر پاکستان گئے۔ (11) میرا سفر (ہندی میں منتخب نظمیں)، (12) چراغ دیر، 1997 (13) سرمایہ سخن، (نثر) (1) منزل، 1938، (2) ترقی پسند ادب، 1953، (3) لکھنؤ کی پانچ راتیں، 1965، (4) پیغمبرانِ سخن، 1970، (5) اقبال شناسی (6) غالب اور اس کی شاعری (انگریزی- بہ اشتراک قرۃ العین حیدر) (7) ترقی پسند تحریک کی نصف صدی (نظام اردو خطبات، دہلی یونیورسٹی)، (8) یہ کس کا خون ہے (ڈراما)، 1943، (9) پیکر 1943

مضامین: ادب، ثقافت اور سیاست پر اردو اور انگریزی میں 300 سے زائد مضامین۔

تدوین و ترتیب: (1) دیوانِ غالب (2) دیوانِ میر (3) کبیر بانی (4) پریم وانی

تراجم: آپ کی منتخبہ نظموں کا روسی، ازبک اور فارسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بعض نظمیں انگریزی، فرانسیسی، عربی اور متعدد ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ ایک طویل نظم 'امن کا ستارہ' بارہ ہندستانی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے ایک طویل ڈرامائی نظم 'نئی دنیا کو سلام' کو چودہ زبانوں میں ترجمے کے لیے منتخب کیا تھا۔

انعامات واعزازات: (1) سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ 1965 (2) پدم شری 1967 (3) جواہر لال نہرو فیلوشپ 1969 (4) سجاد ظہیر ایوارڈ لکھنؤ 1974 (5) اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ 1977 (6) اقبال میڈل (پاکستان) 1978، (7) اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ 1979، (8) مخدوم ایوارڈ اردو اکیڈمی حیدر آباد 1980 (9) میر تقی میر ایوارڈ، اردو اکیڈمی بھوپال 1982 (10) کمارن آسن ایوارڈ (ملیالم) 1983 (11) ہند روس دوستی میڈل 1984 (12) ڈی لٹ (اعزازی سند) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ 1986 (13) اقبال اعزاز، حکومت مدھیہ پردیش 1986 (14) فیض احمد فیض ایوارڈ عالمی، اردو کانفرنس، نئی دہلی 1987 (15) ظ انصاری ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکادمی 1995 (16) سنت دیانیشور ایوارڈ مہاراشٹر اسٹیٹ 1997 (17) مولانا مظہری ایوارڈ، مہاراشٹر اسٹیٹ 1997 (18) گیان پیٹھ ایوارڈ 1998، (19) عالمی امن ایوارڈ ہارورڈ یونیورسٹی 1999

ادبی و ثقافتی سرگرمیاں: صحافت: (1) مدیر 'نیا ادب' (2) رکن مجلس ادارت 'قومی جنگ' (3) مدیر 'گفتگو' (4) مدیر ہندستانی بک ٹرسٹ، بمبئی (5) مہمان مدیر 'کتاب نما'

فلم: ڈاکومینٹری فلمیں: (1) پھر بولو اے سنت کبیر (کہانی اور مکالمے) (2) ڈاکٹر محمد اقبال (کہانی اور مکالمے) (3) ہندستان ہمارا (کہانی اور مکالمے) (4) جدوجہد آزادی کے سو سال (انگریزی) (کہانی اور ڈائرکشن تین حصوں میں)

ٹی وی: (1) پروڈیوسر 'محفل یاراں' (پانچ سال) (2) ٹی وی سیریل 'کہکشاں'

رکنیت: (1) رکن سینیٹ، بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی، (دوبار) (2) وزیٹنگ پروفیسر جموں یونی ورسٹی، جموں، (3) جنرل سکریٹری آل انڈیا اقبال صدی کمیٹی (4) صدر انجمن ترقی پسند مصنّفین (اردو) (5) رکن نیشنل بک ٹرسٹ (6) اعزازی پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی (7) صدر فلم رائٹرز ایسوسی ایشن، بمبئی (8) ڈائرکٹر مہاراشٹر اردو اکیڈمی (9) گجرال کمیٹی برائے فروغ اردو کے صدر۔

ترتیب: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، بحوالہ کتاب نما، نومبر 1990 سے ماخوذ)

دائیں سے کیفی اعظمی، ارجن سنگھ، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، جعفری صاحب علی احمد فاطمی کی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے

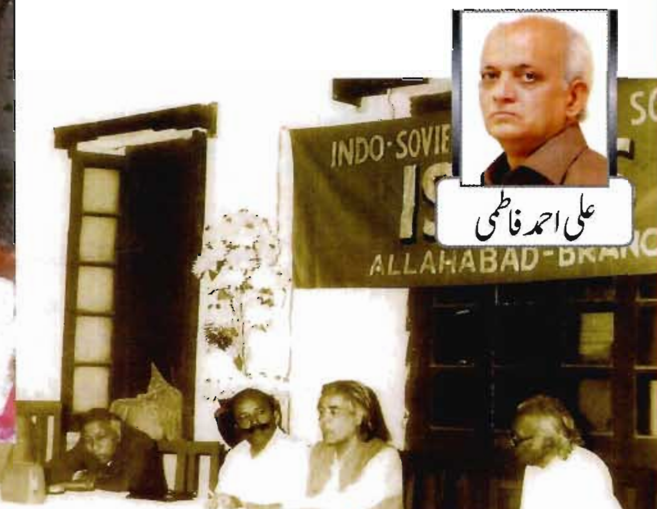

علی احمد فاطمی

دائیں سے بھیرون پرساد گپت، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی اور کامریڈ ضیاء الحق

علی سردار جعفری

ایک علمی، ایک طلسمی شخصیت

ترقی پسند فکر وفلسفہ تحریک کے ستون اور صف اول کے شاعر، ادیب، دانشور علی سردار جعفری پہلی اگست 2000 کو ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئے۔ عالمی سطح پر ان کے چلے جانے کا سوگ منایا جا رہا ہے۔ اس سوگ کے پیچھے ان کے بچھڑنے کا غم تو ہے ہی اس سے زیادہ ان کے ساٹھ پینسٹھ سالہ ادبی صحافتی، ثقافتی اور سیاسی خدمات کا یاد کیا جانا اور اعتراف کیا جانا زیادہ ہے۔

سردار جعفری کی شخصیت اور ادب ابتدا سے ہی جتنا مقبول ومشہور ہے اتنا ہی بحث طلب اور نزاعی ان کی ہر کتاب، ہر فکر، ہر قدم غرضیکہ ہر ادا پسند بھی کی جاتی رہی اور بحث ومباحثہ کے نئے نئے دروازے بھی کھولتی رہی اور ساتھ ہی ان کی ہر دل عزیزی اور محبوبیت میں اضافے بھی کرتی رہی۔

عام طور پر یہ خیال ہے کہ سردار جعفری کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے لیکن جدید خیال رکھنے والوں کا ایک حلقہ انھیں ایک سرے سے شاعر ہی نہیں مانتا۔ خود ترقی پسند حلقے میں بھی ان کی شاعری کو لے کر طرح طرح کے خیالات ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سردار کی شاعری انیس، اقبال، جوش وغیرہ کا ایسا ملا جلا آہنگ ہے کہ ان کا اپنا کوئی آہنگ نہیں بن پاتا۔ ترقی پسند فکر وخیال کے کچھ ناقدوں نے بھی سردار کو ایک اچھا اور اہم شاعر ماننے میں تامل برتا ہے لیکن پھر بھی سردار کا شمار چند گنے چنے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ایسا کیوں؟ ایک خواب اور پر تبصرہ کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے یہ لکھا:

''سردار جعفری کی شاعری جدید اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ... جعفری کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں اردو کی ترقی پسند خلاقی اپنی پوری آب وتاب اور اپنے تمام پیچ وخم کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے۔''

سجاد ظہیر نے یہ بھی اعتراف کیا کہ سردار جعفری کی شاعری کا ابتدائی سرا اقبال، جوش کی شاعری سے ملتا ہے جو اس زمانے کی دوسری تیسری دہائی تک نظریاتی اعتبار سے حاوی تھے لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جیسے جیسے بعد کے زمانے میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشتراکی تحریکات اور فکر کا بڑھاوا ہوا اور ہندوستان کی قومی آزادی بھی متاثر ہوئی تو پھر مزدوروں کسانوں اور انقلابی دانشوروں نے اس تحریک کو بائیں بازو کی طرف موڑ دیا۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں کام سردار جعفری اور ان کی شاعری نے کیا۔ پاکستان کے ممتاز ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی بھی لکھتے ہیں:

''علی سردار جعفری کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ گزشتہ پچاس سال کی ادبی تاریخ میں ترقی پسند خیالات کی حد تک کلیدی کردار ادا کیا ہے... اس حقیقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ علی سردار جعفری سماجی، سیاسی اور معاشی حقیقتوں کے ردعمل میں کسی نہ کسی انداز میں جمالیاتی پیکر تراشنے میں ماندانہ کردار کرتے رہے۔''

پروفیسر زاہدہ زیدی جو فیض کے بعد راشد اور اختر الایمان کو بڑا شاعر تسلیم کرتی ہیں لیکن جب سردار پر قلم اٹھاتی ہیں تو یہ لکھنے پر مجبور ہوتی ہیں:

''وہ ایک خلاق، مفکر اور اوریجنل شاعر تھے جن کی شاعری کے کینوس اور فکر کا دائرہ کافی وسیع تھا اور ان کی فکری جہات متنوع اور ارتقاپسند ہیں۔ پروٹسٹ کے جذبے اور انقلابی نظریے کے اظہار سے لے کر وسیع آفاقی وژن اور فلسفیانہ تفکر اور ماورائی احساس تک اس نے کئی مراحل طے کیے اور ہر منزل پر ان کی فکر والہانہ جذبوں سے سرشار رہی۔ شدت فکر واحساس، وژن کی وسعت اور اسلوب کی بلند آہنگی سردار جعفری کی شاعری کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں... سردار جعفری شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ دانشور بھی تھے اور لیڈر شپ کی صلاحیتیں بھی ان میں خداداد تھیں۔ ساتھ ہی وہ ایک فعال اور دلکش شخصیت کے مالک تھے اس لیے ان کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے ہم عصروں میں فیض کے علاوہ کسی کو نہ نصیب ہوئی۔''

زاہدہ زیدی نے وژن کی وسعت، فلسفیانہ تفکر، اسلوب کی بلند آہنگی وغیرہ کو ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت شمار کیا ہے۔ خود سردار جعفری کا جو سرمایۂ شعر و نقد ہے وہ ایک طرف اگر جدید ترین موضوعات سے

دائیں سے علی احمد فاطمی، راھی معصوم رضا اور علی سردار جعفری

وابستہ ہے تو دوسری طرف کبیر، میر، غالب، حافظ، رومی وغیرہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہ الفاظ دیگر اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرف شاعری کی صوفیانہ روایت بالخصوص انیس، اقبال اور جوش اور دوسری طرف آزادی کی تحریک، انقلاب، سماج واد، مزدور کسان اور اس زمانے میں تقریباً پوری ادبی فضا میں غالب مارکسی فکر اور لہر۔ سردار جعفری کے پورے فکر ونظر اور علم و ہنر اور خاص طور پر ان کی شاعری کو انھیں دوسروں کے درمیان رکھ کر دیکھا جائے تو سردار کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بہر حال آسانی ہو جائے گی اور اس سردار کا عرفان حاصل ہوگا جو انتہائی کچی عمر میں گھر کی شیعی تہذیب میں رہ کر، منبر پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھنے والا نوجوان اندھی عقیدتوں میں غرق ہونے کے بجائے حضرت امام حسینؑ کے غیر معمولی کردار سے ظلم کے خلاف بغاوت کا سبق سیکھ کر، جاگیردارانہ نظام کو ٹھوکر مار کر لکھنؤ آتا ہے اور یہاں آکر لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم ہوتے ہی انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھاتا ہے اور وہ ساری تکلیفیں برداشت کرتا ہے جو اس وقت کے دیوانے باغیوں کا مقدر بنی ہوئی تھیں۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد ان کا ذہن کھلبلا اٹھتا ہے۔ اشتراکیت اکلوتی مضبوط راہ دکھائی دیتی ہے۔ روس کا انقلاب اور بہت سے دوسرے انقلابی اقدامات، پابلو نرودا، ناظم حکمت، جواہر لعل نہرو، قاضی نذر الاسلام، وطن کی نامکمل آزادی، خواب در خواب، ایک نئی جنگ کی تیاری، دنیا کی تاریخ، تہذیب، تصوف، انسان دوستی غرضیکہ خیالوں کی دنیا میں کروٹیں ہی کروٹیں۔ نئے نئے چراغ جلتے چلے گئے۔ شاید پہلی بار ایسا ہوا کہ حافظ، سعدی، رومی، پابلو نرودا، ناظم حکمت، کبیر، نانک، میرا، میر، غالب، اقبال، سب کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ دنیا کے انسانوں کے درد کو ایک لے میں ڈھال دیا۔ اردو شاعری ایک نئے تیور اور آہنگ سے آشنا ہوئی، عالمی فکر اور انسان دوستی، دردمندی کے نئے نئے دبستان کھلنے لگے۔ ان سب میں سردار جعفری کی شاعری عالمی فکر اور اصل ہندوستانی تہذیب کو سموئے ایک نئے شاعرانہ آہنگ و فکری کردار سے مالا مال ہوتی رہی، ہر سطح پر انقلاب لانے میں سردار ہمیشہ پیش پیش رہے اور اسی لیے سب سے زیادہ سردار کی مخالفت بھی ہوئی۔ مخالفت کرنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ترقی پسند خیال کے ہی مخالف تھے۔ دوسری قسم ایسے لوگوں کی تھی جو دردمندی تو رکھتے تھے لیکن اردو شاعری کو دردِ دل اور دردِ جگر سے الگ کر کے دیکھنے کے عادی نہ تھے اور آگے بڑھ کر ان لوگوں نے بھی سردار کی مخالفت کی جو شاعری کو صرف باطنی کیفیات کا پیچیدہ اظہار مانتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو سردار کی انقلابی شاعری کیونکر پسند آسکتی تھی، اعتراض تو ہوئے ہی ان لوگوں نے بڑھ چڑھ کے کیے جنھوں نے بقول سردار جعفری ''میری شاعری کو سلیقے سے اور سنجیدگی سے پڑھا ہی نہیں تھا۔''

سچ بات یہ ہے کہ سردار کی بڑی شاعری وہیں جنم لیتی ہے جہاں وہ جوش خطابت اور انقلابی آہنگ میں ڈوب جاتے ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد جب پورے ہندوستان میں اتھل پتھل تھی۔ 48ء میں حیدر آباد میں پولس ایکشن ہوا اور 49ء میں بھارت کا دستور بنا انھیں دنوں تلنگانہ تحریک شروع ہوگئی۔ سیکڑوں جوان مارے گئے۔ عین انھیں دنوں سردار جعفری کا ایک بے حد اہم مجموعہ خون کی لکیر چھپ کر آیا جس کا نظم میں لکھا ہوا دیباچہ ہی دامنِ دل کھینچتا ہے:

زندگانی کی اندھیری رات میں\
درد اور دکھ کی بھری برسات میں\
لے کے اک ماہِ تمام آیا ہوں\
میکشو! آتش بجام آیا ہوں\
حسنِ معنی ہو رہا ہے بے نقاب\
اٹھ رہے ہیں استعاروں کے حجاب\
خون پیمانوں میں اب ڈھلتا نہیں\
اب امیروں کا فسوں چلتا نہیں\
زلزلہ ہے قصر استبداد میں\
حلقۂ زنجیر گلنے ہی کو ہے\
زندگی کروٹ بدلنے ہی کو ہے

یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک شباب پر تھی، زیادہ تر فنکار شاعر جیل میں تھے۔ ایسے ہی میں دو شاعر ایسے تھے جن کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مخدوم اور سردار، مخدوم نے لکھا لیکن سردار کا قلم تلوار بنا ہوا تھا۔ ذہن میں آگ تھی اور سینے میں لاوا کھول رہا تھا پورے ادبی ماحول میں نئی نسل کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں سردار کی شخصیت اور شاعری ایک باغی اور انقلابی کی تصویر جھانک رہی تھی اور سردار سب کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔ تلنگانہ کے بارے میں ان کی نظم ہر اک کی زبان پر تھی۔ آزادی مل ضرور چکی تھی لیکن کمیونسٹ پارٹی تحریک اس جھوٹی آزادی کے خلاف آواز اٹھا رہی تھی اور سردار کی نظمیں گونج رہی تھیں:

کون آزاد ہوا\
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی دور ہوئی\
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا\
خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لیے\
موت آزاد ہے لاشوں سے گزرنے کے لیے

یہ سچ ہے کہ اردو شاعری میں انقلاب کا لفظ بقول جعفری پہلی بار اقبال نے استعمال کیا۔ جوش کی انقلابی شاعری میں گھن گرج ہے اور خلوص وسچائی بھی لیکن کوئی صاف ستھرا نظریہ یا راستہ نہیں۔ ایجی ٹیشنل شاعری کا یہ باقاعدہ راستہ مخدوم، فیض اور سردار نے عام کیا۔ سردار ان سب میں دو قدم آگے تھے اسی لیے ان پر سب سے زیادہ اعتراض بھی ہوئے لیکن انھوں نے ہی سب سے زیادہ اس نوع کی شاعری کو فکر و جمال کا حصہ بنایا۔ اپنے ایک مضمون میں ایک جگہ انھوں نے صاف طور پر لکھا:

''ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی طور پر انسانی جذبات پر مبنی ہے جنھیں رس کہا جاتا ہے ان رسوں میں غصہ اور نفرت کو بھی جمالیات کے زمرے میں رکھا گیا

ہے۔ غصہ اور نفرت کو آپ اچھا کہیں یا برا یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں اور اس حیثیت سے شاعری میں ان کی جگہ ہے۔ میں شاعری میں اس کے اظہار کو جائز سمجھتا ہوں... نفرت کا یہ شعلہ مہابھارت، فردوسی کے شاہ نامے کے صفحات میں بلند ہوتا ہے۔''

خون کی لکیر، پتھر کی دیوار، پیراہن شرر وغیرہ کی نظمیں اردو میں عمدہ معیاری ایجی ٹیشنل شاعری کا حصہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان نظموں میں ظلم کے خلاف آوازیں امیری اور سرمایہ داری کے خلاف تیز دھارا ملے گی جو دھیرے دھیرے ان کی شاعری کی دھارا اور لے بن گئی جس کا الزام سردار پر یہ لگا کہ وہ محبت کی شاعری کر ہی نہیں سکتے اس لیے کہ عشق و محبت کی شاعری لطیف نازک فنکارانہ اظہار چاہتی ہے جو سردار کے بس میں نہیں۔ الزام لگانے والوں نے سردار کی عشقیہ شاعری بھی نہیں پڑھی اور اس باغیانہ شاعری کے بھی رخ کو نہ دیکھا نہ سمجھا کہ یہ غم و غصہ، نفرت اور انقلاب سردار کے ذاتی نہیں ہیں بلکہ اس کی بنیاد انسان اور زندگی سے شدید محبت پر ہی رکھی ہوئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ سبک انفرادی وخود غرضانہ محبت سے دور، عوامی و اجتماعی محبت پر یقین رکھتے ہیں اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جس کا وژن بڑا ہوگا اور عمل میں فلسفیانہ تفکر ہوگا اردو کی غزلیہ شاعری کی سبک روی سے نکل کر یہ انداز اختیار کرنے پر مجبور کردے گا:

مری نگہ میں بسے ہوئے ہیں
ہزار اندازِ دلربائی
میں اپنے سینے کو چاک کرکے
اگر تمھیں اپنا دل دکھاؤں
تو تم کو ہر زخم کے چمن میں
ہزار سر و رواں ملیں گے
اداس مغموم وادیوں میں
ہزارہا نغمہ خواں ملیں گے
میرے عزیزو، میرے رفیقو!
یہ عہد حاضر کی آبرو ہے
حسیں بنانے کی آرزو ہے

اردو شاعری کا روایتی و رومانی مزاج سردار کی شاعری کی اس کاٹ کی آسانی سے برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ڈھکے چھپے کہیں وہ اس نظام کے ساتھ تھا جو اس الٹ پلٹ کے لیے تیار نہ تھا۔ ہماری روایتی تنقید کا بھی ایک حصہ اسی سوچ کا شکار تھا لیکن حق پسند اور بے باک جعفری کو اس بات کی قطعی پروانہ تھی کہ کل کا ادب ان کے فن، ان کی شاعری اور ان کی جمالیات کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔ وہ آج کی حقیقت اور انسانی جمالیات پر یقین رکھتے تھے تبھی تو کہتے ہیں:

''مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے۔ کوئی اور اسے مانے یا نہ مانے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے وہ بے سرے ہوجائیں گے۔ آنے والے زمانے کا جو بھی راگ ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی ہم تو آج کا راگ چھیڑ سکتے ہیں۔'' اسی بات کو سارتر نے دوسرے ڈھنگ سے یوں کہا کہ موجود لمحہ اپنے تاریخی مقصد کی ترجمانی ہی ادبی تجربے کا تقاضا ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ آنے والے زمانوں اور نسلوں کا فیصلہ کریں، ہر دور، ہر نسل اپنا اقتدار خود بناتی ہے۔ سردار نے زندگی، زمانہ، تاریخ و تہذیب پر کھل کر بحثیں کی ہیں اور انقلابی شاعری، خطیبانہ شاعری و افادیت پر عالمانہ باتیں کی ہیں کچھ اسی کے باطن سے انسان دوستی، روشن خیالی اور بڑی شاعری کی اعلیٰ قدریں پھوٹنے لگتی ہیں۔ علمیت سے بھری ایک خاص قسم کی بڑی شاعری کے یہی حصے اور یہی مزاج ہوا کرتا ہے۔ کم سے کم ترقی پسند شاعری اور احتجاجی شاعری کے بنیادی پہلو اور سردار کی بنیادی پہچان تو یہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا انقلابی شاعری یا خطیبانہ شاعری بڑی نہیں ہوتی تو پھر بڑی شاعری کے پیمانے کیا ہوتے ہیں۔ کیا دھیمے لہجے کی رومانی، مبہم شاعری ہی بڑی شاعری ہوتی ہے اگر یہی سچ ہے تو دنیا کی وہ تمام بڑی شاعری جو خطابت سے وابستہ ہے خواہ وہ مولانا روم کی مثنوی ہو یا شیکسپیئر کے ڈرامے یا اقبال کی نظم نگاری۔ اسے کس خانے میں رکھیں گے۔ زندگی کی طرح شاعری کے معاملات بھی بڑے عجیب وغریب ہوا کرتے ہیں۔ کینوس پر ایک اچھی تصویر صرف دھیمے اور ٹھنڈے رنگوں کی مانگ نہیں کرتی اسے اکثر شوخ اور روشن رنگوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے جہاں جیسی ضرورت ہو سجاد ظہیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ میکسیکو کے عوام کی انقلابی جدوجہد کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ وہاں کے فنکاروں نے عمارتوں کی دیواروں پر بڑی بڑی عوام کے انقلابی مزاج سے شرابور بے حد زوردار جوشیلی تصویریں بنانے کا فن پیدا کیا تھا اور آج اسے دنیا میں شہرت حاصل ہے۔ تقریباً اسی طرح ہندوستان کے فنکاروں نے ایودھیا کے حادثے کے بعد کیا۔

سردار جعفری نے جس غلامی کے دور میں آنکھیں کھولیں۔ انقلاب کو بے حد قریب سے دیکھا۔ آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ ساتھ زنجیروں اور قیدخانوں کو معشوق کی طرح گلے لگایا۔ وہ جس طرح کا رومانی باغیانہ مزاج رکھتے تھے، ایسے میں ان سے اسی طرح کی شاعری کی امید کی جاسکتی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ سردار کے یہاں دھیمے لہجے کی شاعری، عشقیہ شاعری نہیں ہے۔ انھوں نے غزلیں کہیں۔ خواب دیکھے۔ رومانی حسرت میں ڈوبے۔ طرح طرح کے تجربے بھی کیے لیکن انسان اور زندگی سے اوپر اٹھ کر انھوں نے کبھی نہیں سوچا۔ تخیل و تصور کی دنیا میں وہ کم کم ہی رہے انھوں نے زندگی کے کھردرے حقائق، تپش اور تشنہ لبی کو بھی ایک نام دیا اور وقار دیا تبھی تو وہ کہتے ہیں:

ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں
ہماری تشنہ لبی مے کدے بناتی ہے

ان کا اصل میدان نظم کی شاعری ہے۔ زندگی کی شاعری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خواب ٹوٹنا انسان کا مقدر ہے لیکن خواب دیکھنا اس کی فطرت۔ اسی لیے وہ تراشیدم، پرستیدم، شکستم کے قائل تھے۔ ان کی شاعری کی ان اعلیٰ قدروں کو سمجھنا ہوگا جہاں ایسا ممکن نہیں وہاں سردار کو سمجھ پانا بھی ممکن نہیں۔ سردار صرف شاعر نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ قسم کے دانشور اور اسکالر تھے اور اپنی شاعری اور اس سے زیادہ دانشوری کے زور پر پوری ترقی پسند تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔ کئی نسلوں کو پروان چڑھایا، وہ ایک ہیرو کی طرح کئی دہائیوں تک چھائے رہے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک لجنڈ اور ایک تاریخ بن گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب یونہی تو نہیں تھا اس کے پس پردہ کئی دہائیوں کا تیاگ اور تپسیا، محنت ولگن، ایثار وقربانی اور ہمہ دانی، ان کا منطقی انداز خطابت کا سوز و گداز الفاظ کے ابلتے ہوئے چشمے کہ بڑے بڑے تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔ بڑے بڑوں کے چراغ گل ہوجاتے تھے۔

سردار اپنی زندگی، اپنی فکر کے ہر موڑ پر باعمل، باخبر اور بااثر رہے اور اپنے شعور و ہنر اور ادب دوستی و انسان دوستی کے ذریعے نئی نئی شمعیں روشن کرتے رہے۔ کبھی تحقیق، کبھی تنقید، کبھی تحریر، کبھی تقریر، کبھی اکیلے کبھی بھیڑ کے ساتھ، کبھی ڈھال بنے، کبھی تلوار، کبھی محبت، کبھی تکرار، غرضیکہ ہر دور میں وہ اپنی تخلیق، اپنی تنقید کے ذریعے اپنے گروپ میں اپنے دور میں بنیادی اور لیڈنگ رول ادا کرتے رہے۔ ایسے سردار جعفری کو جس نے ادب کی سب سے بڑی تحریک کو اپنے خون جگر سے سینچا ہو۔ جس نے شاعری کے کم از کم دس مجموعے دیے ہوں جس نے چند غیر معمولی نثری کتابیں لکھی ہوں۔ جس کی تقریروں نے ہنگامے برپا کررکھے ہوں، جس نے میڈیا، فلم، صحافت، ثقافت، سیاست پر اپنی مہریں ثبت کررکھی

ہوں۔ جس نے جمالیات، نفسیات، تصوف، بھگتی، مارکسواد، سماجواد، گاندھی واد وغیرہ پر دسترس حاصل کررکھی ہو۔ جس نے حافظ، ذوق، کبیر، نانک، میرا، میر، انیس، اقبال، جوش وغیرہ کو ایک صف میں کھڑا کردیا ہو اس سردار جعفری کو سمجھ پانا اور سمجھا پانا ایک ناممکن کام نہ سہی لیکن مشکل کام ضرور ہے۔ ایسا اس لیے کہ یہ سب چیزیں ان کی شاعرانہ و دانشورانہ شخصیت میں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ ان کو الگ کرکے دیکھنا ممکن نہیں۔

اس سے کون انکار کرے گا کہ خیال کی سطح پر جتنے مورچے سردار نے لیے کوئی اور ہمت نہ کرسکا۔ اقبال کے بعد سردار ہی ہیں جنھوں نے شاعری کو دانشوری اور دانشوری کو شاعری بنا دیا۔ دونوں کو باہم شیر وشکر کرکے ایک نئے طرز شاعری کی بنیاد ڈالی اور اسے عالمی شاعری کے مقابلے لاکھڑا کیا۔ احتجاجی شاعری یا ایجی ٹیشنل شاعری کی نئی توضیحات پیش کرکے اسے ایک نئے قسم کی شعریت، آہنگ اور وقار عطا کیا۔

صوفی ازم اور مارکسزم دونوں کو بے حد قریب کیا اور شاعری کو ایرانی جمالیات سے نکالنے کا جو کام جوش نے شروع کیا تھا اسے سردار نے انتہائے کمال تک پہنچایا اور ہندوستانی اور انسانی جمالیات کے نئے ابعاد بنائے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور اس کی دیرینہ روایات کا نہ صرف دعویٰ کیا بلکہ کبیر، نانک، میرا وغیرہ پر کام کرکے اردو والوں کو اصل ہندوستانی جمالیات سے اور اسی طرح میر۔ غالب وغیرہ کو ہندی میں پیش کرکے غیر اردو والوں کو اردو شاعری کے اصل صوفیانہ مزاج سے آشنا کیا۔

علم وعمل کے درمیان کے فاصلے کو کم کیا اور اپنی زندگی کی سرگرمیوں، حرکت وعمل سے یہ ثابت کیا کہ ادیب وشاعر اگر باعمل (Activist) نہ ہو تو اس کی حیثیت بقول مارکس ایک بانجھ عورت سے زیادہ نہیں۔

گفتگو، بحث، اختلاف، تنازعہ، چیلنج وغیرہ زندگی کی کھردری حقیقتوں کو کہ جس سے بڑے بڑے ادیب و شاعر گھبراتے ہیں سردار نے ایک حرف شیریں اور دلنواز تبسم سے زیر کیا اور اسے آسان سے آسان تر بنا کر ادب میں اختلاف کو احترام بخشا اور ادبی تبادلہ خیال کو عام کیا۔

اپنی بات کہنے سے زیادہ انھوں نے دوسروں کی بات سننے کا مزاج عام کیا اور کہا کہ سماجی جمہوریت سے زیادہ بڑی ہوتی ہے ادبی جمہوریت۔ غرضیکہ بقول یوسف ناظم ان کی زنبیل میں ہر قسم کے نسخے تھے اور ہر نسخے پر ھوالشافی لکھا ہوا تھا۔

اتنے غیر معمولی اوصاف ومحاسن نے جہاں سردار کو بے پناہ شہرت وعزت بخشی فطری طور پر اتنی ہی ان کی مخالفت بھی ہوئی۔ اتنی نزاعی شخصیت اور اتنی مقبولیت و شہرت، یہ باتیں حیرت میں ڈالتی تھیں اور ان کی شخصیت معمہ نظر آنے لگتی تھی۔ پھر ان کی مقبولیت کو محبوبیت میں بدلتے دیکھا ایسے ایسے مناظر آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں کہ جن پر رشک آنے لگتا۔ اکثر خیال آتا کہ اسی برس کا یہ نوجوان بڑے سے بڑے فلمی ہیرو سے زیادہ مقبول و محبوب ہے۔ ہندوستان کی تمام زبان وادب میں ان کی شہرت وعزت تھی۔ امریکہ ہارورڈ یونیورسٹی نے انھیں دنیا کا بڑا اسکالر تسلیم کیا جس سے اردو زبان کی شہرت وعزت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

ان کی شاعری سے اختلاف کل بھی تھا اور آج بھی ہوگا لیکن ان کی بڑی ادبی و دانشورانہ شخصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ علم کا اپنا جادو ہوا کرتا ہے وہ جادو تو ان کے پاس تھا ہی، ساتھ ہی ان کی شخصیت کا رچاؤ، ان کے لمبے گھنیرے سرمئی بالوں کا غبار۔ تمام دنیا کے حسن کو جذب کرلینے والی آنکھیں، ان کی مخروطی انگلیاں، ان کی ہوش رُبا مسکراہٹ، ان کی گفتگو کا سلجھا ہوا منطقی انداز سب کے سب ان کے علم و دانش کی گواہی دیتے اور اس کے اظہار کا پرکشش حصہ بن جاتے۔ ان سب غیر معمولی خوبیوں نے ان کے اظہار و ایثار نے سردار کی شخصیت کو

ایک تاریخ ساز اور نظریہ ساز بنا دیا تھا جن سے اختلاف کیا جانا فطری تھا لیکن سردار کی طلسمی من موہنی شخصیت کے جو بھی قریب آتا غیر معمولی تاثر لیے بغیر نہ رہتا۔ سردار کی فنکارانہ اداؤں کے قیدی تو نہ جانے کتنے سلطان اور سلطانائیں تھیں لیکن ان کی علمی اور طلسمی شخصیت کا قیدی تو پورا زمانہ تھا۔ اسی لیے کہا جارہا ہے کہ سردار کیا رخصت ہوئے ایک دور رخصت ہوگیا۔ ایک تاریخ رخصت ہوگئی۔

آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ان کی رحلت کا سوگ منایا جانا صرف ایک شخص وشاعر کا سوگ نہیں ہے بلکہ 86 سالہ تاریخ وتہذیب، ادب وشاعری، تنقید و فلسفہ، سیکولرزم، سوشلزم وغیرہ کا سوگ منایا جانا ہے۔ سردار جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ اس طرح کہ وہ صدی کی پہچان اور صدی ان کی پہچان کا حوالہ بن جاتی ہے وہ پوری صدی پر چھائے رہے۔ سرگرم رہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک فکرمند، سرگرم، متبسم، متکلم، بے پناہ کام، بے پناہ مصروف، بے پناہ سفر، لیکن وہ خوش رہتے اور مسکراتے رہتے، زبردست اختلافات ہوتے لیکن وہ مسکراتے رہتے۔ اپنے ہی دوستوں سے گلے شکوے لعن طعن ہوتی وہ مسکراتے رہتے۔ اکثر گھریلو قسم کی مشکلات کا شکار ہوتے وہ مسکراتے رہتے کہ مسکراہٹ ان کی دلنواز شخصیت کا حصہ بن گئی۔ افسوس صد افسوس کہ یہ مسکراہٹ ہمیشہ ہمیش کے لیے رخصت ہوگئی اور اس کے ساتھ اسی سال کی تاریخ بھی رخصت ہوگئی... لیکن جو کام کرتے ہیں وہ خود تاریخ بن جاتے ہیں... دوسری شکلوں میں، دوسری نسلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ سردار نے خود کہا تھا:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے ذہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زبان سے گاؤں گا
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

دائیں سے پروفیسر سید محمد عقیل، علی محمد علی کاظمی، علی سردار جعفری اور علی احمد فاطمی

■

Ali Ahmad Fatmi,Dept of Urdu, Allahabad University, Allahabad - (UP)

علی سردار جعفری
شخصیت اور فن

کرشن بھاوک

سردار جعفری کی پیدائش کے سو سال اسی نومبر ماہ میں مکمل ہو رہے ہیں، ان کا مولد بلرام پور (ضلع گونڈہ ریاست اودھ) تھا۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، ناقد، محقق، نثر نگار، ڈراما و افسانہ نویس، صحافی، خطیب، فلم ساز، ہدایت کار تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ آزادیِ ہند کے سپاہی، مزدوروں کے حقوق کے زبردست موید، کارل مارکس کے فلسفۂ حیات کے مرید ہو کر بھی اس کی خامیوں کے مخالف، پنڈت جواہر لال نہرو کے سوشلزم کے پیروکار اور انسانیت کے حامی اور ملک و قوم کی آزادی اور بہبود کے علم بردار کے طور پر ایک باعثِ فخر شخصیت مانے جاتے رہے ہیں۔ یہاں پر ان کی حریت پسندی، وطن پرستی اور فن شناسی کے پہلوؤں کی نشان دہی مقصود ہے۔

ایک مشافہ (انٹرویو) میں بذاتِ خود سردار جعفری نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے اس مقولے کا حوالہ دیا تھا ''کسی قوم کا تہذیبی معیار دراصل اس قوم کے فلسفی، شاعر اور ادیب قائم کرتے ہیں، سیاست داں نہیں۔''(1)

سردار جعفری اپنے وطن اودھ کے اسی تہذیبی معیار کے معمار شاعر مانے جاتے رہے ہیں۔ ان کی ایک نظم 'اودھ کی خاکِ حسیں' نام سے مشہور و مقبولِ عام رہی ہے۔ اس کی چند سطریں ملاحظہ کریں:

میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں

انھوں نے اپنے شعری مجموعے 'پیراہنِ شرر' میں یہ آخری شعر دیا تھا:

کم ظرفیِ گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگیِ دیدہ تر ہے

ان کے زمانے میں سردار علی نام تو خاصا عام تھا۔ لیکن ان کے علی سردار نام کی بنیاد حافظ شیرازی کا ایک قصیدہ تھا، جو کہ ان کے والد کے کتب خانے میں ایک نسخے میں شامل تھا۔ وہ قصیدہ ان کے ہی ہمعصر مولانا قاضی سجاد حسین نے نئی دہلی سے شائع اپنے ترجمہ شدہ نسخے میں بھی شامل کیا تھا۔ علی سردار کے نام والا شعر یہ تھا:

علی امام و علی ایمن و علی ایماں
علی امین و علی سرور و علی سردار

ان کے ہم قافیہ نام والے انھیں کے ایک چچازاد بھائی موسومہ علی جزا ان سے چند سال ہی بڑے تھے۔ اس طرح ان کا یہ نام ان کے والد کے نام سید جعفر طیار کی ہی مانند قدرے غیر معمولی قرار دیا جاسکتا ہے۔

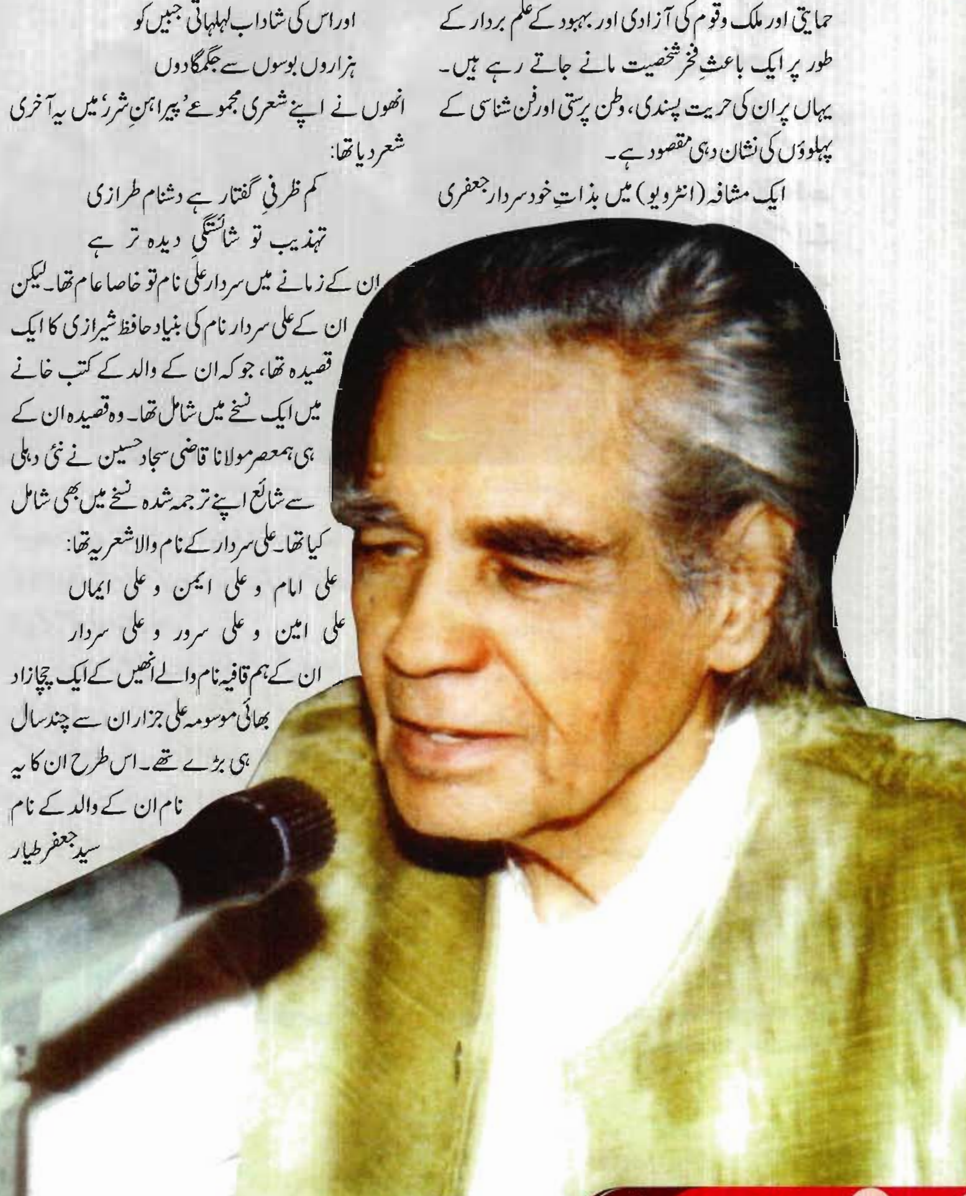

سردار جعفری نومبر میں اس دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے اس ماہ کی بابت نظم بھی لکھی جو اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی واحد نظم قرار دی جاسکتی ہے۔ زیرِ عنوان آزاد نظم 'نومبر میرا گہوارہ' کے تحت لکھتے ہیں:

نومبر میرا گہوارہ ہے، یہ میرا مہینہ ہے
اسی ماہ منور میں
مری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی
مرے کانوں میں پہلی بار انسانی صدا آئی
مرے تارِ نفس میں جنبشِ بادِ صبا آئی...

آخری سطور ہیں:

مری ماں اپنے آنچل میں چھپالیتی تھی ننھے سے کھلونے کو
مری حیرت کی آنکھیں
اس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں
جس آئینے میں پہلی بار میں نے
اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا

سردار کو بچپن سے ہی مرثیوں میں بلا کی رغبت رہی تھی۔ بسا اوقات ان کے مرثیے سن کر چند نکتہ چیں لوگوں نے ان پر انیس کے مرثیوں میں چند الفاظ کے رد و بدل کر کے پیش کرنے کا الزام تک عائد کر دیا کرتے تھے، تاہم زیادہ تر عوام شاعری کی اس صنف میں ان کی مہارت کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ ایک بار لکھنؤ سے وارد ایک عالم و فاضل شخص نے مجلس کے ختم ہونے پر جب ان سے ان کا اسم گرامی دریافت کیا، تب وہ برجستہ اٹھ کر منبر پر جا کر بیٹھتے ہوئے ایک رباعی کے یہ اشعار کہے:

نورِ نظرِ احمد مختار ہوں میں
لختِ جگرِ حیدر کرار ہوں میں
ہے فتح و ظفر قوتِ بازوئے سردار
یعنی پسر جعفر طیار ہوں میں (2)

ان میں احمد مختار چھوٹے چچا کا نام تھا، حیدر کرار منجھلے چچا کا نام، ظفر عباس ان کے بھائی جان کا نام اور جعفر طیار ان کے والد ماجد کا نام تھا۔ فی البدیہہ اشعار کہنے میں انھیں غضب کی مہارت تھی۔

ان کی ہمشیرہ ستارہ کے مطابق ''یہ سن کر 'واہ واہ' کا

ایسا شور بلند ہوا کہ پورا ہال گونج اٹھا۔'' (3) ستارہ نے رباعی میں 'سردار' کی جگہ 'میرے' لفظ لکھا ہے۔

سردار جعفری کمیونسٹ ہوکر بھی سوشلزم اور ترقی پسند تحریک سے باقاعدہ منسلک رہے تھے۔ وہ ایک انسانیت پسند وقوم پرست شاعر تھے۔ وہ حریت پرستی وحب الوطنی کے جذبات سے ہر دم شرابور رہا کرتے تھے اور فن برائے فن کی بجائے فن برائے زندگی کے ادبی اصول کے زبردست پیروکار و مویدتھے۔ سردار جعفری کی نظم 'رومان سے انقلاب تک' کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

ساتھیو! اب میری انگلیاں تھک چکی ہیں
اور میرے ہونٹ دکھنے لگے ہیں
آج میں اپنے بے جان گیتوں سے شرمسار ہوں
میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دے دو
تاکہ میں اپنے نغموں میں فولاد اور بارود کا زور بھرلوں (4)

ان کے مجموعے 'پیراہن شرر' کے یہ اشعار دیکھیے:

''کھڑا ہے کون یہ پیراہنِ شرر پہنے
بدن ہے چور تو ماتھے سے خون جاری ہے
کوئی دوانہ ہے لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک (5)

ان کی شاعری کا موازنہ ساحر کی شاعری سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ایک گیت (جسے آگے چل کر فلم 'پھر صبح ہوگی' میں لیا گیا تھا) میں پیشن گوئی کرتے ہوئے کہا تھا:

ان کالی صدیوں کے سر سے
جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب عنبر جھوم کے ناچے گا
جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی (6)

سردار کے والد ماجد نے ان کے نظر بند ہوجانے پر اپنے روزنامچے میں یہ حوصلہ افزا شعر لکھا تھا:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اگرچہ سردار کی شاعری پر نعرہ بازی کی تہمت لگائی جاتی رہی ہے، تاہم انھوں نے اس کی تردید کرنے کی بجائے عوام کو جوش دلانے والی شاعری کے حق میں اپنا نظریہ واضح کرتے ہوئے مجموعہ 'پتھر کی دیوار' میں کہا تھا کہ ''چونکہ میں شاعری کو بنیادی طور پر گانے یا بلند آواز سے پڑھ کر سنانے کی چیز سمجھتا ہوں اور اس سے شعور کو بیدار کرنے اور جذبات کو ابھارنے کا کام لینا چاہتا ہوں، اس لیے میں نے اپنی آزاد نظموں میں بھی یہ کوشش کی ہے کہ وہ محض کاغذ پر پڑھنے کی چیز بن کر نہ رہ جائیں۔''

سردار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عوامی زبان میں شاعری کی اور فکر وفن کے امتزاج کے ساتھ شعری جمالیات کا بھرپور خیال رکھا۔ میر تقی میر کا مشہور شعر ہے:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

بڑے شاعروں میں گنے جانے کے باوجود تکبر وغرور سے سردار کوسوں دور تھے، جب انھیں سنہ 1997 میں اپنے مجموعہ پر بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈ ملا، تب بھی انھوں نے عوام کی مبارکباد قبول کرتے ہوئے بڑی انکساری سے اپنے خطاب میں یہ شعر سنایا تھا:

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے (7)

جب فیض نے اپنی نظم 'تاریک اجالا' یہ شب گزیدہ سحر' لکھی اور ان کے دوست اسرار الحق مجاز نے اسی انداز میں اپنی ایک نظم تشکیل دی۔ تب سردار جعفری نے ان کے نہفتہ اور پوشیدہ اسلوب سے نااتفاقی ظاہر کرتے ہوئے نظم ونثر میں انھیں ایسا نہ کرنے کی تاکید کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ شعرا کو آزادی ملنے کے بعد مایوس کن حالات کی حقیقی عکاسی کرتے رہنا چاہیے، ورنہ موہوم آزادی کو کبھی بھی حقیقی آزادی میں منتقل نہیں کیا جاسکے گا۔ ان کے استعاراتی طریقۂ کار کے عین برعکس ان کے شعر کچھ اس نوعیت کے منظرِ عام پر مقبولِ عام ہو رہے تھے۔'' ان کی بہن ستارہ جعفری نے اپنے مضمون میں سردار بھائی کی بابت درج کیا ہے کہ '' آئندہ سال جب بمبئی سے آئے، تو اپنے ساتھ اپنی کتاب 'نئی دنیا کو سلام' لائے۔ دوپہر کو پوری کتاب ہم سب کو پڑھ کر سنائی۔ اس میں ایک مصرعہ تھا۔ ''ستاروں سے آنچل سجائیں گے ہم'' میں نے پوچھا ''کیا واقعی ایسا ہوگا؟'' انھوں نے بڑے یقین سے کہا ''ہاں آزادی مل جانے دو، پھر تم دیکھنا''، لیکن میں سوچتی ہوں آزادی کے جو سنہرے خواب ہم نے دیکھے تھے وہ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔'' (8)

سردار کی شاعری کی مخالفت اور کی مانند ان کے دوست معین احسن جذبی تک نے کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ''میں اسے شاعر مانتا ہی نہیں۔ وہ ایک اچھا نثر نگار تو ہوسکتا ہے، لیکن ایک اچھا شاعر نہیں۔ نہ تو وہ فطری شاعر ہے، اور نہ ہی اس کے یہاں کوئی شعریت ہے۔ میں نے اپنے کئی انٹرویوز میں یہ بات کہی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو گھسیٹ گھسیٹ کر کسی طرح نظم کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ میں اسے شاعر نہیں مانتا۔'' (9) بہ حوالہ شین کاف نظام نے اپنے

اردو

ہماری پیاری زبان اردو
ہمارے نغموں کی جان اردو
حسین ودلکش جوان اردو
زبان وہ دھل کے جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر ونغمہ کے خلدزاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے
اسی زباں میں ہمارے بچوں نے ماؤں سے لوریاں سنی ہیں
جوان ہوکر اسی زباں میں کہانیاں عشق نے کہی ہیں
اسی زباں کے چمکتے ہیروں سے علم کی جھولیاں بھری ہیں
اسی زباں سے وطن کے ہونٹوں نے نعرہ انقلاب پایا
اسی سے انگریز حکمرانوں نے خودسری کا جواب پایا
یہ اپنے نغمات پُر اثر سے دلوں کو بیدار کر چکی ہے
یہ اپنے نعروں کی فوج سے دشمنوں پہ یلغار کر چکی ہے
ستمگروں کی ستمگری پر ہزار ہا وار کر چکی ہے
کوئی بتاؤ وہ کون سا موڑ ہے، جہاں ہم جھجک گئے ہیں
وہ کون سی رزم گاہ ہے، جس میں اہلِ اردو بہک گئے ہیں
وہ ہم نہیں ہیں، جو بڑھ کے میداں میں آئے ہیں اور ٹھٹک گئے ہیں
یہ وہ زباں ہے کہ جس نے زنداں کی تیرگی کے دیے جلائے
یہ وہ زباں ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سائے
فرازِ دار ورسن سے بھی ہم نے سرفروشی کے گیت گائے
کہا ہے کس نے کہ ہم اپنے پیارے وطن میں بھی بے وطن رہیں گے
زبان چھن جائے گی ہمارے دہن سے، ہم بے سخن رہیں گے
ہم آج بھی کل کی طرح دل کے ستار پر نغمہ زن رہیں گے
یہ کیسی بادِ بہار ہے، جس میں شاخِ اردو نہ پھل سکے گی
وہ کیسا روئے نگار ہوگا، نہ زلف جس پر مچل سکے گی
ہمیں وہ آزادی چاہیے، جس میں دل کی مینا اُبل سکے گی
ہمیں یہ حق ہے کہ ہم اپنی خاکِ وطن میں اپنا چمن سجائیں
ہماری ہے شاخِ گل تو پھر کیوں نہ اس پر ہم آشیاں بنائیں
ہم اپنے انداز اور اپنی زباں میں اپنے نہ گیت گائیں
کہاں ہو متوالو، آؤ بزمِ وطن میں ہے امتحاں ہمارا
زباں کی زندگی سے وابستہ آج سود وزیاں ہمارا
ہماری اردو رہے گی باقی، اگر ہے ہندوستاں ہمارا
چلے ہیں گنگ وجمن کی وادی میں ہم ہوائے بہار بن کر
ہمالیہ سے اتر رہے ہیں ترانۂ آبشار بن کر
رواں ہیں ہندوستاں کی رگ رگ میں خون کی سرخ دھار بن کر

مضمون کے آغاز میں دیا ہے۔ اصل میں یہ ردعمل بطور ایک شاعر اس کے ذاتی حسد کا ہی ضامن کہا جاسکتا ہے۔

ساجد رشید نے سردار سے متعلق اپنے مضمون 'رومانی انقلاب کا آخری سالار' میں سردار کے فلسفۂ حیات و شاعری کا عمیق و دقیق تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''وہ ایک باغی شاعر کی حیثیت سے جہانِ ادب پر اس طرح چھائے کہ جوش، فیض اور فراق کے ناموں کے ساتھ ان کا نام بھی ناگزیر ہوگیا تھا، لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے آخری برسوں میں ایک ایسے لشکر کے سالار بن کر رہ گئے تھے، جس میں تھکے ہوئے بزرگ سپاہی اپنی زندگی کی شام کر رہے تھے۔ تقریباً 65 سال قبل سید سجاد ظہیر نے جب ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی، تو باغی شاعروں اور ادیبوں کے اس لشکر کے ہراول دستے کے سالاروں میں جعفری صاحب کا نام سرِفہرست تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے روشن خیال اور سائنسی نقطۂ نظر رکھنے والوں کی یہ انسانیت پسند تحریک اردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر چار بڑی زبانوں میں بھی پھیل گئی۔''(10)

خلیق انجم نے مجلّہ فروغ اردو ادب، دوحہ، دبئی سنہ 1998 میں لکھا تھا کہ ''چنانچہ برصغیر کے مخصوص حالات میں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب اشتراکی نظام بکھرا نہیں تھا، جعفری نے 'صبحِ فردا' کا خواب دیکھا تھا۔ یہ صبحِ فردا، عالمی سطح کا 'سرخ سویرا' نہیں تھا، بلکہ وہ یہ خواب تھا، جو انھوں نے اور پاکستان کی سرحد پر کھڑے ہوکر دیکھا تھا:

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

اس مضمون کے آخر میں ان کا یہ اعلان قابلِ تائید ہی مانا جائے گا کہ ''اگر اردو میں کبھی ایماندار نقاد پیدا ہوئے تو وہ یہ فیصلہ کریں گے کہ سردار کس مرتبے کے شاعر ہیں۔ میں تو بس اتنا ہی کہوں گا کہ علی سردار جعفری ایک Genuine شاعر ہیں۔''(11)

1 اگست 2000 کو اِس دارِفانی کو الوداع کہہ دینے والے علی سردار جعفری اپنے زمانے اور مابعد اوقات میں بھی جاودانی اقدار کے کاملاً حامل رہے ہیں۔ یہ خود اعتمادی ہی ہے، جس کے موجب وہ غالب کے ہی 'انداز اور' میں ایسے اشعار درج کرتے رہے ہیں:

کوئی سردار کب تھا اس سے پہلے تیری محفل میں
بہت اہلِ سخن اٹھے، بہت اہلِ کلام آئے

جریدہ 'عالمی اردو ادب' کے مدیر نند کشور وکرم نے 'پیش لفظ' کے آخر میں لکھا تھا کہ ''سردار جعفری ایک عظیم المرتبت شاعر تھے۔ ان کی شاعری ترقی پسند نظریات، انسان دوستی، کلاسیکی اقدار، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور عالمی بھائی چارے کا ایک ایسا امتزاج ہے، جس نے انھیں اس دور کا ایک ایسا آفاقی شاعر بنا دیا ہے، جسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرے گا۔''(12)

سردار جعفری نے اپنے مجموعے 'پتھر کی دیوار' کے دیباچے میں پابند اور آزاد نظم دونوں کے ہی اختصاص کی نشان دہی کی تھی۔ وہ آزاد نظم میں فکر کے ایک داخلی ترنم کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔

اگرچہ سردار کی شاعری پر نعرہ بازی کی تہمت لگائی جاتی رہی ہے، تاہم انہوں نے اس کی تردید کرنے کی بجائے عوام کو جوش دلانے والی شاعری کے حق میں اپنا نظریہ واضح کرتے ہوئے مجموعہ 'پتھر کی دیوار' میں کہا تھا کہ ''چونکہ میں شاعری کو بنیادی طور پر گانے یا بلند آواز سے پڑھ کر سنانے کی چیز سمجھتا ہوں اور اس سے شعور کو بیدار کرنے اور جذبات کو ابھارنے کا کام لینا چاہتا ہوں، اس لیے میں نے اپنی آزاد نظموں میں بھی یہ کوشش کی ہے کہ وہ محض کاغذ پر پڑھنے کی چیز بن کر نہ رہ جائیں۔''

باقر مہدی نے اپنے اس شعر میں تقریباً جس خیال کا اظہار کیا تھا، اسے آزاد یا معرا نظم پر بھی صادق کیا جاسکتا ہے:

بحروں کو توڑ تاڑ کے نالے میں ڈال دو
بس دل کی لے میں فکر کو ڈھل جانا چاہیے

انگریزی شاعر ٹی ایس ایلیٹ (TS Eliot) نے بھی آزاد نظم (بلینک ورس (Blank Verse) میں جس meaning of meaning کا ہونا لازمی ٹھہرایا تھا، اس کی تشریح کرتے ہوئے ناقدوں نے اسے 'معنی کی لے' کا نام دیا ہے۔

علی سردار کی اس بات سے بھی مکمل اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ پابند نظم میں ہر ہر مصرعے پر الگ الگ داد دی جاسکتی ہے۔ جب کہ آزاد نظم میں یہ ممکن نہیں۔ وہاں خیال یا تصویر کی تکمیل پورے بند کی تکمیل کے ساتھ ہوئی ہے۔''(13)

سردار جعفری کی تلنگانہ، نیند، یلغار، ایک خواب اور، صبحِ فردا، اقبال: خدا کے حضور میں، پتھر کی دیوار، فریب، مشرق و مغرب، میرا سفر، ہاتھوں کا ترانہ، تین شرابی، پیراہنِ شرر وغیرہ لاتعداد نظمیں قابلِ ستائش ہیں۔''

جہاں فیض احمد فیض نے نثری نظم کے وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا، وہاں ایک انٹرویو میں آزاد نثری نظم کی بابت اپنے خیال ظاہر کرتے ہوئے سردار نے کہا تھا ''نثری نظم کے امکان ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ لکھنے والا اتنا بڑا شاعر ہو جتنا Walt Whitman (جو اپنی شہرۂ آفاق نظم Leaves of Grass سے دنیا بھر میں مقبول ہوا تھا) تھا، کیونکہ اس میں دراصل فکر کا Rhythm ہوتا ہے۔ محض فارمز (Forms) کے ذریعے نثری نظم کا حقیقی رِدم پیدا نہیں کیا جاسکتا، اس کے لیے نئی زبان اور استعارے کی تخلیق بھی ضروری ہوگی۔''(14)

اس طرح یہ شاعر وقتی یا لمحاتی شاعری کی بھی اہمیت ماننے کے ساتھ ہی دائمی اقدار کی پذیرائی کرتے رہے ہیں۔

حواشی

(1) سردار جعفری: فن اور شخصیت: مدیر نند کشور وکرم، مجلّہ 'عالمی اردو ادب' سردار جعفری نمبر جلد نمبر 19 اوّل ایڈیشن سنہ اشاعت 2001) 'ہم عصری ادبی مسائل، سردار جعفری سے ایک انٹرویو، ص 141
(2) ایضاً، مضمون 'زندگی کا مختصر سفرنامہ' سردار جعفری، (خودنوشت)، ص 16
(3) ایضاً، مضمون 'سردار بھائی'، ستارہ جعفری، ص 52
(4) ایضاً، مضمون 'سردار جعفری: انقلاب سے خواب تک'، ص 288
(5) بحوالہ آنند نرائن ملا، مضمون 'پیراہنِ شبنم' ص 214
(6) 'ساحر اور اس کی شاعری'، مرتبہ: پرکاش پنڈت، اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ص 136
(7) ایضاً، مضمون 'سردار جعفری کو آخری سلام' محمد حسن، ص 128
(8) ایضاً، مضمون 'سردار بھائی'، ص 66
(9) سردار جعفری: فن اور شخصیت، مضمون 'ثقافت کا سفیر' شین کاف نظام، ص 316
(10) 'سردار جعفری: فن اور شخصیت' مضمون: 'رومانی انقلاب کا آخری سالار، ساجد رشید، ص 113
(11) ساحر اور اس کی شاعری، مضمون 'سردار جعفری: انقلاب سے خواب تک'، خلیق انجم، ص 291
(12) ایضاً، جریدہ 'عالمی اردو ادب'، 'پیش لفظ'، مدیر نند کشور وکرم، ص 14
(13) ایضاً، مضمون 'ثقافت کا سفیر' شین کاف نظام، ص 326
(14) ایضاً، سردار جعفری کے ساتھ انٹرویو، مسلم شمیم کے ایک سوال کے جواب میں جواز و تفہیم، ص 149

◘

Dr. Krishan Bhavuk
201-A, Guru Nanak Nagar, Street No 18-K
Patiala - 147003 (Pb)

سردار جعفری کی نثری تحریریں

عمر رضا

سردار جعفری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور بعد میں اسی سے ان کی شناخت بھی قائم ہوئی لیکن اسی زمانے میں وہ نثری ادب میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے جس کا سلسلہ اخیر اخیر تک برقرار رہا۔ سردار کی نثری تحریروں کو تین حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ اول، افسانوی نثر۔ دوم، غیر افسانوی نثر اور سوم، تنقیدی نثر۔

افسانوی نثر کے ضمن میں سردار کے تیرہ افسانوں... ’آتشیں قمیص‘، ’لالۂ صحرائی‘، ’ہجوم وتنہائی‘، ’تین پاؤ گندھا ہوا آٹا‘، ’شمع تفاول‘، ’پاپ‘، ’کچھی‘، ’منزل‘، بارہ آنے‘، ’مسجد کے زیر سایے‘، ’آدم زاد‘، ’چہرو ماںجھی‘، ’گلینا‘... اور سات ڈراموں... ’دیوانے‘، ’گوتم کا مجسمہ‘، ’عذرا‘، ’شیطان کے بچے‘، ’سپاہی کی موت‘، ’یہ کس کا خون ہے؟‘، ’پیکار‘.. کا ذکر کیا جاسکتا ہے جنھیں سردار نے اپنی ابتدائی ادبی زندگی کے دوران میں لکھا تھا۔ ان میں سے دو ایک افسانوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام افسانے اور ڈرامے آزادی سے قبل کے ہیں جن میں سردار جعفری نے معاشرے میں ہو رہے مظالم واستحصال کی زبردست عکاسی کی ہے اور یہ بھی کوشش کی ہے کہ قارئین کے اندر ان معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کا جذبہ بیدار ہو لیکن جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے، وہ کسی قدر خشک اور کوری حقیقت نگاری پر مبنی ہے۔ افسانوی تحریروں میں جس قسم کا قصہ پن اور کلائمکس ہونا چاہیے، وہ قدرے کم ہے۔ البتہ غیر افسانوی تحریروں میں سردار کی تخلیقیت پورے آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے سردار جعفری کی لافانی کتاب ’لکھنؤ کی پانچ راتیں‘ (1964) کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

سات ابواب پر مشتمل ’لکھنؤ کی پانچ راتیں‘ کا پہلا باب ’قبولِ بندگیم را خدائے برنمی خیزد‘ خودنوشت کا درجہ رکھتا ہے جس میں سردار جعفری نے اپنے بچپن سے لے کر 1942 میں بمبئی پہنچنے اور کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ’قومی جنگ‘ میں کام کرنے تک کے حالات کو قلمبند کیا ہے لیکن اس میں سب سے زیادہ زور علی گڑھ پہنچنے سے قبل کے حالات پر صرف کیا گیا ہے جس سے جاگیردارانہ پس منظر میں سردار جعفری کے نئے تغیرات کا پتہ چلتا ہے مثلاً چہار جانب پھیلی ہوئی مفلسی، بیچارگی اور کسمپرسی پر سردار کا شدید اظہار افسوس اور بغاوت نظر آتا ہے۔ دوسرا باب ’لکھنؤ کی پانچ راتیں‘ پانچ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون ’راج سنگھاسن ڈانواڈول‘، دوسرا ’ایسی نہیں ہوئی ہے صبا در بدر کہ ہم‘، تیسرا ’یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا‘، چوتھا ’دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں کی بہار‘ اور پانچواں مضمون ’ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ‘ ہے۔ ان میں بھی سردار جعفری نے لکھنؤ میں گزارے ہوئے ان حالات و واقعات کو قلمبند کیا ہے جب انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ سبط حسن اور مجاز وغیرہ سے ملاقات کی تھی، ترقی پسندوں کے حلقے کو وسیع کیا تھا، ’نیا ادب‘ نکالا، معاشقے کیے، دوسری عالمی جنگ کے خلاف احتجاج کیا، ہڑتالیں کیں، جیل گئے، رہا ہوئے، بل رام پور آئے، چھ مہینے کی نظر بندی کے بعد پھر لکھنؤ آئے، آل انڈیا ریڈیو کے زیر اہتمام ’نو وارد شعرا کے مشاعرے‘ میں شریک ہوئے جس میں مجاز، فیض، جذبی، مخدوم اور جاں نثار اختر وغیرہ کے ساتھ وقت گزارا اور اس وقت کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور ادبی حالات پر گفت وشنید بھی کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے فائنل کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت چاہی لیکن انکار کر دیے گئے اور پھر بعد میں بمبئی آ گئے۔ ان مضامین میں افراتفری بھی ہے، خوشی بھی ہے، آوارہ پن بھی ہے، ذہنی کشمکش بھی ہے، رومان بھی ہے اور انقلاب بھی ہے۔ لیکن آخری رات کا ذکر بڑا ہی دردناک ہے۔ اس میں سردار جعفری نے 5 دسمبر 1955 کی اس بھیانک رات کا ذکر کیا ہے جس میں مجاز کی دردناک موت واقع ہوئی تھی۔ مجاز کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے سردار جعفری نے ان کی شاعری، ان کے مزاج، ان کی ناکام عاشقی، ان کی ذہنی و ادبی پختگی سبھی کچھ کو بے حد نپے تلے انداز میں بیان کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فن مرثیہ گوئی سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے مجاز کا نثری مرثیہ لکھا ہے جس کی اثر پذیری سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مضمون پڑھتے جایئے کہیں سے کوئی جھول یا ناگواری کا احساس نہیں ہوتا۔ تیسرے باب ’چہرو ماںجھی‘ میں غریب خوب صورت لڑکی گل چہر عرف چہرو کی دردناک کہانی بیان کی گئی ہے۔

مذکورہ تینوں ابواب کے بعد اگلے چار ابواب (’خالِ محبوب اور امن عالم‘، گلینا‘، ’ذوق تعمیر‘ اور ’گردشِ پیمانۂ رنگ‘) میں سردار جعفری ایک ایسے ترقی پسند ادیب کے طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں جو عوامی کشمکش اور جدوجہد کا ایک واضح اور تابناک نقشہ پیش کرتا ہے، معاشرے میں پھیلی گندگی سے نفرت اور اسے ختم یا تبدیل کر دینے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ مثلاً 1958 کے لکھے مضمون ’خالِ محبوب اور امن عالم‘ میں سوویت یونین کے خوشگوار سفر کا ذکر ہے جس میں سردار جعفری نے شاعری (ادب) کو انسان دوستی اور امن عالم کی مختلف شکلوں میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جولائی 1955 میں سردار جعفری نے اپنے ماسکو کے دوران سفر ایک رپورتاژ نما افسانہ ’گلینا‘ بھی تحریر کیا تھا جس میں خوب صورت اور رنگین پیرایے میں سردار جعفری نے اپنے شعری رویوں، اشتراکی نظام سے وابستگی، کمیونسٹ پارٹی اور روس سے عقیدت ومحبت اور عوامی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ 1955 کا تحریر کردہ مضمون ’ذوق تعمیر‘ میں سردار جعفری نے ’استالن گراڈ‘ کے اپنے سفر کی روداد بیان کی ہے جو جلد ہی دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے اُبرا تھا اور نئی تعمیر میں سرگرداں تھا۔ جس انداز میں سردار جعفری نے سفر کی روداد بیان کی ہے، اس سے ان کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی اور فنی شعور کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

’لکھنؤ کی پانچ راتیں‘ کا آخری باب ’گردشِ پیمانۂ رنگ‘ اس کے دیگر ابواب سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں جہاں فلسفہ ہے وہیں تاریخ بھی ہے۔ اس مضمون کے

ذریعے سردار جعفری نے انسانی زندگی کے ان مختلف مراحل کو فلسفیانہ اور تاریخی انداز میں بیان کرنے کی سعی کی ہے جن میں عروج و زوال، خزاں اور بہار پیمانۂ رنگ کی طرح مسلسل گردش کرتے رہتے ہیں جو انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ادب اور تہذیب کی دنیا میں بھی جاری وساری رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی تفہیم کو واضح کرنے کے لیے سردار جعفری نے دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر اور مسولینی کی فاشسٹ فوجوں کی شکست کا ذکر کیا ہے جس کے بعد بلغاریہ میں اشترا کی حکومت کے قیام کے بعد ان انسانی افکار اور تہذیبی اقدار، شاعر و ادیب اور معمار وفن کار کو نئی قوت ملی تھی جن کا دوران جنگ خون کر دیا گیا تھا۔ انھیں شاعروں میں بلغاریہ کا نوعمر شاعر 'وابت سارف' بھی تھا جو نازیوں کی آریائی برتری اور جرمن اقتدار کے بہیمانہ تصور کا دشمن تھا۔ 1959 میں اس کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر سردار بلغاریہ گئے ہوئے تھے جہاں انھوں نے دوران تقریر اقبال کا ایک فارسی قطعہ سنایا تھا۔ جشن کے دو تین دن بعد ایک دعوت کے موقع پر بلغاریہ کے بوڑھے شاعر 'لامار' نے اقبال کے اس قطعہ سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم سنائی جس نے سردار کے سامنے صدیوں کے حجابات اٹھا دیے تھے اور پھر سردار نے قدیم یونان، ایران، جرمنی اور عرب وغیرہ کے تاریخ وفلسفہ کے پیش نظر نوفلاطونی، ویدانت، نروان، بھکتی اور تصوف وغیرہ کے تصورات کو وقت کے بہاؤ کے ساتھ ایک دوسرے میں کچھ اس طرح ملا جلا اور مشترک پایا جو وقت اور زمانے کی رفتار کے سامنے ایک نئی شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہے اور رنگ ونسل مذہب وملت غرض ہر طرح کی تقسیم کو ختم کر دیتی ہے۔ یہی نہیں تہذیبوں کا ایک قوم سے دوسری قوموں میں جذب ہونے اور متضاد سمتوں میں چلنے والی ہواؤں کا آپس میں ہم آغوش ہونے والی کیفیتوں کو بھی سردار جعفری نے واضح کیا ہے۔ خواہ سکندر کا ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے دریائے سندھ سے ٹکرانا ہو، گندھار میں گوتم بدھ کے پہلے مجسمے میں بدھ کا چہرہ یونانی دیوتا 'اپولو' کی شکل میں ہو، فارسی زبان کا ایران سے ہندستان آنا اور یہاں کی زبانوں میں گھل مل کر ایک نئی زبان اردو کا وجود میں آنا ہو۔ سردار جعفری کا ماننا ہے کہ یہ سب وقت کے بہاؤ کے ساتھ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے چلے جاتے ہیں جو ایک نئی تہذیب اور ایک نئے انسان کا پتہ دیتے ہیں۔

سردار جعفری نے مسلم دنیا کے تصورات وعقائد پر بھی بحث کی ہے اور عرب کے ریگزاروں سے ہدایت کا جو ایک نیا چشمہ پھوٹا تھا جس نے بلاتفریق حبش کے بلال، فارس کے سلمان اور عرب کے ابوذر غفاری کی پیاس بجھائی تھی، ان کا بھی ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ پیغمبر اسلام کی وفات کے تیس سال کے اندر اندر اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور اسلامی دنیا مکمل جاگیردارانہ نظام میں تبدیل ہو گئی تھی۔ نتیجتاً مشرق ومغرب کے علوم اور فلسفے عربوں کو شکست دینے لگے تھے۔

مذکورہ تفصیل کے بعد سردار جعفری نے ادب میں ایک فکر کا دوسری فکر میں منتقل ہونا ثابت کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یونانی فکر نے ایران اور حافظ کو متاثر کیا۔

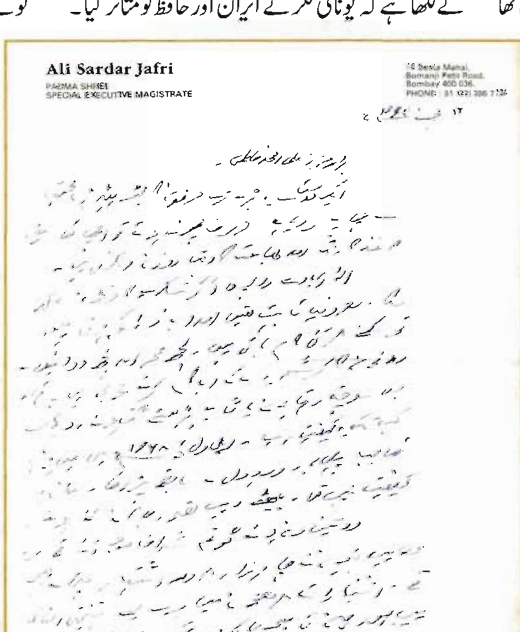
Ali Sardar Jafri
PADMA SHREE
SPECIAL EXECUTIVE MAGISTRATE

علی سردار جعفری کا علی احمد فاطمی کو لکھا گیا خط۔ بشکریہ علی احمد فاطمی

حافظ نے گوئٹے کو اپنا گرویدہ بنایا۔ گوئٹے نے اقبال کو نغمہ سنج کر دیا اور اقبال کے قطعے نے بلغاریہ کے لامار کو اتنی حسین نظم کہنے پر اکسایا اور آخر میں گردش پیمانۂ رنگ کے مذکورہ اصول کے پیش نظر یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر یونانی شاعر بھی، جو کہ اس محفل میں موجود تھا، لامار کی نظم پر ایک نظم کہہ دے تو گردش پیمانۂ رنگ مکمل ہو جائے۔ پورے مضمون میں سردار جعفری نے تہذیبوں کے لین دین، افکار کا ایک قوم سے دوسری قوم کے ادب اور دیگر شعبوں میں منتقل ہونے کو ایک خوش آئند بات قرار دیا ہے جس سے انسانی زندگی ہردم رواں دواں اور جوان رہتی ہے۔

مذکورہ افسانوی اور غیر افسانوی تحریروں کی بہ نسبت سردار کی تنقیدی تحریریں ادب کے طالب علموں کو زیادہ متاثر کرتی رہی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی سات تنقیدی کتابوں... 'مخدوم محی الدین'، 'ترقی پسند ادب'، 'پیغمبران سخن'، 'اقبال شناسی'، 'ترقی پسند تحریک کی نصف صدی'، 'غالب کا سومنات خیال' اور 'سرمایۂ سخن' ... کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

دو حصوں پر مشتمل 'مخدوم محی الدین' 1948 میں کتب پبلشرز، بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ پہلے حصے میں مخدوم محی الدین سے متعلق 'مخدوم سرخ سویرے کا شاعر' کے عنوان سے ایک مضمون ہے، جبکہ دوسرے حصے میں مخدوم کی نظموں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جس میں کل چھ نظمیں 'اندھیرا' جنگ آزادی' 'استالین'، 'انقلاب'، 'ٹوٹے ہوئے تارے'، اور 'حویلی' شامل ہیں۔

34 صفحات پر مشتمل پہلے حصے میں سردار جعفری نے مکالماتی انداز اختیار کیا ہے جس میں انھوں نے مخدوم کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی صورتحال نیز تحریک آزادی کی سمت ورفتار پر روشنی ڈالی ہے۔ مخدوم کی رومانیت سے انقلابیت تک کے سفر اور حیدرآباد تحریک سے ان کی وابستگی کا بھی ذکر ہے۔ اس میں سردار جعفری نے اپنی خود کی زندگی بالخصوص لکھنؤ سے بمبئی تک کا انھوں نے جو سفر طے کیا تھا، اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مضمون میں جو بھی بحث کی گئی ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سردار جعفری اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے کٹر مبلغ تھے اور مارکس، انگلز، لینن، استالن، اشتراکیت اور روس سے گہری محبت وعقیدت رکھتے تھے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر سردار کے مزاج کو انقلابی اور باغیانہ قسم کا بنا دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ انقلاب پسند تھے بلکہ ایسے ادب کی وکالت کرتے تھے جو ظلم وناانصافی کو ختم کر دینے کا عزم وحوصلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے دوسرے حصے میں مخدوم کی ان انقلابی نظموں کا انتخاب پیش کیا ہے جن میں آزادی کا جذبہ، ظلم وبے انصافی سے نفرت اور اس کو ختم کر دینے کا عزم پایا جاتا ہے۔

تقسیم ہند کے دوران جس طرح کے فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ اس نے ادیبوں میں ایک الگ طرح کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی جس کے زیر اثر ایسا ادب تخلیق کیا جانے لگا تھا جسے ترقی پسند نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود اسے ترقی پسند ادب سمجھا جانے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند

تحریک سے وابستہ ادیبوں پر مختلف سمتوں سے حملے شروع ہوگئے تھے اور بہت سے ادیبوں نے اس تحریک سے اپنا رشتہ بھی منقطع کرلیا تھا۔ ایسی صورت میں ترقی پسند ادب اور غیر ترقی پسند ادب میں تمیز اور اس کے صحت مند اور غیر صحت مند، جمہوری اور غیر جمہوری روایات کی نشاندہی کرنی ضروری سمجھی گئی تاکہ تحریک کے عوامی کردار کو تقویت پہنچائی جاسکے اور غیر جمہوری اقدار کو شکست دی جاسکے۔ اسی کے پیش نظر اس زمانے میں اختر حسین رائے پوری، احمد علی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر علیم، سجاد ظہیر، احتشام حسین، سبط حسن، فیض احمد فیض اور ممتاز حسین وغیرہ نے اپنے مضامین کے ذریعے اس کنفیوژن کو دور کرنے کی سعی کی تھی اور عزیز احمد نے تو باقاعدہ 'ترقی پسند ادب' کے نام سے ایک کتاب بھی شائع کی تھی۔ لیکن سردار نے ان تمام مضامین اور کتابوں سے اپنی عدم اطمینانی کا اظہار کیا اور ایک وقیع کتاب 'ترقی پسند ادب' رقم کیا جو سردار جعفری کی پہلی باضابطہ تنقیدی کتاب ہے۔ 1951 میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع شدہ اس کتاب سے سردار جعفری کی اس زمانے کی تنقیدی بصیرت اور شعری موقف کا بھرپور اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

1958 اور 1965 کے درمیان سردار جعفری نے کبیر، میر اور غالب کے کلام کو ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں علاحدہ علاحدہ کتابی صورت میں اپنے وقیع دیباچوں کے ساتھ شائع کروایا تھا۔ بعد میں سردار جعفری نے ان تینوں دیباچوں کو یکجا کرکے کتابی شکل میں 'پیغمبرانِ سخن' کے نام سے شائع کرا دیا۔ یہ کتاب پہلی بار فروری 1970 میں مکتبہ گفتگو، بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس میں سب سے پہلا مقالہ کبیر پر 'حرف محبت' کے عنوان سے ہے۔ دوسرا میر تقی میر پر 'صبا در بدر' کے عنوان سے اور تیسرا اور آخری مقالہ مرزا غالب پر 'تمنا کا دوسرا قدم' کے عنوان سے ہے۔ ان مقالوں سے قبل دیباچے میں سردار جعفری نے مقالوں کی اہمیت اور اس کی غرض و غایت کو اجاگر کیا ہے جس میں انھوں نے سب سے پہلے اس زمانے میں شروع ہونے والی اردو ہندی اور ہندو مسلم عصبیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کبیر، میر اور غالب کی مشترک قدروں کی طرف توجہ مرکوز کی ہے اور ہندستان کی دو بڑی قوموں اور زبانوں کے درمیان پیدا ہورہی خلیج کو دور کرنے کی سعی کی ہے۔

'اقبال شناسی' پہلی بار دسمبر 1976 میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں سردار جعفری نے اقبال کے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ 'ترقی پسند ادب' میں کہی گئی باتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ دراصل سردار جعفری نے اقبال کی پیدائش کے صد سالہ جشن کا خیر مقدم کرنے کے لیے یہ کتاب رقم کی تھی جس میں اقبال کے فکر و شعر کا جائزہ 'شاعر مشرق'، 'اقبال اور فرنگ' اور 'اقبال کا تصور وقت' کے تحت لیا ہے۔ اول الذکر مقالہ میں انھوں نے اقبال کے فلسفۂ خودی کو تحریک آزادی کے پس منظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے؛ اقبال پر جس طرح کی فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا جاتا رہا ہے اور خود سردار نے 'ترقی پسند ادب' میں اقبال کو جس طرح کا فرقہ پرست کہا تھا، اس کی نفی کی ہے اور اقبال کو ایک سیکولر و عالمی شاعر کے طور پر پیش کیا ہے۔

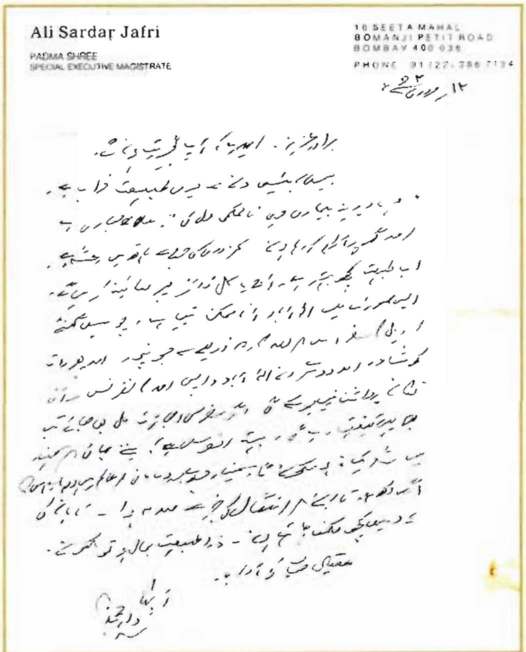
Ali Sardar Jafri
PADMA SHREE
SPECIAL EXECUTIVE MAGISTRATE
16 SEETA MAHAL
BOMANJI PETIT ROAD
BOMBAY 400 036
PHONE 91 (22) 386 7134

علی سردار جعفری کا علی احمد فاطمی کو لکھا گیا خط۔ بشکریہ علی احمد فاطمی

'ترقی پسند تحریک کی نصف صدی' دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے منعقدہ نظام خطبات کے لیے لکھے گئے مقالوں پر مشتمل ہے۔ اسے سردار جعفری نے اکتوبر 1984 میں پیش کیا تھا اور جنوری 1985 میں نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لیے از سر نو تیار کیا۔ اس کتاب کا مقصد چونکہ ترقی پسند تحریک کی نصف صدی کا احاطہ کرنا ہے، اس لیے سب سے پہلے ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے کے قومی اور بین الاقوامی اسباب پر توجہ مرکوز کی گئی ہے اور اس سے متعلق مختلف ادیبوں کی مثبت اور منفی رایوں کا احاطہ کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سردار جعفری نے آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک میں جس نوع کی ادعائیت اور انتہا پسندی در آئی تھی، اس کو ترک کرکے ایک معتدل، متوازن اور صحت مند ترقی پسندی کی بات کی ہے۔

'غالب کا سومنات خیال' بنیادی طور پر غالب کی مثنوی 'چراغ دیر' کے ترجمے سے پہلے ایک نوٹ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں سردار جعفری نے اس مثنوی کی شانِ نزول بیان کی ہے۔ شانِ نزول بیان کرنے کے لیے انھوں نے جو فضا قائم کی ہے، اس سے ان کے اس عہد کے شعری طریقۂ کار اور نظریۂ ادب کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں سردار جعفری نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ غالب نے اپنی شاعری کو سومناتِ خیال کیوں کہا تھا؟ اس کے لیے انھوں نے ریاست گجرات کے کاٹھیاواڑ کے علاقے میں سومنات کے مندر کا ذکر کیا ہے جسے 1024 میں محمود غزنوی نے لوٹ لیا تھا جس سے ہندوؤں کے دل پر ایک گہرا زخم ابھر آیا تھا جس پر بقول سردار جعفری 'صوفیوں اور شاعروں نے مرہم رکھا اور ایک بڑی عبادت گاہ کی حیثیت سے اس کا ذکر کعبے کے ساتھ کیا'۔ غالب نے اسے اپنی شاعری کا 'سومنات خیال' کہہ کر جو وقار بخشا ہے، وہ سردار کے لیے قابل توجہ ہے اور سردار جعفری نے اسی کو مقالے کا بنیادی موضوع بنایا ہے۔

'غالب کا سومنات خیال' کے بعد سردار جعفری کی زندگی میں باقاعدہ کوئی نثری کتاب تو منظر عام پر نہیں آئی، البتہ اس عہد میں وہ ایک کتاب کی ترتیب میں ضرور مصروف تھے جس کی ابتدا انھوں نے جنوری 1969 ہی میں کردی تھی۔ اس کتاب کی پہلی جلد کے مکمل ہوجانے کے بعد دوسری جلد کی تیاری میں بھی وہ مصروف تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو صفحات لکھ بھی چکے تھے لیکن موت نے ان کی زندگی چھین کر اس کام کو ادھورا ہی رہنے دیا۔ البتہ پہلی جلد 'سرمایۂ سخن' کے نام سے جولائی 2001 میں مکتبہ جامعہ نے ضرور شائع کردی تھی جو سردار جعفری کی آخری یادگار ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر شاعری کی لغت ہے جس کے ذریعے سردار جعفری نے کلاسیکی اور جدید شاعری کی فہم پیدا کرنے اور اس سے محظوظ ہونے کی ایک بامعنی کوشش کی ہے۔

■

Dr. Mohammad Umar Raza
CIL/SLL&CS, JNU, New Delhi-67

شکیل علائی

امن کا شاعر: علی سردار جعفری

سردار جعفری اُردو ادب کے ان مایہ ناز فن کاروں میں سے ایک رہے ہیں جن کا نام شعر و ادب کی دنیا میں ہمیشہ بے حد احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ سردار جعفری نے بلاشبہ طویل عمر پائی لیکن اپنی عمر کے کسی حصے کو انھوں نے ضائع نہیں کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے ایک ایک لمحے میں وہ متحرک تھے اور وہ ہر لمحہ ایک نئی منزل تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کے قدم کہیں نہیں رُکے۔ کئی بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کیے گئے لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ وہ آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر فیض احمد فیض کے علاوہ کسی ترقی پسند شاعر کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوسکی جو سردار جعفری کے حصے میں آئی اس کا تو افسوس کیا جاسکتا ہے کہ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا نہیں جاسکا لیکن 1997 میں انھیں ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ گیان پیٹھ پیش کیا گیا اس نے ساری کمی پوری کردی۔ مزید یہ کہ اپریل 1999 میں امریکہ کے ہارورڈ فاؤنڈیشن نے برصغیر میں ان کے قیام کے امکانات کو بڑھاوا دینے کی کوششوں کے لیے انھیں وہ اعزاز دیا جو ان سے قبل ای ایم فارسٹر، نیلسن منڈیلا، یاسر عرفات اور فیض احمد فیض کو دیا گیا تھا۔ اس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ سردار نہ صرف اردو کے بڑے فنکاروں میں سے ایک تھے بلکہ دنیا کے مختلف شہرت یافتہ لوگوں میں شامل تھے۔

سردار جعفری 29 نومبر 1913 کو بلرام پور (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسی طرح ہوئی جس طرح زمیندار گھرانوں کے لڑکوں کی ہوتی رہی تھی۔ انھوں نے دہلی یونی ورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی لیکن ایم اے لکھنؤ سے کیا۔ ایل ایل بی کی ڈگری ان کی نامکمل رہی تھی۔ سردار جعفری کی بظاہر ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کوئی سرکاری نوکری نہیں کی اور نہ کسی پرائیویٹ فرم میں جی حضوری پسند تھی۔ مزاج زمیندارانہ رہا تھا، وسائل کی انھیں کمی شاذ ہی محسوس ہوئی ہو اس لیے سردار کا لہجہ ہمیشہ بلند رہا۔ وہ اس موڈ میں کبھی نہیں رہے کہ:

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بلکہ ہر مرحلہ اور ہر معاملے میں انھوں نے کبھی مصلحت کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اس لیے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اختلافات میں زیادہ الجھے رہے۔ اشتعال آمیز باتیں کہتے رہے اور اپنے ایقانات کی طرح اپنے مفروضات کے سلسلے میں بھی ادعائی قسم کا رویہ زیادہ شد و مد کے ساتھ اختیار کرتے رہے۔ وہ ترقی پسندی کے شارح اور مفسر بھی رہے تھے ایک سرگرم وکیل اور مبلغ بھی تھے۔ نتیجے میں ان کا مزاج اور رویہ خاصا پر جوش، جذباتی اور ایک حد تک پاسدارانہ رہتا تھا۔ سردار جعفری پر اعتراض کرنے والوں کی کمی نہیں تھی لیکن شاید سردار جعفری کو لڑکپن میں مجنوں پر سنگ اٹھاتے وقت اپنا سر یاد نہیں آیا تھا نتیجے کے طور پر جب ان پر 'قیسیت' طاری ہوئی تو دوسروں نے بھی خوب خوب سنگ باری کی ایسا لگتا تھا کہ سردار جعفری کو حملہ آوروں نے زیادہ تاڑ رکھا تھا ہر چھوٹے بڑے ترقی پسندی کی نظریاتی بنیادوں کو ہدف بنانے کے لیے جعفری سے ہی حساب کتاب کرنے لگتے تھے۔ دراصل یہ سب کچھ سنگین قسم کی غلط فہمیوں کی وجہ سے ہوتے رہے اور شاید ان کے ہی تناظر میں ابھی تک سردار جعفری کی شاعری کو صحیح مقام نہیں مل سکا ہے۔ سردار جعفری پر ادبی بے راہ روی کے الزام تو تھے ہی، ان پر سیاسی الزام بھی لگائے گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن تو اس حد تک کہتے ہیں کہ 1948 میں سردار پٹیل کے غیظ میں سردار جعفری جیل گئے لیکن وہاں انھوں نے اپنے زمیندارانہ مزاج کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے جیل اسٹاف سے اس لیے دوستی بڑھائی کہ وہاں ان کو مراعات حاصل رہیں جس پر پارٹی نے شاید انھیں نکال باہر بھی کر دیا تھا۔ دوسرے انھوں نے ایمرجنسی کی حمایت کی اور 'حرف حق' کے عنوان سے نظم بھی لکھی۔ دراصل سردار جعفری کمیونسٹ ہونے کے باوجود ثقافتی اعتبار سے مذہبی آدمی تھے اس لیے وہ نئی راہ اپناتے وقت بھی اپنی روایتوں کو حتمی طور پر تیاگ دینے کے کبھی موڈ میں نہیں رہے اس لیے ان کی شاعری مشرقیت کے پس منظر میں ہی

سارے گل بوٹے کھلاتی ہے۔

سردار جعفری کا پہلا شعری مجموعہ 'پرواز' کے نام سے شائع ہوا تھا جس کا دیباچہ مجنوں گورکھپوری نے لکھا تھا حالانکہ اس مجموعے میں ان کا ابتدائی کلام ہے لیکن اسی مجموعے سے ان کی شاعری کے بڑھتے قدم کا اندازہ ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری کی بلند پروازی کا دور 'نئی دنیا کو سلام' اور اس کے بعد کا دور ہے۔ شروع میں ان کے ہاں رومان اور انقلاب کی ملی جلی کیفیتیں ملتی ہیں لیکن واضح فکری عناصر بعد کی شاعری کا حصہ ہے، جب ان کا اپنا رنگ و آہنگ اور لب ولہجہ اور فکری رویہ ان کے اپنے خاص اسلوب میں ڈھل جاتا ہے ان کی اس طرح کی شاعری پر بلاشبہ اقبال اور جوش کے لہجوں کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن سردار جعفری کا رنگ و اسلوب کہیں زیرآب نہیں ہوتا بلکہ سطح پر نمایاں رہتا ہے۔

> **سردار جعفری کی شاعری کے مختلف جہات ہیں۔ میں یہ یہاں دکھاناچاہ رہا ہوں کہ ان کی شعری کاوشوں کا ایک بڑا اور اہم پہلو تخلیقی لین دین کا بھی رہا ہے ایسا لگتا ہے کہ اگر سردار جعفری کو مشترکہ تہذیبی سرمایہ کو مواد بنا کر پیش کرنے کی ایک خوبصورت علامت کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کیونکہ انہوں نے بڑے پیمانے پر زبان و ادب، اظہار محبت، دوستی و یگانگت، بھائی چارہ اور انسان دوستی کے اظہار کا بلاشبہ وسیلہ بنایا۔ انہوں نے کالی داس کی منظومات کو اردو کے شعری پیکر میں ڈھال کر ہندی شاعری کو اردو کے دامن تک پہنچایا اس کے علاوہ کئی اہم کلاسیکس کو انہوں نے اردو میں منتقل کرکے اردو کے تجرباتی میدان کوزیادہ حوصلے بخشے۔ کبیر کی شاعری یا میرابائی کے الوہی گیت اور بھجن مرتب کرکے اردو والوں کے سامنے پیش کیا اس طرح کی کاوشوں کو ہم تخلیقی لین دین کی مثال میں دیتے ہیں۔ انہوں نے شیکسپیئر کی کہانیوں کے اردو تراجم بھی پیش کیے اور اس طرح سمندر پار کے ادب کے مزاج کو اپنے خاص انداز میں اردو والوں تک پہنچایا۔**

سردار جعفری نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے بلاشبہ وہ متنوع رہے۔ پچھّم سے پورب تک، کوریا، کشمیر، ویت نام بلکہ ساری دنیا کے غم کو وہ سمیٹنا چاہتے ہیں لیکن وہ ہندوستان کی تہذیبی روایات ملی جلی تہذیب، رواداری، بھائی چارے، امن و آشتی کو اپنی شاعری کی بنیاد بناتے ہیں۔ اس لیے وہ انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے شاعر بن جاتے ہیں۔ ان کی شاعری ظالم کے خلاف بغاوت اور مظلوم سے ہمدردی کی شاعری ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ سردار جعفری کا قلم انعام واکرام کے لیے نہیں لکھتا وہ اپنی رائے اور اپنی فکر کو اپنے قلم کی آبرو سمجھتا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ان کی نظم 'ایودھیا' متنازعہ فیہ بنی تو اس بے وجہ تنازعہ پیدا کرنے میں سرکاری خوشامد پسندوں اور سڑک چھاپ لیڈروں کا زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ ورنہ ملک کے دانشور طبقے نے تو کھل کر سردار جعفری کی حمایت کی ہے۔

سردار جعفری کی شاعری کے مختلف جہات ہیں۔ میں یہ یہاں دکھانا چاہ رہا ہوں کہ ان کی شعری کاوشوں کا ایک بڑا اور اہم پہلو تخلیقی لین دین کا بھی رہا ہے ایسا لگتا ہے کہ اگر سردار جعفری کو مشترکہ تہذیبی سرمایہ کو مواد بنا کر پیش کرنے کی ایک خوبصورت علامت کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کیونکہ انھوں نے بڑے پیمانے پر زبان و ادب، اظہار محبت، دوستی و یگانگت، بھائی چارہ اور انسان دوستی کے اظہار کا بلاشبہ وسیلہ بنایا۔ انھوں نے کالی داس کی منظومات کو اردو کے شعری پیکر میں ڈھال کر ہندی شاعری کو اردو کے دامن تک پہنچایا اس کے علاوہ کئی اہم کلاسیکس کو انھوں نے اردو میں منتقل کرکے اردو کے تجرباتی میدان کو زیادہ حوصلے بخشے۔ کبیر کی شاعری یا میرابائی کے الوہی گیت اور بھجن مرتب کرکے اردو والوں کے سامنے پیش کیا اس طرح کی کاوشوں کو ہم تخلیقی لین دین کی مثال میں دیتے ہیں۔ انھوں نے شیکسپیئر کی کہانیوں کے اردو تراجم بھی پیش کیے اور اس طرح سمندر پار کے ادب کے مزاج کو اپنے خاص انداز میں اردو والوں تک پہنچایا۔ انھوں نے صرف اردو والوں کے لیے حاصل ہی نہیں کیا بلکہ اردو سے بھی مواد دوسری زبانوں میں منتقل کیا جیسے غالب کا دیوان اپنے طور پر مرتب کرکے دیوناگری خط میں شائع کروایا۔ غالب کے بعد دیوان میر کو بھی ہندی والوں کے لیے دل چسپی کا سامان بنایا۔ دوسری زبان کے شاعروں کو وہ اردو والوں سے متعارف کراتے ہیں تو اردو کے شاعروں اور فن کاروں کو دوسری زبان سے متعارف کراتے ہیں۔ اس ادبی لین دین میں بلاشبہ سردار جعفری نے ایک اہم رول ادا کیا جس سے یکجہتی، اور قومی فکری دھارے کو وسعت اور توانائی عطا ہوتی ہے۔

سردار جعفری کے سلسلے میں سارے تحفظات کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بلاشبہ اردو کے مجاہد تھے، اور انھوں نے اردو کے لیے اپنی ساری تگ و دو کو مخصوص رکھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اشتراکی نقطۂ نظر کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے رہے اور کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیوں کو مقدم سمجھتے رہے اس سے ان کے ذہن میں ایک سیاسی انقلاب کا نقشہ ضرور تھا لیکن جہاں تک زبان اور تہذیبی سرگرمیوں کا تعلق ہے سردار جعفری کبھی بھی غیر روایتی نہ تو نتائج اخذ کرتے ہیں اور نہ ہی مشرقی سیٹ اَپ اختیار کرتے ہیں۔ انھیں اپنے کام پر بھروسہ تھا اپنی آواز پر بھروسہ تھا، اپنے لب و لہجے کی اہمیت کا احساس تھا۔ اپنی فکری رسائیوں پر اعتماد تھا اسی لیے وہ کہیں بھی کشمکش بھرے لہجے میں باتیں نہیں کرتے۔ دوٹوک باتیں کرتے اور انھیں یقین تھا کہ ان کی ضرورت سے نہ تو اردو کو انکار ہے نہ اردو والوں اور اردو کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تہذیبی، لسانی، ثقافتی اور امن پسند دنیا کو ان کے وجود کی اہمیت سے انکار ہے۔ اس لیے ان کا کام جاری رہے گا اور وہ اپنے خیال اپنے رویہ اور اپنے وجود کی اہمیت کے ساتھ بار بار آتے رہیں گے۔ وہ خود کہتے ہیں:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے ذہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
میں رنگ حِنا آہنگ غزل
انداز سخن بن جاؤں گا

سردار جعفری آج ہم میں نہیں ہیں ایسی بے پناہ صلاحیتوں والا ایک بڑا شاعر، ادیب، آدمی، انسان ہمارے درمیان تھا جو اپنی بے شمار صلاحیتوں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہمیں دے سکا۔ افسوس! بے رحم فرشتۂ اجل نے اس کے دست متحرک سے خامہ اور اس کی صد صفات زبان سے جادو چھین لیا اب تو ان کی تحریر ہی ان کے پیکر کو ہمارے سامنے متحرک رکھے گی۔

■

Dr. Shakeel Olayee, 'Kahkashaan'
Kareemganj, Gaya - 823001 (Bihar)

سردار جعفری

انتخاب کلامِ علی سردار جعفری

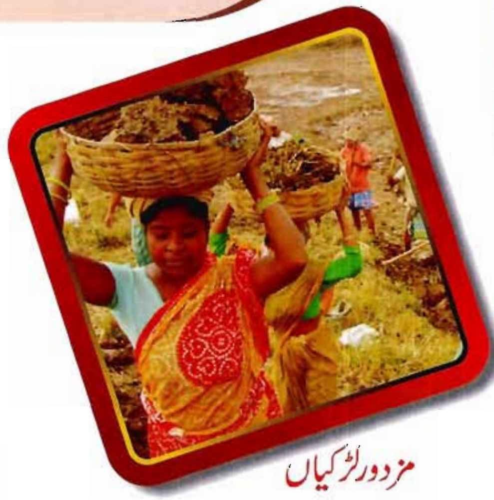

مزدور لڑکیاں

گردشِ افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں
سختیِ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
گھورتی رہتی ہے گرمی میں نگاہِ آفتاب
آسماں کرتا ہے نازل ان پہ کرنوں کا عتاب
سر سے ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی
سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی
بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب
ساز ان کا سوزِ حسرت خاموشی ان کا رباب
سر سے پا تک داستانیں حسرتِ ناکام کی
نرم و نازک قہقہوں میں تلخیاں ایام کی
خشک لب پھیکی نظر مدقوق چہرے زرد گال
وہ دھنسی آنکھیں فسردہ رنگ گرد آلود بال
پڑیاں ہونٹوں پہ زخموں کے کناروں کی طرح
گرم ہاتھوں پر عرق مدھم ستاروں کی طرح
بوجھ کا مرہونِ منت ان کے ابرو کا تناؤ
ان کا حاکم ظلم ان کا پاسباں بیجا دباؤ
ان کے ساتھی پھاوڑے ان کی سہیلی ہے کدال
زندگی پر یہ وبال اور زندگی ان پر وبال
لیکن ان کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ
ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ
اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب
ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشمِ انقلاب
ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان و قصور
توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کا غرور
ان کی چوٹوں پر نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار
یہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساطِ روزگار
بن کے قوت ایک دن ابھرے گی برسوں کی تھکن
دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظامِ انجمن

1937

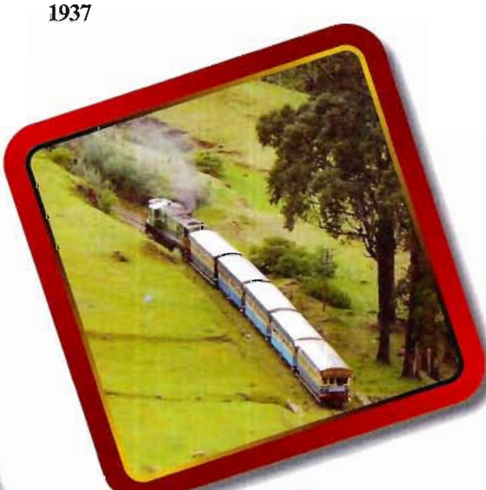

ویران مناظر

ہم سفر دیکھ یہ جنگل ہیں، یہ وادی، یہ پہاڑ
ریل ہر روز ادھر ہو کے گزر جاتی ہے
ریل کے شور سے جاگ اٹھتے ہیں یہ ویرانے
جیسے بیتے ہوئے لمحات کی یاد آتی ہے

کل مرے ساتھ اسی راہ سے گزرا تھا کوئی
دے گیا کوہ و بیاباں کو بہاریں اپنی
ایک مخمور و دلآویز گھٹا آئی تھی
دے گئی وادی و صحرا کو پھواریں اپنی

سر اٹھائے ہوئے خاموش کھڑے ہیں جو پہاڑ
منتظر ہیں وہی خورشید جمال آجائے
وہ شب و روز یوں ہی راہ تکا کرتے ہیں
کیا عجب ہے کوئی رنگین غزال آجائے

دیکھ وادی میں لچکتی ہوئی چھوٹی سی ندی
جستجو میں اسی معشوق کی لہراتی ہے
مضطرب رکھتی ہے اس کو اسی آہو کی تلاش
کھا کے بل شوق سے ہر موڑ پہ مڑ جاتی ہے

دیکھ جنگل میں مہکتے ہوئے ہنستے ہوئے پھول
کھل رہے ہیں دلِ بیتاب کے ارماں لے کر
کنج در کنج غزل خواں ہیں ہواؤں کے ستار
نکہتیں اڑتی ہیں پیغامِ بہاراں لے کر
'آ کہ ویران ہیں فطرت کے مناظر تجھ بن
آ کہ سنسان ہیں رنگین مناظر تجھ بن'

(1944)

ٹوٹا ہوا ستارہ

آرہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار

جمہوریہ کا اعلان نامہ

زمانے کے انداز بدلے گئے
نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
اٹھا خاکِ جاوا سے طوفانِ نور
بغاوت نے پھونکا قیامت کا صور
بھڑکتی ہیں ایراں میں چنگاریاں
یہ ہیں صبح عشرت کی تیاریاں
اجالا ہے مشرق کے ایوان میں
سحر ہوگئی شام و لبنان میں
بڑھی لے کے جمہوریت اپنی فوج
ملی نیل سے جا کے دجلے کی موج
جل اٹھے غلاموں کے سینے کے داغ
بکنگھم میں گُل ہورہے ہیں چراغ
گرے قصر شاہی ہلے تخت و تاج
نئی کروٹیں لے رہا ہے سماج
ملے زندگی کو نئے بال و پر
نئی منزلیں ہیں نیا ہے سفر
نئے میکدے مسکرانے لگے
نئے جام گردش میں آنے لگے

نئی صبح ہے اور نیا آفتاب
مبارک زمانے کو یہ انقلاب

ہمیں صبحِ نو ہیں ہمیں آفتاب
ہمیں ہیں بغاوت ہمیں انقلاب
اندھیری شبوں کے ستارے ہیں ہم
جو بجھتے نہیں وہ شرارے ہیں ہم
پہاڑوں کو ہٹتے ہیں ہم ریل کر
نکلتے ہیں طوفان سے کھیل کر
امیروں نے ہم کو ستایا بہت
حکومت نے ہم کو دبایا بہت
ہمارے لیے قید خانے بنے
ہمارے لیے تازیانے بنے
ہمیں پتھروں پر سلایا گیا
ہمیں سولیوں پر چڑھایا گیا
مگر ہم یہ سب ظلم سہتے رہے
مصائب کے دریا میں بہتے رہے
طمانچے حوادث کے کھاتے رہے
مگر اپنا پرچم اڑاتے رہے
غریبی کے ہاتھوں پریشاں رہے
ہواؤں کی زد پر فروزاں رہے
تڑپتے، مچلتے، اچھلتے رہے
چٹانوں کے دل سے ابلتے رہے
شعاعوں کی صورت بکھرتے رہے
بکھرتے نکھرتے سنورتے رہے

ابھرتے رہے مٹ کے ہم بار بار
بڑھاتے رہے زندگی کا وقار

کبھی بزدلی ہم پہ چھائی نہیں
ہمیں موت کی نیند آئی نہیں

مگر جو بناتے تھے ہم کو غلام
جو جیتے تھے پی کر لہو صبح و شام
بڑا ناز تھا جن کو تلوار پر
جو سوتے تھے لاشوں کے انبار پر
جو کرتے تھے دنیا کو زیر و زبر
وہ جن کی کنیزیں تھیں فتح و ظفر
انھیں کھا گئے آسمان و زمیں
نشاں ان کی قبروں کے ملتے نہیں
کہاں ہیں وہ فرعون و ہامان اب
کہاں ہیں وہ خونخوار سلطان اب
وہ شاہان نسل کیانی کہاں
وہ جبر و تشدد کے بانی کہاں
وہ نادر کہاں ہے سکندر کہاں
کہاں ہے مسولینی، ہٹلر کہاں
وہ چین اور تاتار کے کج کلاہ
جو بیٹھے تھے بن بن کے عالم پناہ
درندے جو دشمن تھے انسان کے
جو پھوڑے تھے طاعون وسرطان کے
وہ سب موت کی گود میں سوگئے
وہ سب وقت کی گرد میں کھوگئے
نہ چنگیز ہے اور نہ تیمور ہے
جو باقی ہے کوئی تو جمہور ہے

زمانے کے دریا کی موج رواں
ازل سے ابد تک رواں اور دواں

ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم
کہ فانی نہیں جاودانی ہیں ہم
ہمیں سے ہیں تہذیب کے نقش و رنگ
ہمیں سے تمدن کی دل کی امنگ
ہمارے ہی دم سے نشان حیات
ہمیں دیں گے انسانیت کو نجات
مسیحا کے ہونٹوں کا اعجاز ہم
محمد کے سینے کی آواز ہم
ہماری جبیں پر ہے محنت کا تاج
ہمیں نے لیا ہے زمیں سے خراج
ہماری ہی قوت سے چلتے ہیں مل
دھڑکتے ہیں ہم سے مشینوں کے دل
ہواؤں میں پرواز کرتے ہیں ہم
طرارے سمندر میں بھرتے ہیں ہم
کیا ہم نے فطرت کو زیر نگیں
جھکا دی زمیں پر فلک کی جبیں

کیا زندگی سے اندھیرے کو دور   نچوڑا ہے سورج کی کرنوں سے نور
ہمیشہ سے ہم گرمِ پیکار ہیں
تواریخ کی تیز تلوار ہیں

فرانسیس کے سر پہ کڑکے تھے ہم   شکاگو کے پہلو میں پھڑکے تھے ہم
دیا ہے نئے عہد کو ہم نے خون   بنایا تھا پیرس میں ہم نے کمیون
جو لینن کے سینے میں طوفان تھا   ہمارے سمندر کا ہیجان تھا
وہ انساں کی جنت وہ سرخ انجمن   ہماری جبیں کی ہے پہلی کرن
جو یورپ کی راتوں میں ہیں ضوفشاں   ہماری نگاہوں کی ہیں بجلیاں
دلِ ایشیا میں جو ہے اضطراب   ہماری ہی ہے روح کا پیچ و تاب
یہ صدیوں کے انسان کا سوز ہے
یہ جمہور کا جشنِ نو روز ہے

ہماری نگاہوں میں پیغام عید   ہمیں سے ہے ہندوستاں کی امید
ہمیں ڈھال ہیں ہم ہی تلوار ہیں   ہمیں فوج ہیں ہم ہی ہتھیار ہیں
زمیندار ہوں یا کہ سرمایہ دار   ولایت کے حاکم ہوں یا شہریار
وجود ان کا ہندوستاں پر ہے بار   کہ جس طرح سورج کے رخ پر غبار
یہ ہیں فخر حیوانیت کے لیے   یہ ہیں کوڑھ انسانیت کے لیے
بلندی سے نیچے گرا دو انھیں   یہ پیغام جاکر سنا دو انھیں
حیات آپ سے آج بیزار ہے
حضور آپ کی قبر تیار ہے

چمن اس کا ہے جو چمن میں رہے   وطن اس کا ہے جو وطن میں رہے
ہر اک قوم آزادو آباد ہو   ہر اک اپنے گھر رہ کے دلشاد ہو
ہر اک اپنے خطے میں پھولے پھلے   ستاروں سے ہم دوش ہوکر چلے
مٹے اس طرح عمر بھر کا فساد   وطن میں ہو قائم نیا اتحاد

دھنک میں کئی طرح کے رنگ ہوں
مگر پھر بھی وہ سب ہم آہنگ ہوں

یہ دولت ہے میراث انسان کی   زمیں پر حکومت ہے دہقان کی
ملوں پر ہے مزدور کا اختیار   وطن پر ہے جمہور کا اختیار
جو موتی نکالے وہ دامن بھرے   جو محنت کرے وہ حکومت کرے
ہماری کسوٹی ہے انسانیت
اخوت، مساوات اور حریت

محبت کے جذبے ابھاریں گے ہم   پریشان زلفیں سنواریں گے ہم
عناصر کے گھوڑوں پہ ہو کے سوار   کریں گے غریبی کے سینے پہ وار
سمندر سے موتی نکل آئیں گے   زمیں کے خزانے ابل آئیں گے
گھٹاؤں میں تبدیل ہوگا دھواں   برسنے لگیں گے ستارے یہاں
نہ پھر خوف ہوگا نہ پھر احتیاج   نئے سر سے تعمیر ہوگا سماج
یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی   کسانوں کی دنیا بدل جائے گی
رہے گا نہ کوئی بھی بے روزگار   مصیبت سے چھٹ جائیں گے کامگار
نہ ہوگا مشینوں کا انساں غلام   مشینوں پہ قبضہ کریں گے عوام
سجا دیں گے چیزوں سے بازار ہم   لگا دیں گے دولت کے انبار ہم
پنہائیں گے بچوں کو رختِ حریر   ہمالہ سے لائیں گے ہم جوئے شیر
سنہرے دوپٹے اڑھائیں گے ہم   ستاروں سے آنچل بنائیں گے ہم
پھلے اور پھولے گا بھارت کا باغ   جلیں گے ہر اک گھر میں گھی کے چراغ
کریں گے یہاں رقص حسن و شباب   زمیں پر اتر آئے گا آفتاب
وہ شاداب چہروں پہ ہوگا نکھار   کہ جھینپیں اجنتا کے نقش و نگار
نئی دیں گے ماتھے کو تنویر ہم
بدل دیں گے انساں کی تدیر ہم

11 دسمبر 1946، ماخوذ از: جمہور، ایک سیاسی مثنوی

اپنے دل کے شعلۂ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامان ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئین فطرت کو نثار
کس قدر بیباک، کتنا تیز، کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خرامی شرمسار
موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہے کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کے لیے
بڑھ رہا کرۂ گیتی کا شوقِ انتظار

لیکن ایسے انجم روشن جبیں و تابناک
آپ ہوجاتے ہیں اپنی تابناکی کا شکار

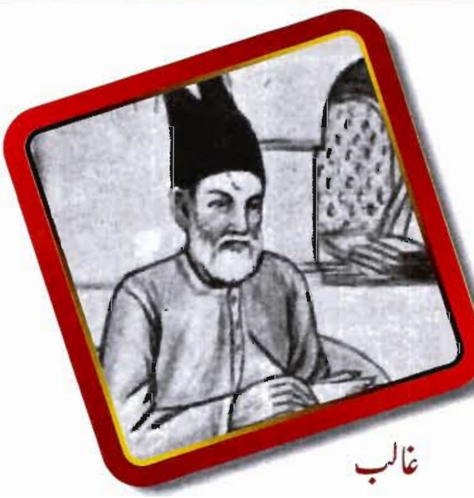

غالب

آسمانوں کی بلندی کو بلا کا ناز تھا
پست ہمت جس سے ذوق رفعت پرواز تھا

رہگزارِ ماہ و انجم تک کوئی جاتا نہ تھا
کوئی شاخِ کہکشاں پر بیٹھ کر گاتا نہ تھا
عرش پر جبریل کا دمساز ہوسکتا تھا کون
طائرِ سدرہ کا ہم آواز ہوسکتا تھا کون
جو لگا دے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داؤدِ سخن ایسا نہ تھا
تونے چھیڑے ہیں وہ نغمے شاعری کے ساز پر
لحنِ داؤدی کو رشک آئے تری آواز پر
تیرا بربط کہکشاں، ناہید ہے تیرا رباب
آسماں کیا ہے ترے بحرِ تخیل کا حباب
تیرا نغمہ ساحری، تیرا بیاں پیغمبری
تیرے قبضہ میں ہے اقلیمِ سخن کی داوری
تیری فکرِ نکتہ رس حسنِ تخیل کا شباب

شعر تیرا معجزہ تیری کتاب ام الکتاب
وہ صداقت، وہ حقیقت، وہ جمالِ برق پاش
زندگی جس کے لیے قرنوں سے سرگرمِ تلاش
وہ صداقت عکس افگن ہے تری تقریر میں
وہ حقیقت جلوہ فرما ہے تری تحریر میں
حسن کے جلووں سے جب محروم ہو جاتے ہیں ہم
کذب کے ظلمت کدے میں جا کے کھو جاتے ہیں ہم
جب کہ ہوتا ہے شبِ غم میں بلاؤں کا نزول
جب نگاہیں پھیر لیتے ہیں مہ و مہر و نجوم

شعر تیرے جگمگا اٹھے ہیں اس ظلمات میں
جس طرح جگنو چمکتے ہیں بھری برسات میں
تو نے دل کو گرم سینوں کو فروزاں کر دیا
روح کو روشن، دماغوں کو چراغاں کر دیا
تو مثالِ شمع ماضی کے سیہ خانے میں ہے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانے میں ہے

تیرے گلشن کی بدولت گل بداماں ہم بھی ہیں
تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی ہیں

موت اور زندگی

وہ جبیں جس پہ چمکتا تھا دمکتا ہوا چاند
سرد ہے اوس میں بھیگے ہوئے پھولوں کی طرح
جسم لکڑی کی طرح سخت ہوا جاتا ہے
ہاتھ میں خشک بیاباں کے ببولوں کی طرح

آنکھ ہے بند لبِ نغمہ فشاں ہے خاموش
موت کی برف جمی جاتی ہے رخساروں پر
مردنی چہرے پہ یوں چھائی ہوئی ہے جیسے
راکھ کا ڈھیر ہے بجھتے ہوئے انگاروں پر

اب نہ دوڑے گا لہو اب نہ چلیں گی نبضیں
اب نہ مہکیں گے ترے عارضِ رنگیں کے گلاب
اب تنیں گی نہ بھویں اب نہ جھکیں گی پلکیں
اب نہ ٹپکے گی نگاہوں سے محبت کی شراب

اب نہ پھیلے گی تری زلفِ پریشاں کی شمیم
عکس تیرا نہ نظر آئے گا آئینے میں
اب نہ چونکائیں گی قدموں کی صدائیں تجھ کو
کوئی طوفان اٹھے گا نہ ترے سینے میں

چوڑیاں تیری کلائی کے لیے روئیں گی
کنگھیاں ترسیں گی الجھے ہوئے بالوں کے لیے
ہوگی سرمے کو ترے دیدہ و مژگاں کی تلاش
غازہ رکھا ہی رہے گا ترے گالوں کے لیے

کوئلیں کوکیں گی، گائیں گے پپیہے لیکن
آہ تو پیار بھرے گیت سنے گی نہ کبھی
گھر کے آکاش پہ ساون کی گھٹا آئے گی!
تو مگر اپنے دوپٹے کو چنے گی نہ کبھی

رات ڈھونڈھے گی تجھے لے کے ستاروں کے چراغ
صبحیں بھٹکیں گی بیاباں میں کہستانوں میں
جا کے ہر سمت پکاریں گی ہوائیں تجھ کو
پھول دیکھیں گے تری راہ گلستانوں میں

ڈھونڈھنے والے تجھے ڈھونڈ کے تھک جائیں گے
بزمِ فطرت کی کسی شے میں نہ پائیں گے سراغ
صبر کر لیں گے تری موت پہ رونے والے
جھلملا جاتے ہیں انسان کی یادوں کے چراغ

کیا بس اتنا ہی ہے اس پیکرِ خاکی کا مآل؟
سیلِ بیباک حوادث میں بشر کچھ بھی نہیں؟
یک نفس بیش نہیں فرصتِ ہستی یہ کیا؟
گرمیِ بزم بجز رقصِ شرر کچھ بھی نہیں؟
(ماخوذ از غالب)

اپنی گڑیا سے مگر کھیل رہا ہے یہ کون؟
مجھ کو جیسے تری تصویر نظر آتی ہے
اس کی ننھی سی دمکتی ہوئی پیشانی پر
ایک کھوئی ہوئی تنویر نظر آتی ہے

اس کے چہرے پہ ترے حسن کی تابانی ہے
اس کی آنکھوں میں لچکتی ہے جوانی تیری
نرم سینے میں تری موجِ نفس ہے بیتاب
لبِ معصوم پہ ہے نغمہ فشانی تیری

موت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

جیل

تیرگی رستی ہے
جیسے زخموں سے سیہ خون کی بوندیں ٹپکیں
خامشی چلتی ہے
چیونٹیاں جیسے بدن پر رینگیں
قید میں چلتے ہوئے سایوں کے
اور پتھرا گئی ہوئی آنکھوں کی اندھی دیوار
ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھتی ہے
درد کی طرح سے اٹھتی ہیں امنگیں دل میں
ٹیس کی طرح سے بھولی ہوئی یاد آتی ہے
جیل کی خاک سے آہوں کا دھواں اٹھتا ہے
اور لوہے کی سلاخوں میں بدل جاتا ہے
بیڑیاں روتی ہیں، زنجیریں فغاں کرتی ہیں
کوڑے چیخ اٹھتے ہیں جلادوں کی خونخواری پر
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ تشدد کا نظام
آج اہنسا کے پجاری ہیں محافظ جس کے
دھارے اس وادیِ خاموش میں تھم جاتے ہیں
آنسو آنکھوں سے ٹپکتے نہیں جم جاتے ہیں
نالے بے سود ہیں بیکار ہے فریاد یہاں
ہم ہیں صید اور ہر اک ذرّہ ہے صیاد یہاں
اپنے ہاتھوں سے تشدد کو مٹانا ہوگا
آہن و سنگ کی دیوار کو ڈھانا ہوگا

گفتگو

(ہند پاک دوستی کے نام)

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی تاروں بھری یہ رات چلے

ہوں جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنگِ دُشنام
طنز چھلکائے تو چھلکایا کرے زہر کے جام
تیکھی نظریں ہوں ترش ابروئے خمدار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں
بے بسی حرف کو زنجیر بہ پا کر نہ سکے
کوئی قاتل ہو مگر قتلِ نوا کر نہ سکے

صبح تک ڈھل کے کوئی حرفِ وفا آئے گا
عشق آئے گا بصد لغزشِ پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے، لب کانپیں گے
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی

اور پھر حرف و نوا کی نہ ضرورت ہوگی
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی
نفرت اٹھ جائے گی، مہمان مروّت ہوگی

ہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے
تحفۂ درد لیے پیار کی سوغات لیے
ریگزاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی تاروں بھری یہ رات چلے

اگست 1966

غزلیں

★

سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے
فریب یہ دے دیا ہے کس نے کہ حریت کی برات آئی
ترنگی چلمن اٹھا کے دیکھو تو ساحر مکر و فن وہی ہے
ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے، نوائے سازِ کہن وہی ہے
ابھی تو دیوار و در پہ منڈلا رہے ہیں بیکاریوں کے سائے
ملوں کے اعصاب کا تشنج وہی رگوں کی تھکن وہی ہے
وہی ہے سرمایہ دار و مزدور کی کشاکش جو کل تلک تھی
لہو میں بھیگا ہوا زمانے کے جسم پر پیرہن وہی ہے
سماج کے رخ پہ ہے غریبوں کے خون ناحق کا گرم غازہ
ہیں جس میں پیچیدہ مار و کژدم یہ زلف عنبر شکن وہی ہے
لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں، زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آداب محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے
بجھا رہا ہے زمانہ پیاس اپنی علم و حکمت کے میکدوں سے
ہماری محفل میں وہمِ شیخ و جہالتِ برہمن وہی ہے
جنھیں ہم اپنا سمجھ رہے تھے وہ آج بیگانے ہو گئے ہیں
جو غیر کے ابروؤں پہ کل تھی جبیں پہ ان کے شکن وہی ہے
ابھی تو خاشاک کے لیے ہے ہزار طوفان کی ضرورت
اٹھی تھی جو پیچ و تاب کھاتی یہ موجِ گنگ و جمن وہی ہے
بلند محلوں کے بام و گنبد پہ جھوٹی کرنوں کو ناچنے دو
جو کالی کٹیاؤں کو اجالا عطا کرے گی کرن وہی ہے

★

آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق و جنوں حسن کی آیات کے بعد
اے وطن، خاکِ وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد
نارِ نمرود یہی اور یہی گلزارِ خلیل
کوئی آتش نہیں آتش کدۂ ذات کے بعد
رام و گوتم کی زمیں حرمتِ انساں کی امیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد
تشنگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی سردار
بڑھ گئی کوثر و تسنیم کی سوغات کے بعد

★

یہ بے کس و بے قرار چہرے
صدیوں کے یہ سوگوار چہرے
مٹی میں پڑے دمک رہے ہیں
ہیروں کی طرح ہزار چہرے
لے جا کے انھیں کہاں سجائیں
یہ بھوک کے شکار چہرے
افریقہ و ایشیا کی زینت
یہ نادرِ روزگار چہرے
کھوئی ہوئی عظمتوں کے وارث
کل رات کے یادگار چہرے
غازے سے سفید مے سے رنگیں
اس دور کے داغ دار چہرے
گزرے ہیں نگاہ و دل سے ہو کر
ہر طرح کے بے شمار چہرے
مغرور انا کے گھونسلے میں
بیٹھے ہوئے کم عیار چہرے
قابلِ التفات آنکھیں
ناقابلِ اعتبار چہرے
ان سب سے حسین تر ہیں لیکن
رندوں کے گناہ گار چہرے

★

شمع کا، مے کا، شفق زار کا گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے اب دلدار کا رنگ
تہہ عارض جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں
لطفِ اقرار ہے یا شوخیٔ اقرار کا رنگ
آئی مہکی ہوئی پھر جشنِ ملاقات کی رات
جام میں ڈھلنے لگا شام کے رخسار کا رنگ
عکسِ ساقی سے دمک اٹھی ہے ساغر کی جبیں
اور کچھ شوخ ہوا بادۂ گلنار کا رنگ
ان کے آنے کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیسے
بدلا بدلا سا ہے میرے در و دیوار کا رنگ

□

ماخذ: کلیاتِ علی سردار جعفری (جلد اوّل، و دوم)، مرتب: علی احمد فاطمی، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محمد احسن

ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کی صورت حال

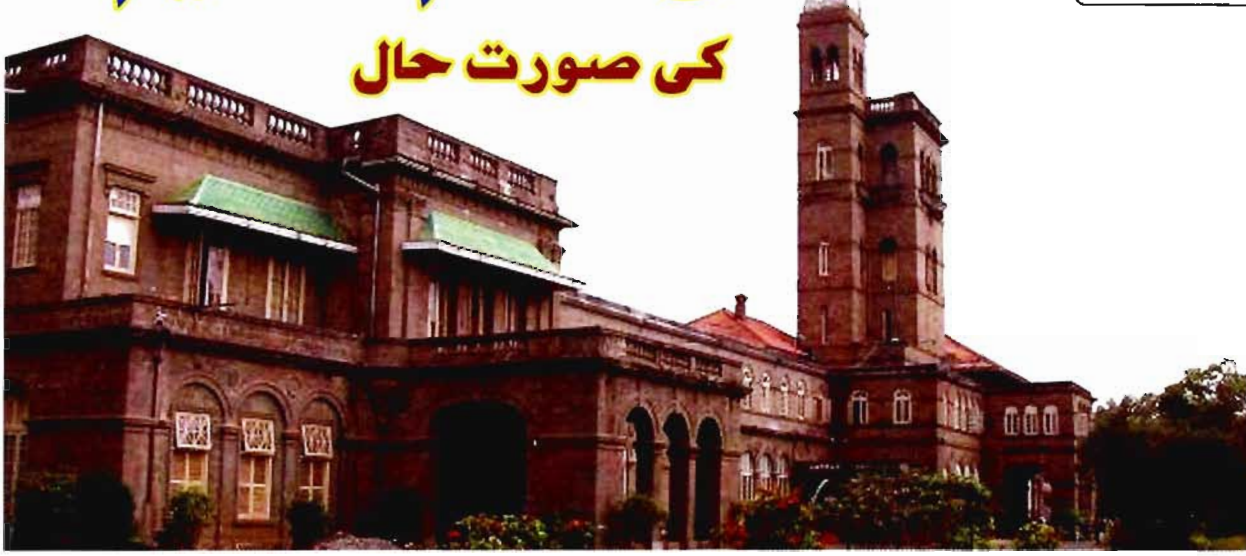

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی

ہندوستان کو آزاد ہوئے نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے کسی ملک یا قوموں کی زندگی میں 66 سال کی مدت کم نہیں ہوتی۔ اس نصف صدی نے جہاں ہمیں محرومی کی داستانیں دی ہیں، وہیں ہم نے بہت کچھ پایا بھی ہے۔ ہم نے جو کچھ پایا ہے ان میں سب سے اہم چیز تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس ہے۔ آج سے کچھ دہائی پہلے علم کو مخصوص خاندانوں کی جاگیر سمجھا جاتا تھا، کچھ زمیندار اور اہلِ ثروت ہی اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے تھے۔ لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ پڑھنے پڑھانے کا کام کچھ لوگوں کے لیے ہی ہے عام لوگوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کا رجحان بہت کم تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ اگر اپنے بچوں کو پڑھاتے بھی تو چھوٹے اور معمولی اسکولوں اور مکتبوں میں ہی پڑھا سکتے تھے، معیاری درسگاہیں روسا، جاگیرداروں اور حکمراں طبقے کے بچوں کے لیے مخصوص تھیں۔ عام لوگوں کے بچوں کی پہنچ ان درس گاہوں تک نہیں تھی۔ آزادی کے بعد ہمارے ملک کے جمہوری نظام نے ان بند دروازوں کو کھولا تاکہ تعلیم کے مواقع سے تمام طبقے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن ہندوستان کو تعلیمی وراثت کے طور پر انگریزوں سے جو کچھ ملا، اس کا اصل مقصد ان کے (انگریزوں) کے مفاد کی تکمیل اور رعایا کو اپنی فکر اور اپنی تہذیب وثقافت کا اسیر بنانا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ ہندوستان تہذیبی طور پر مغرب کا پیروکار بن جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ رعایا کے دلوں میں اپنے مذہب و عقیدے کے تئیں شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں۔ انگریزی حکومت اس پالیسی پر کتنی منصوبہ بندی کے ساتھ عمل پیرا تھی اس کا اندازہ اس خط کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جو میکاؤ لے نے 12 اکتوبر 1836 میں اپنے والد کو لکھا تھا:

”ہمارے انگریزی اسکول دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں، اور اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ طلبہ کے لیے گنجائش نکلنی مشکل ہے۔ اس تعلیم کا بہت زیادہ اثر ہندوؤں پر ہو رہا ہے، کوئی ہندو انگریزی پڑھنے کے بعد اپنے مذہب پر فی الواقع ایمان نہیں رکھ سکتا، مجھے پورا اعتماد ہے کہ اگر ہماری تعلیمی پالیسی کامیاب ہوئی تو بنگال میں کوئی بت پرست باقی نہ رہے گا۔ یہ سب فطری طور پر ہوگا، بغیر کسی مذہبی وعظ اور مداخلت کے۔“ (B.C. Rai History of Indian Education، ص 135، بحوالہ طرزِ تعلیم)

بہرحال آزادی کے بعد یہاں کی تعلیمی صورت حال میں خصوصاً تعداد اور معیار میں کافی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہمارے ملک کی شرح خواندگی جو 1951 میں 18.3 فیصد تھی وہ 2011 میں بڑھ کر 74.4 فیصد ہوگئی۔ نتیجتاً ہمارے یہاں ہر سطح پر تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ معیشت کے اعتبار سے چین کے بعد ہماری معیشت کی ترقی دوسرے نمبر پر ہے۔ ہمارا ملک اطلاعاتی اور ٹیلی مواصلاتی ٹکنالوجی، ایٹمی سائنس، بایوٹکنالوجی اور قمری سائنس کے علاوہ کئی دیگر سائنسی میدانوں میں صف اول کے ممالک میں شامل ہے۔ لیکن ان تمام ترقیوں اور حصولیابیوں کے باوجود ہم اپنے ملک کی ناخواندگی کا خاتمہ اور سب کے لیے یکساں تعلیم مہیاں کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کی اصل وجہ ہمارے یہاں حصول تعلیم کا وہ نظام ہے جو اپنے نقطہ نظر کی رو سے Elitist رہا ہے کیونکہ انگریزی حکومت کے عہد میں تعلیم کا دائرہ محدود تھا اور عوامی تعلیم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ دراصل انگریزوں سے وراثت میں ملا ہوا ہمارا تعلیمی نظام اپنی توضیع کے اعتبار سے ماضی کے نوآبادیاتی تعلیمی نظام کی توسیع ہے جو بنیادی طور پر ادنیٰ ملازم اور کلرک پیدا کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ دوسری طرف ایک عرصہ گزرنے کے بعد ہمارا تعلیمی نظام بدلتے ہوئے تکنیکی اور صنعتی منظرنامے کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کمزور پڑ رہا ہے؛ گوکہ اس ضمن میں ہماری حکومتیں مسلسل کام کر رہی ہیں، پھر بھی ہم اپنے موقف میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ 2006-07 کی ایک رپورٹ کے مطابق آزادی کے 66 سال گزر جانے کے بعد ہمارے یہاں کالج اور یونیورسٹیوں میں تعلیم (Tertiary Education) حاصل کرنے والوں کی تعداد اپنے متعلقہ گروپ میں صرف 10 فیصد آباد

ی کو حاصل ہے، جو ترقی یافتہ ملکوں اور عالمی اوسط 23 فیصد سے نسبتاً بہت کم ہے۔ ان چنوتیوں بھری صورت حال میں فاصلاتی نظام تعلیم ایک متبادل کے طور پر نمو پذیر ہو رہا ہے اور آج اس مقام پر ہے کہ یہ بدلتے ہوئے تکنیکی منظرنامے کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

ہندوستان کا اعلیٰ تعلیمی نظام چین اور امریکہ کے بعد تیسرا اعلیٰ نظام تعلیم ہے۔ آزادی کے وقت ہمارے یہاں اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نام پر 20 یونیورسٹیاں اور 591 کالج تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں اس وقت صرف 20 لاکھ طلبہ کا اندراج تھا۔ لیکن آزادی کے بعد بنیادی سہولتوں اور اداروں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ گزشتہ برسوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اچھی تعداد میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق فی الوقت ہندوستان میں 523 یونیورسٹیاں (بشمول 43 مرکزی، 130 ڈیمڈ یونیورسٹی، 345 ریاستی اور 5 خصوصی سطح کے ادارے) 33,023 کالج، 90 پرائیوٹ یونیورسٹیاں اور پانچ خصوصی سطح کے مرکزی تعلیمی ادارے اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافے کے باوجود بھی ہمارا روایتی تعلیمی نظام ضرورت کے لحاظ سے ابھی بھی ناکافی ہے۔ کیونکہ موجودہ دستیاب انفرااسٹرکچر سے ہمارا تعلیمی نظام اپنے متعلقہ گروپ کے صرف 10 فیصد نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم فراہم کر پا رہا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو ایک درخشاں مستقبل دکھائی دیتا ہے۔ فی الوقت ہندوستان میں 14 یونیورسٹیاں ایسی ہیں جو صرف فاصلاتی طرز پر ثانوی اور اعلیٰ سطح کی تعلیم فراہم کرتی ہیں۔ ان میں ایک قومی سطح کی اور 13 ریاستی سطح کی یونیورسٹیاں ہیں، نیز 150 سے زیادہ روایتی یونیورسٹیوں میں فاصلاتی نظام تعلیم کے خصوصی شعبے ہیں؛ جہاں فاصلاتی طرز پر مختلف اقسام کے پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ کورسیز فراہم کیے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہائر سیکنڈری سطح کی تعلیم کے لیے، نیشنل اوپن انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ ہے، جو مختلف النوع پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ کورسیز فراہم کرتی ہے۔ نیز مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی ان اوپن و فاصلاتی یونیورسٹیوں کے علاوہ متعدد پرائیوٹ تعلیمی ادارے مثلاً سمبوسس یونیورسٹی؛ ICFAI اور سکم منی پال جیسی یونیورسٹیاں بھی موجود ہیں، جہاں فاصلاتی طرز پر مختلف پیشہ ورانہ اکیڈمک پروگرام دستیاب ہیں۔

یوں تو ہندوستان میں مراسلاتی یا فاصلاتی تعلیم کا آغاز دہلی یونیورسٹی میں 1962 میں ہوا اور دھیرے دھیرے پورے ملک میں اس نظام تعلیم کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ لیکن 1982 میں پہلی اوپن یونیورسٹی جس کا نام اس وقت آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی تھا؛ کا قیام حیدرآباد میں عمل میں آیا۔ بعد میں اس یونیورسٹی کا نام بدل کر ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی رکھا گیا۔ ملک کی یہ منفرد یونیورسٹی پہلی بار 'تعلیم آپ کے دروازے پر' کا نعرہ دیا اور اس کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس کے بعد اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا قیام 1985 میں عمل

ریاستیں/ یوٹی	طلبہ کی تعداد				اگنور	
		فاصلاتی طرز			2003-04	
	Conventional Mode رسمی نظام تعلیم	OUs	DEIs	%	نمبر	%
ہماچل پردیش	94,081		33,558	26.3	3,812	2.9
آندھراپردیش	822,877	128,391	129,102	23.8	12,701	1.2
مدھیہ پردیش	537,690	151,353	3,119	22.3	5,585	0.8
ہریانہ	251,027	0	72,043	22.3	8,044	2.4
تمل ناڈو	759,739	0	194,089	20.3	23,699	2.4
دہلی	187,704		39,152	17.3	54,128	19.3
مہاراشٹر	1,359,896	103,255	70,138	11.3	12,694	0.8
کیرالہ	297,393	0	36,448	10.9	9,461	2.8
جموں کشمیر	69,207		4,270	5.8	8,209	10.0
تریپورا	20,198		638	3.1	931	4.3
کرناٹک	639,192	17,972	1,817	3.0	14,756	2.2
راجستھان	368,926	10,124	746	2.9	11,113	2.8
مغربی بنگال	651,435	4,441	14,084	2.8	20,696	3.0
آسام	203,554	0	2,895	1.4	4,882	2.3
گجرات	600,062	7,706	63	1.3	13,333	2.1
چھتیس گڑھ	155,372	0	1,717	1.1	3,037	1.9
پنجاب	265,629		1,686	0.6	10,159	3.7
گوا	20,106		125	0.6		0.0
اُترپردیش	1,293,209	4,246	2,465	0.5	22,807	1.7
بہار	524,110	1,906	400	0.4	31,749	5.7
اُڑیسہ	348,706	0	394	0.1	12,217	3.4
میگھالیہ	29,170	0	9	0.0	2,646	8.3
ترانچل	12,511			0.0	6,720	34.9
سکم	4,459	0	0	0.0	879	16.5
روناچل پردیش	5,514	0	0	0.0	640	10.4
میزورم	11,567	0	0	0.0	1,262	9.8
جھارکھنڈ	198,648	0	0	0.0	20,398	9.3
ناگالینڈ	12,864	0	0	0.0	894	6.5
منی پور	36,732	0	0	0.0	1,500	3.9

میں آیا۔ اگنو صرف فاصلاتی تعلیم کے لیے مختص حکومت ہند کی واحد یونیورسٹی ہے جو اپنی خصوصیات اور مختلف النوع پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ کورسوں کے لیے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ تعداد داخلہ (انرولمینٹ) کے لحاظ سے ان تمام 14 اوپن یونیورسٹیوں میں سب سے زیادہ داخلہ اگنو میں ہے۔ تعداد داخلہ (انرولمینٹ) کے لحاظ سے اگنو کے بعد دوسرے نمبر پر مدھیہ پردیش کی بھوج اوپن یونیورسٹی ہے۔ لیکن ریاستی سطح کی اوپن یونیورسٹیوں میں بھوج اوپن یونیورسٹی کا مقام انرولمینٹ کے لحاظ سے اوّل نمبر پر ہے۔ تحقیقی پروجکٹ پر مبنی ڈاکٹر سرن مکھرجی اور پروندو ترپاٹھی کے مقالے بعنوان "Mapping the Distribution of Distance Education Provision for Promoting National Development in India" سے کچھ اعداد و شمار؛ جو تعلیمی سال 04-2003 کے ہیں؛ اس حوالے کے طور پر یہاں پیش کیے جارہے ہیں اس سے ہمیں ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کی وسعت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

جدول میں دیے گئے اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماچل پردیش؛ آندھرا پردیش؛ مدھ پردیش؛ ہریانہ اور تامل ناڈو ایسی ریاستیں ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم میں داخلہ لینے والے طلبہ کی کل تعداد میں سے تقریباً ایک چوتھائی طلبہ فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان ریاستوں کے بعد دہلی؛ مہاراشٹر اور کیرالہ میں بھی فاصلاتی طرز تعلیم سے پڑھنے والوں کی ایک اچھی تعداد (17%- 10%) موجود ہے۔ اور کم و بیش تقریباً تمام ریاستوں میں فاصلاتی طرز سے اعلیٰ تعلیم کے خواہاں طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ خصوصی طور پر ہماچل پردیش، آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش، ہریانہ، تامل ناڈو، دہلی اور مہاراشٹر وغیرہ ایسی ریاستیں ہیں جہاں فاصلاتی نظام تعلیم کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں اور ایک اچھی تعداد میں طلبہ اس طرز تعلیم سے مستفید ہو رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسا نظام تعلیم ہے جو اپنے لچیلے پن کے سبب کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پیدا کرتا اور اس طرز تعلیم سے حصول تعلیم میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوتی۔ اگر ہم پچھلی دہائی کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کا تناسب ہمارے ملک میں تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ امید ہے کہ اگلی دہائی تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد موجودہ تناسب سے دوگنی ہو جائے گی۔ جس میں فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک خصوصی کردار رہے گا۔ اگر یہ بات کہی جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ فاصلاتی طرز تعلیم ہی ایک ایسا متبادل ہے جس کے ذریعے ہم بغیر کسی سماجی، نفسیاتی اور معاشرتی رکاوٹوں کے سبھوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کر سکتے ہیں۔ اور اس طرز تعلیم کے ذریعے سب کے لیے تعلیم ان کے دروازوں تک مہیا کرا سکتے ہیں۔ اس طرز تعلیم سے خصوصاً وہ لوگ مستفید ہو رہے ہیں جو کسی سبب تعلیم سے منقطع ہو چکے ہیں مثلاً اسکول ڈراپ آؤٹس، گھریلو خواتین؛ متعدد ایسے پیشہ ورانہ لوگ جو وقت کی کمی کے سبب اپنی من چاہی تعلیم حاصل نہیں کر پا رہے ہیں۔ یا ایسے لوگ جن کا داخلہ ریگولر کالجوں یا یونیورسٹیوں میں نشستوں کی کمی کے سبب نہیں ہو پا رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے یہ طرز تعلیم ایک عطیہ ہے جو انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع فراہم کر رہا ہے۔

لیکن اس درمیان فاصلاتی نظام تعلیم کے تعلق سے ایک نئی چیز ابھر کر آئی ہے وہ یہ کہ حالیہ برسوں میں فاصلاتی تعلیم کے میدان میں مکمل رہنما اصول کی کمی اور سخت قانون کی عدم موجودگی کے سبب بہتیرے ایسے ادارے کود پڑے ہیں جو نہ صرف تعلیم کے معیار کو نقصان پہنچا رہے ہیں بلکہ فاصلاتی نظام تعلیم کے اداروں کے معیار پر ایک سوالیہ نشان کھڑا کر رہے ہیں۔ ان غیر معروف فاصلاتی طرز کے اداروں کے فارغین کے لیے اکثر برانڈ ایکوٹی کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے جو فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے خوش آئند نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارا رسمی تعلیمی نظام بڑھتی ہوئی اعلیٰ تعلیم کی مانگ کو پورا کرنے سے قاصر ہے چنانچہ ایسی متعدد مثالیں ہیں جہاں روایتی طرز کی یونیورسٹیاں Dual mode یعنی رسمی طرز تعلیم کے ساتھ ساتھ فاصلاتی طرز تعلیم کو اپناتے ہوئے مختلف اکیڈمک پروگرام پیش کر رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ یونیورسٹیاں ایسی بھی ہیں جنھوں نے معیار کی سطح کا معقول خیال نہیں رکھا ہے، نیز فاصلاتی نظام تعلیم کے لازمی اصولوں اور گائڈ لائنس کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ ادارے، جن میں متعدد پرائیوٹ یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں؛ غیر معیاری ڈپلومہ اور ڈگری فراہم کر رہی ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس میدان میں ایسے بھی ادارے ہیں جنھوں نے تعلیم کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اسی کے مد نظر اگنو کے ماتحت 1985 میں (DEC) Distance Education Council کا قیام عمل میں آیا تا کہ فاصلاتی طرز تعلیم سے منسلک طلبہ کے حقوق کی حفاظت کی جا سکے اور فاصلاتی تعلیم کے اداروں کی صحیح طور پر مانیٹرنگ ہو سکے۔ فاصلاتی نظام تعلیم کا سب سے Apex نگراں ادارہ ہے۔ حالیہ برسوں میں اس ادارے کی نوعیت ایک خودمختار ادارے کی ہو گئی تھی، لیکن چند دنوں پہلے اس ادارے کی خود مختاری منسوخ کر دی گئی ہے اور اس کا انضمام اب یو جی سی میں ہو گیا ہے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ فاصلاتی نظام تعلیم کی مختلف رکاوٹوں اور دیگر مالی و اقتصادی بندشوں کا ایک بہتر متبادل ہے۔ عوام دوست؛ غریب دوست، کفایتی، سماج کے ہر طبقے کے لیے مناسب اور سہل الحصول ہونے کی وجہ سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم کے تمام وسائل مثلاً اسکولوں اور کالجوں کے لیے ڈھانچہ / بلڈنگ فنڈس کی کمی اور تربیت یافتہ اساتذہ اور دیگر کارکنوں کی عدم دستیابی اور تمام متعدد رکاوٹوں اور اقتصادی تجدید کی چنوتیوں کو قبول کرتے ہوئے دستیاب بنیادی تعلیمی ڈھانچہ (انفرااسٹرکچر) اور دیگر وسائل کو بخوبی منظم کرتا ہے اور انھیں دستیاب موجودہ وسائل کو دوبارہ استعمال کرتے ہوئے ان لوگوں کے لیے اکیڈمک پیکیج فراہم کرتا ہے۔ جو کسی وجہ سے روایتی تعلیمی نظام کا فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں، یا فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں۔ اس طرح سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فاصلاتی تعلیم ہمارے ملک کی تعلیمی اصلاح میں بخوبی تعاون کر رہی ہے۔ جو ہمارے ملک کی تعلیمی پالیسی میں ایک خصوصی تبدیلی کہی جا سکتی ہے۔

■

Dr. Mohd Ahsan, Regional Director, Regional Centre, Maulana Azad National Urdu University-(Bhopal)

خاور نقیب

اڑیسہ میں اردو کا ادبی و تہذیبی پس منظر

اڑیسہ اردو کے اہم مراکز سے الگ تھلگ ایک دورافتادہ صوبہ ہے۔ اڑیا یہاں کی حاوی زبان ہے مگر یہ صوبہ اردو زبان وادب کی صدیوں پرانی تاریخ بھی رکھتا ہے۔ جہاں تک اڑیسہ میں ادبی شخصیتوں کی آمد و رفت کا تعلق ہے اس سلسلے میں سب سے اہم نام عبدالقادر بیدل کا ہے/ جن کے طرزِ سخن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا:

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

عطا کاکوی نے 'حیرت زار' میں سید سلیمان ندوی کے حوالے سے تحریر کیا ہے''عبدالقادر بیدل کی سیاحت کا مشرقی نقطہ اڑیسہ کا شہر کٹک ہے۔ جہاں اس زمانے میں مولانا یعقوب چرخی کے پوتے خان دوراں سید محمود صوبے دار تھے۔''(1)

بیدل کی اڑیسہ آمد کے متعلق ساحل احمد نے اپنی کتاب 'غزل پس منظر اور پیش منظر' میں لکھا ہے''مرزا عبدالقادر بیدل بھی ایسے ہی شاعر ہیں جنھوں نے فارسی نظم ونثر میں اجتہادی روش اختیار کی۔ 1071 میں جب وہ اپنے چچا مرزا قلندر کے ساتھ اڑیسہ میں قیام پذیر تھے۔ شیخ سعدی کی پیروی میں شعر کہنے کی ابتدا کی۔''(2)

اُڑیسہ میں اردو شاعری کا آغاز شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ہوا۔ تحقیقی استناد کی رو سے لالہ ہردی رام جودت کو اڑیسہ کا اولین اردو شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ پروفیسر کرامت علی کرامت نے اپنے تحقیقی مضمون 'اردو اور اڑیا کے باہمی تعلقات اور ان کے مسائل' (مطبوعہ، سووینیر، بزم سخن، کٹک) میں تذکرۂ گلزارِ ابراھیم کے حوالے سے جودت کو اڑیسہ میں اردو کا قدیم شاعر قرار دیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری نے اپنی گراں قدر تصنیف 'اڑیسہ میں اردو' میں تذکرۂ شورش، تذکرۂ عشقی، گلزارِ ابراھیم اور ڈاکٹر جاوید نہال کی کتاب 'انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب' سے ماخوذ حوالہ جات کی روشنی میں جودت کو اڑیسہ کا پہلا اردو شاعر ثابت کیا ہے

اُڑیسہ میں اردو شاعری کا آغاز شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ہوا۔ تحقیقی استناد کی رو سے لالہ ہردی رام جودت کو اڑیسہ کا اولین اردو شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ پروفیسر کرامت علی کرامت نے اپنے تحقیقی مضمون 'اردو اور اڑیا کے باہمی تعلقات اور ان کے مسائل' (مطبوعہ، سووینیر، بزم سخن، کٹک) میں تذکرۂ گلزارِ ابراہیم کے حوالے سے جودت کو اڑیسہ میں اردو کا قدیم شاعر قرار دیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری نے اپنی گراں قدر تصنیف 'اڑیسہ میں اردو' میں تذکرۂ شورش، تذکرۂ عشقی، گلزارِ ابراہیم اور ڈاکٹر جاوید نہال کی کتاب 'انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب' سے ماخوذ حوالہ جات کی روشنی میں جودت کو اڑیسہ کا پہلا اردو شاعر ثابت کیا ہے۔ ان ماخذات کے علاوہ ہردی رام جودت کا ذکر گلشنِ ہند، یادگارِ شعرا، نسخۂ دل کشا، سخن شعرا اور تاریخ ادب ہندوستانی میں ملتا ہے۔

'گلشنِ ہند' کے مولف سید حیدر بخش حیدر رقم طراز ہیں: ''جودت تخلص، نام ہردی رام، ساکن کٹک، طبع اچھی رکھتے تھے۔'' (3) مشہور زمانہ یورپین مستشرق ڈاکٹر اشپرنگر جو شاہِ اودھ کے کتب خانوں میں دو سال تک فہرست سازی کی خدمات انجام دے کر 1850 میں اپنے وطن لوٹ گئے تھے۔ انھی کی مرتبہ فہرست کی جلد اوّل (انگریزی زبان میں) 1854 میں شائع ہوئی۔ مذکورہ فہرست کا پہلا باب شعرائے اردو کے تذکروں پر مشتمل ہے جس کا ترجمہ طفیل احمد نے 'یادگارِ شعرا' کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ تذکرہ 1943 میں الہ آباد سے شائع ہوا۔ 'یادگارِ شعرا' کی فہرست میں جودت کا شمار نمبر 338 ہے۔ لیکن اشپرنگر نے جودت کے نام اور سکونت کے متعلق قدرے مختلف باتیں درج کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''جودت، رائے ہردے رام دیارام، ساکن دہلی، عشقی ان کو مرشدآباد کا بتلاتے ہیں۔ اصل میں یہ کٹک کے تھے اور علی ابراہیم کے دوست تھے۔''(4) 'نسخۂ دل کشا' (مؤلفہ، جے مترا ارمان) کے مطابق 'جودت تخلص، نام ہردی رام، باشندے مرشدآباد کے مگر اصل میں ان کا وطن کٹک تھا اور سرکار میں نواب علاء الدولہ کی توسل رکھتے تھے اور اسی زمانے میں شاہ عالم بادشاہ کے انتقال کیا۔''(5) بنگال کی ادبی تاریخ میں عبدالغفور نساخ کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ وہ اپنے تذکرے 'سخن شعرا' میں رقم طراز ہیں 'جودت تخلص' ہردے رام مرشدآبادی، شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں نواب علاوالدولہ کی سرکار میں توسل رکھتے تھے۔ وطن ان کا کٹک ہے'' (6) نساخ کا یہ تذکرہ پہلی بار 1291ھ مطابق 1874 میں نول کشور پریس میں شائع ہوا

تھا۔ اس کی فہرست میں جودت کا شمار نمبر 391 ہے اور کل شعرا کی تعداد 2438 ہے۔ مشہور عالم فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کی ضخیم کتاب 'تاریخ ادب ہندوستانی' کی تین جلدوں میں سے پہلی جلد رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ کے زیر اہتمام 1839 میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اور اس کی دوسری جلد 1846 میں طبع ہوئی۔ بعد ازاں دتاسی نے ان تینوں حصوں کو ملا کر (اضافہ شدہ) ایڈیشن شائع کیا۔ اہم بات تو یہ ہے کہ مذکورہ جلدوں کا اردو ترجمہ فرانسیسی خاتون لیلیان نذر د نے کیا ہے 'تاریخ ادب ہندوستانی' کے ترجمہ شدہ نسخے کی فہرست میں جودت کا نمبر شمار 573 ہے۔ ان تحقیقی شہادتوں کے باوجود جہاں تک جودت کے شعری سرمایے کا تعلق ہے اس کا ایک بڑا حصہ آج بھی پردۂ خفا میں ہے جب کہ وہ اردو اور فارسی کے ایک طباع شاعر تھے۔ بقول سید غلام حسین شورش 'شاعر فارسی، فاضل جید گاہے بسببِ دوستی میر محمد حیات و بصلاح ایں احقر شعر ریختہ ہم فی فرمودند' (7) اوپر ذکر کیے گئے بعض تذکروں میں جودت کی ایک رباعی اور ایک عدد شعر بہ طور نمونہ درج ہیں۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

برنگ شمع سوزاں دل سے میرے آہ نکلے ہے
الٰہی شکر کرتا ہوں کہ خاطر خواہ نکلے ہے

اڑیسہ کا ساحلی قصبہ کرشنا نند پور (پرگنہ بالوبیسی) اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں اڑیسہ کے قدیم صاحبِ دیوان شاعر شیخ امین اللہ چرخی نے گیسوئے سخن کی مشاطگی کا فریضہ انجام دیا۔ چرخی کے انتقال کے بعد مولوی عبدالرشید قاصر نے 15 اکتوبر 1907 کو رضوانی پریس (کلکتہ) میں 'دیوانِ چرخیؔ' چھاپ کر شائع کیا۔ 227 غزلوں پر مشتمل اس دیوان کی کتابت ماہ لکھنوی نے کی تھی۔ چرخی کا سالِ وفات ان کے متبنیٰ فرزند منشی عبدالمجید کے اس شعر سے نکلتا ہے:

نحیف عبدالمجید را ایں دعا خدایا قبول فرما
کہ نام چرخی مدام باشد بنام نیکو بد ہر باقی
1296ھ مطابق 1879

دیوانِ چرخی کی اشاعت سے تین سال قبل 1904 میں 40 صفحات پر مشتمل ایک شعری گلدستہ کلکتہ کے برکتی پریس میں طبع ہوا تھا۔ جس کا حصہ اول 'اشرف انجمن' اور حصہ دوم 'اظہار العشق' کے نام سے موسوم تھا۔ اس گلدستے کا ذکر پروفیسر منظر حسن دسنوی نے اپنے مضمون 'دیوانِ چرخی کا مطبوعہ نسخہ' (مطبوعہ، ہماری زبان، نئی دہلی، 8 ستمبر 1979) میں کیا ہے۔

مولوی محمد سلطان راجی دکن کو خیرباد کہہ کر انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں کٹک میں سکونت پذیر تھے۔ ان کی شاعری میں تصوف و معرفت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ راجی کی کئی کتابیں مطبع مظہر العجائب (مدراس) اور مطبع مظہر النصائح (کٹک) میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔ ان کی ایک کتاب 'مجموعہ خطبہ ہائے دوازدہ ماہی' (سنہ طباعت 1286ھ) کے متعلق حفیظ اللہ نیولپوری رقم طراز ہیں ''مذکورہ بالا کتاب میں مشتمل ہر خطبہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کا پہلا حصہ عربی میں اور دوسرا حصہ اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہوا ہے جس سے مولوی سلطان راجی کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔'' (8)

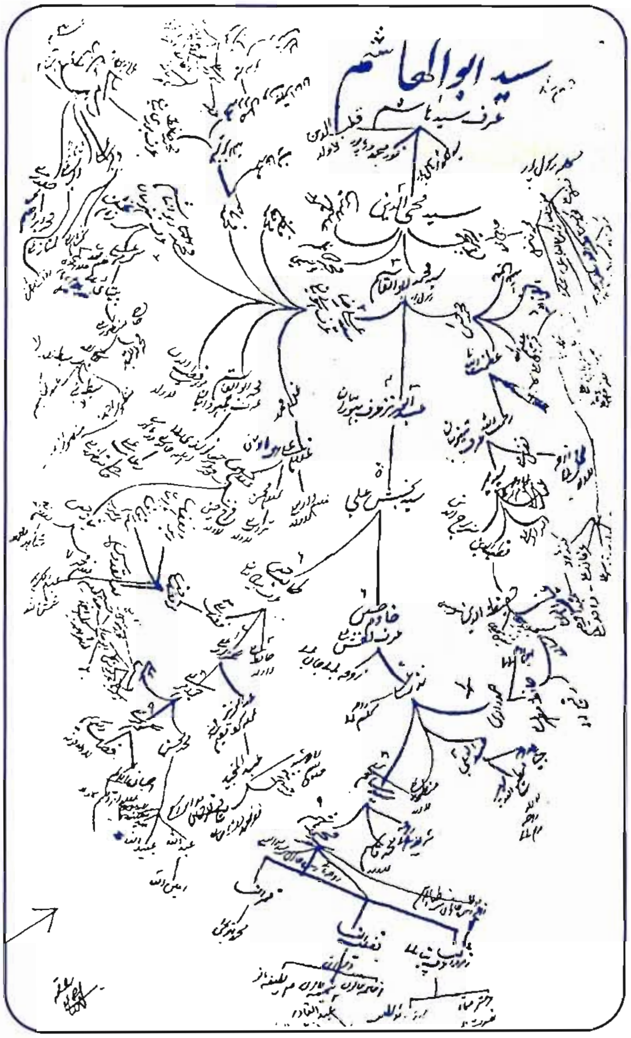

شجرہ نویسی کا قدیم نمونہ

اڑیسہ کے ایک اور صاحبِ دیوان شاعر عبدالمجید بھویاں حیا کا تعلق بالیسر کے بھویاں خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ نے اورنگ زیب عالم گیر کے عہدِ حکومت میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اڑیسہ کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب نے اپنی کتاب 'تاریخ اڑیسہ' میں اس خاندان کا ذکر کیا ہے۔ حیا کا نعتیہ دیوان 'دیوانِ مجید' اڑیسہ کے شعری ادب میں نمایاں مقام رکھتا ہے جو نول کشور پریس میں شائع ہوا تھا۔ حیا کے مندرجہ ذیل شعر سے دیوان ہٰذا کا سالِ تکمیل مترشح ہے:

یازدہ ماہِ دسمبر عیسوی تاریخ میں
اے حیا یہ ختم ہے بامنفعت دیواں مجید
1871

کرامت علی کرامت نے 'آبِ خضر' (مطبوعہ اگست 1993) میں عبدالمجید بھویاں حیا کا کلام اور تذکرہ شامل کیا ہے۔

سید عبدالعزیز معلم سمبل پوری کا شمار اڑیسہ کے نغز گو شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کو امیر مینائی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ معلم سمبل پوری کا دیوان 'کاخِ سخن' الموسوم بہ 'نغمۂ یادگار' 1331ھ مطابق 1911 میں مطبع آگرہ اخبار میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا تھا۔ مذکورہ دیوان کی تقریظ داغ دہلوی کے شاگرد مولوی عبدالعزیز خاں عزیز نے لکھی تھی۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے ''جناب مولوی سید محمد عبدالعزیز المتخلص بہ معلم سمبھل پوری شاگرد، استاد مسلم الثبوت طوطیِ معجز بیاں حضرت امیر مینائی لکھنوی مرحوم دیوانے مرتب نمود۔'' (9)

ایک ہزار پانچ سو چالیس اشعار پر مشتمل 'کاخِ سخن' کا سالِ طباعت مندرجہ ذیل اشعار سے نکلتا ہے:

فیض نے یوں دو سالِ طبع کہا	نغمۂ یادگار، کاخِ سخن
	1331ھ 1331ھ
	(جگن ناتھ پرشاد فیض)

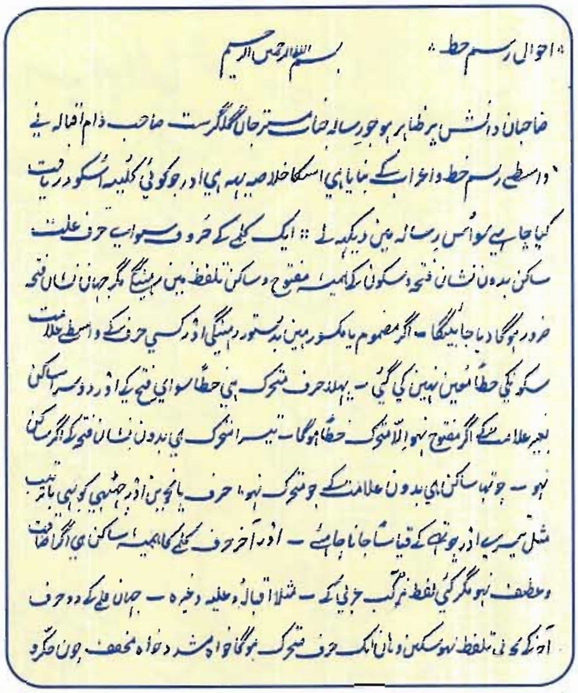
احوال رسم خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صاحبان دانش پر ظاہر ہو کہ رسالہ جناب مسٹر جان گلکرسٹ صاحب دام اقبالہ نے
واسطے رسم خط و اعراب کے بنایا ہے اسکا خلاصہ یہہ ہے اور جو کوئی کلیہ اسکو دریافت
کیا چاہے سو اس رسالہ میں دیکھ لے :: ایک کلمے کے حروف سوائے حرف علت
ساکن بدون نشان فتحہ و سکون کے ہمیشہ مفتوح و ساکن تلفظ میں رہینگے مگر جہاں نشان فتحہ
ضرور ہوگا دیا جاویگا – اگر مضموم یا مکسور ہیں بدستور رہینگے اور کسی حرف کے واسطے علامت
سکون کی حاجت نہیں کی گئی – پہلا حرف متحرک ہی حتما سوائے فتحہ کے اور دوسرا ساکن
بغیر علامت کے اگر مفتوح ہو الا متحرک حتما ہوگا – تیسرا متحرک ہی بدون نشان فتحہ کے اگر ساکن
ہو – چوتھا ساکن ہی بدون علامت کے جو متحرک ہو، حرف پانچویں اور چھٹے کو بھی باترتیب
مثل تیسرے اور چوتھے کے قیاس کیا جانا چاہئے – اور آخر حرف کلمے کا ہمیشہ ساکن ہی اگر اضافت
و عطف نہو مگر کوئی لفظ مرکب جزئی کہ – مثلاً اقبالہ وعلیہ وغیرہ – جہاں ملکے دو حرف
آخر کلمے کی تلفظ ہو سکیں وہاں ایک حرف متحرک ہوگا خواہ مشدد خواہ مخفف جوں حکرد

قلمی نسخہ باغ اردو الموسوم بہ گلستان سعدی کا ایک صفحہ

زباں سے ہر سخن ور کے یہ نکلے	بہارِ بے خزاں کا رخ سخن ہے
	1331ھ
(شیدا مانک پوری)	
شرر تاریخ اس کی از سرِ نو	لکھو، پھولا گلستانِ سخن ہے
	1331ھ
(سید عبدالعلیم شرر سکندر آبادی)	

معلم کے مذکورہ دیوان پر راقم السطور کا ایک تفصیلی مضمون 'فکر و تحقیق' (نئی دہلی)، (شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2001) میں شائع ہو چکا ہے۔

نجم الشعرا امجد نجمی کے والد محمد یوسف یوسف صرف شاعر ہی نہیں بلکہ خوش اسلوب ناول نگار بھی تھے۔ ان کا دیوان دس ہزار اشعار پر مشتمل تھا جو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں تلف ہوگیا۔ مالک رام نے سہ ماہی 'تحریر' کے باب وفیات میں لکھا ہے ''مدتوں ان کا اپنا کلام دامن گل چیں اور پیام یار میں چھپتا رہا۔ مجموعہ بھی 'نکہتِ یوسف' کے نام سے تیار تھا۔ لیکن آخری ایام کی علالت اور بے خبری کے دوران میں ضائع ہوگیا۔''(10) اس ضمن میں عرض ہے کہ 'آبِ خضر' کے بابِ تذکرہ میں 'نکہتِ یوسف' کی بجائے 'نکہتِ باغِ یوسف' درج ہے۔ کرامت علی کرامت کے الفاظ میں ''امجد نجمی صاحب نے اپنے والد ماجد کے ادبی خطوط کو 'نکہتِ باغِ یوسف' کے نام سے جمع کیا ہے۔''(11)

کرامت علی کرامت کے والد مولوی رحمت علی رحمت 1891 میں اپنے آبائی مکان واقع رسول پور (سونگڑہ) میں پیدا ہوئے۔ آپ ریاضی داں ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ طرز نثار اور خوش گفتار شاعر بھی تھے۔ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' کا اڑیا میں ترجمہ کیا تھا اور 1913 میں دقیق موضوع پر ایک کتاب 'رفیق العقل' لکھی تھی۔ اس کا مسودہ ہنوز غیر طبع ہے لیکن ان کی بیاض جو کرم خوردگی کے سبب انتہائی خستہ حالت میں تھی۔ راقم نے اس کی ایک نقل مفید حواشی اور ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ تیار کی ہے جو ان دنوں کرامت صاحب کی تحویل میں ہے۔ اڑیسہ کے قدیم مخطوطات میں 'فرہنگِ جانی' (فارسی) کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس فرہنگ کے مصنف جان محمد صدیقی قصبہ بھرمر پور (کٹک) کے باشندے تھے۔ 401 صفحات پر مشتمل اس قلمی نسخے کا زمانہ تحریر 1164ھ (1183ھ عملی) ہے۔ جس کی کتابت خود مصنف نے کی تھی۔ جان محمد نے مذکورہ فرہنگ کو جگ موہن دیو ولد دیارام دیو کے نام معنون کرنے کے علاوہ حقِ ملکیت بھی انہی کے نام محفوظ کیا ہے۔ 'فرہنگِ جانی' کا ذکر اڑیسہ کے کئی مقالہ نگاروں نے اپنے مضامین میں کیا ہے خصوصاً حفیظ اللہ نیولپوری نے اس پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ فرہنگ کے اختتام پر یہ اشعار درج ہیں:

بحمد اللہ کہ ایں فرہنگ جانی	نوشتم در زمانِ زندگانی
کہ تا باشد پس از من یادگارے	دریں عالم بر ہبر خواستگارے
بخود نفعی اگر از من رسانند	پے نفعم یکے الحمد خوانند
(1183ھ)	

اڑیسہ میں اردو تہذیب و ثقافت کا ایک اور اہم حوالہ 'مغل تماشا' ہے۔ اس کے مصنف بنسی بلبھ گوسوامی 1728 میں پیدا ہوئے۔ یہ فوک ڈراما اٹھارہویں صدی کی تخلیق ہے۔ جس کی حاوی زبان تو اردو ہے لیکن بعض کردار اور ماحول کی مناسبت سے اس میں جا بہ جا فارسی، ہندی اور بنگلہ زبانوں کی لفظیات بھی برتی گئی ہیں۔ اس کی عوامی مقبولیت کا اندازہ یوں کیجیے کہ یہ ڈراما آج بھی اسی کھلے ڈلے انداز میں اسٹیج کیا جاتا ہے جو اس کی دو سو سالہ روایت رہی ہے۔

ماضی میں کئی تھیٹریکل کمپنیوں اور مسلم ڈراماٹک ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام اڑیسہ کے کئی علاقوں میں منشی امانت، آغا حشر کشمیری اور امجد نجمی کے علاوہ دیگر تمثیل نگاروں کے ڈرامے اسٹیج کیے گئے جن سے اڑیسہ میں اردو زبان کو عوامی سطح پر فروغ حاصل ہوا۔

اڑیسہ میں اردو صحافت کا آغاز ماہنامہ 'المنصور' سے ہوتا ہے۔ اس کا اجرا سونگڑہ کے جید عالم دین سید محمد عمر نے 1931 میں کیا۔ آگے چل کر مولانا فضل الرحمن قاسمی نے ہفت روزہ 'مسلم گزٹ' مولانا عبدالرشید نقاد نے ہفتہ وار 'دورِ جدید' اور محمد عبدالدیان نے ہفتہ وار 'بیداری' جاری کیا۔ ان اخبار و رسائل کے مدیران نے سرزمین اڑیسہ میں اردو صحافت کی بہ طرزِ احسن آبیاری کی۔

اڑیسہ میں اردو صحافت کا آغاز ماہنامہ 'المنصور' سے ہوتا ہے۔ اس کا اجرا سونگڑہ کے جید عالم دین سید محمد عمر نے 1931 میں کیا۔ آگے چل کر مولانا فضل الرحمٰن قاسمی نے ہفت روزہ 'مسلم گزٹ' مولانا عبدالرشید نقاد نے ہفتہ وار 'دورِ جدید' اور محمد عبدالدیان نے ہفتہ وار 'بیداری' جاری کیا۔ ان اخبار و رسائل کے مدیران نے سرزمین اڑیسہ میں اردو صحافت کی بہ طرزِ احسن آبیاری کی۔ جس کی

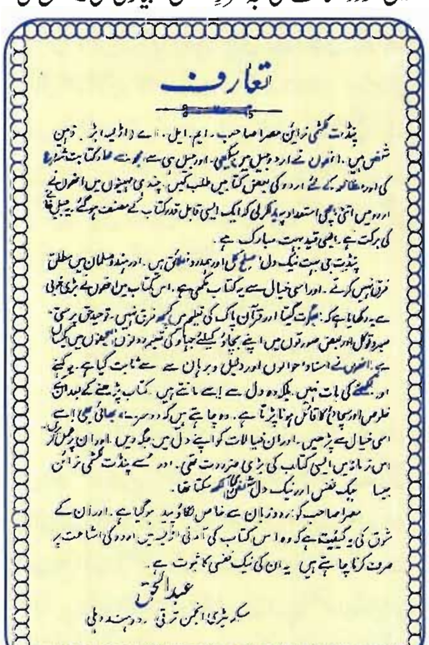
تعارف

پنڈت لکشمی نراین مصرا صاحب۔ ایم۔ ایل۔ اے (اڑیسہ) بڑے ذہین شخص ہیں۔ انھوں نے اردو جیل ہی میں سیکھی۔ اور جیل ہی سے مجھ سے عارضی کتب شعرا کی اور مطالعہ کے لئے اردو کی بعض کتابیں طلب کیں۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے اردو میں اتنی اچھی استعداد پیدا کرلی کہ ایک ایسی قابل قدر کتاب کے مصنف ہوگئے۔ یہ جیل خانے کی برکت ہے۔ ایسی قید بہت مبارک ہے۔

پنڈت جی بہت نیک دل، صلح کل اور ہمدرد خلائق ہیں۔ اور ہندو مسلمان میں مطلق فرق نہیں کرتے۔ اور اسی خیال سے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بڑی خوبی سے یہ دکھایا ہے کہ بھگوت گیتا اور قرآن پاک کی تعلیم میں کچھ فرق نہیں۔ توحید حق پرستی صبر و توکل اور بعض صورتوں میں اپنے بچاؤ کیلئے جہاد کی تعلیم دونوں کتابوں میں یکساں ہے۔ انھوں نے اسناد، حوالوں اور دلیل و براہان سے ثابت کیا ہے۔ یہ کہنے اور لکھنے کی بات نہیں۔ بلکہ وہ دل سے ایسے مانتے ہیں۔ کتاب پڑھنے کے بعد انکے خلوص اور سچائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھائی بھی اسے اسی خیال سے پڑھیں۔ اور ان خیالات کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ اور ان پر عمل کریں۔ اس زمانہ میں ایسی کتاب کی بڑی ضرورت تھی۔ اور مجھے پنڈت لکشمی نراین جیسا نیک نفس اور نیک دل شخص ہی لکھ سکتا تھا۔

مصرا صاحب کو اردو زبان سے خاص لگاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ اور ان کے شوق کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اس کتاب کی آمدنی اڑیسہ میں اردو کی اشاعت پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی نیک نفسی کا ثبوت ہے۔

عبدالحق
سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند دہلی

کتاب بھگوت گیتا کا ایک صفحہ

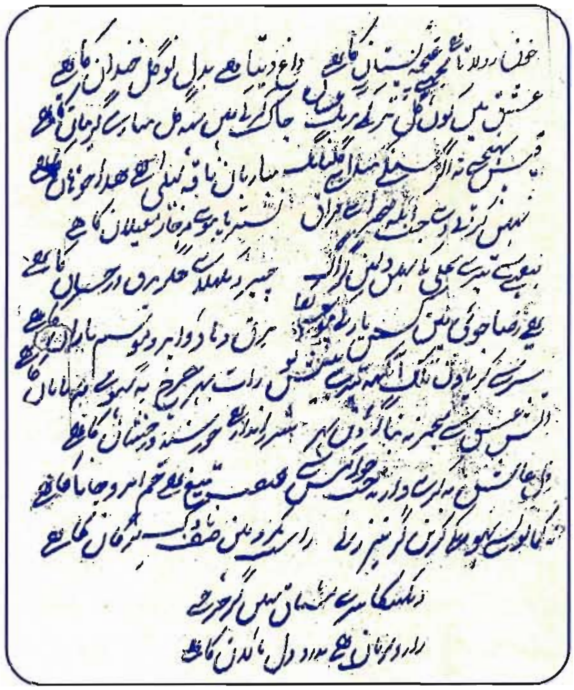

عکس تحریر امین اللہ چرخی

بدولت اڑیسہ میں اردو صحافت کے رجحان کو بڑھاوا ملا۔

اڑیسہ میں فارسی اور اردو کے قدیم مخطوطات، دواوین اور دیگر قلمی نسخوں کی تلاش و بازیافت کے سلسلے میں کرامت علی کرامت اور حفیظ اللہ نیولپوری کی کاوشیں قابلِ صد تحسین ہیں۔ بعد ازاں یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی اور اوائل 1994 میں اڑیسہ کے نامور مجاہدِ آزادی مولانا سید محمد اطہر (1914-1974) کی خودنوشت جیل ڈائری کا سراغ ملا۔ جو انتہائی خستہ حالت میں تھی۔ اس کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے اس کے متن کو کرونولوجیکل آرڈر کے تحت مرتب کیا جو 1995 میں 'سلاخوں کے پیچھے' کے نام سے شائع ہوا۔ آگے چل کر 2004 میں ایک ایسا نسخہ ہاتھ آیا جو اڑیسہ میں تدوین و تالیف کی ابتدا اور اس کے عہد کے تعین میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ قلمی نسخہ شیخ سعدی کی کتاب 'گلستانِ بے خزاں' کا اردو ترجمہ بہ عنوان 'باغِ اردو الموسوم بہ گلستانِ ہندی' کا مسودہ ہے لیکن یہ بات نشانِ خاطر رہے کہ شیخ سعدی کی مذکورہ کتاب کا اردو ترجمہ شیر علی افسوس نے جان گل کرسٹ کی فرمائش پر مارکوئیس ویلزلی گورنر جنرل بہادر کے لیے کیا تھا مگر یہ کتاب نایاب ہوجانے کے سبب سید قاسم علی المتوطن قصبہ سونگڑہ نے اس کے متن کی از سرِ نو شیرازہ بندی کی جس کی تکمیل 29 صفر 1207 عملی کو ہوئی۔ 205 صفحات پر مشتمل 'باغِ اردو' کا قلمی نسخہ میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

اڑیسہ کے بعض قدیم شعرا کو قطعاتِ تاریخ کہنے پر عبور حاصل تھا۔ ان تاریخ گو شعرا میں منشی عبدالرحیم احسن، غلام حسین حسینی، عبدالعزیز شاہ، محمد سلطان راحی، عبدالرحیم واعظ، عبدالغفور غفور، سید امداد حسین وغیرہ کے نام خاصے اہم ہیں۔ اڑیسہ کے جن مساجد و مقابر میں سنگی کتبات نصب ہیں ان کی تاریخی اہمیت تو مسلم ہے ہی ساتھ ہی وہ قطعاتِ تاریخ جو یہاں کی قدیم مطبوعات کے سالِ تصنیف و تالیف اور سنہ طباعت اور اہم شخصیتوں کے سالِ وفات کے پیشِ نظر کہے گئے ہیں ان کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نمونے کے طور پر دو قطعات حسب ذیل ہیں:

یا دم بود زبانِ وفاتش ازیں سبب
ہاتف بگوش خاطرِ من گفت آنچناں
حدِّ تو احسنا ز سرِ بندگی مگر
جائے بزرگ یافت در بزم نوریاں

1311ھ

(تاریخ وفات حاجی ضامن علی از عبدالرحیم احسن سونگڑوی)

ادب کن سجدہ گاہے ذوالمناں است
ز عبداللہ بنا بابِ الجناں است
ز ہاتف خواستم تاریخ سالش
ملک گفتہ ایں شرف المکاں است

1269ھ

(تاریخ بنا جامع مسجد، دریاپور از غلام حسین حسینی)

تصنیف و تالیف کے پہلو بہ پہلو اڑیسہ کے بیشتر مقامات خصوصاً سونگڑہ، کٹک، معصوم پور، بالوبیسی، سمبل پور، بھدرک، محی الدین پور وغیرہ شہر و قصبات کے باذوق افراد بیاض نگاری اور شجرہ نویسی کی شستہ قدروں کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ خصوصاً بیاض نگاری یہاں کی خانگی اردو تہذیب کا ایک ناگزیر حصہ تھی۔ اس سلسلے میں خواتین کی مرتبہ ذاتی بیاضیں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ اس نوع کی دریافت شدہ بیاضوں میں مقامی اور بیرونی شعرا کے صوفیانہ کلام، قصائد و مراثی، غزلیات، سہرے اور لوک گیت کے علاوہ اقوال و لطائف کے نادر نمونے ملتے ہیں۔

اڑیسہ میں شجرہ نویسی کا سب سے قدیم اور اہم نمونہ ساداتِ سونگڑہ کا وہ خاندانی شجرہ ہے جس کا سلسلہ سیدنا ابوالہاشمؒ سے شروع ہوتا ہے۔ جو نجف اشرف سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوگئے تھے۔ کرامت صاحب نے خاندانِ سادات کے ایک اور سلسلے کا بھی ذکر کیا ہے جو حضرت شاہ نور صاحب ولایتِ سہارنپور کے پوتے سید حسام الدین شاہ سے جاملتا ہے۔

پنڈت لکشمی نارائن مصرا سمبل پور کے برہمن خاندان سے تھے۔ انھوں نے 1921 میں ترکِ موالات کی تحریک میں حصہ لیا اور 1947 تک جنگ آزادی کے میدان میں وہ ایک مردِ مجاہد کی طرح ڈٹے رہے۔ انھوں نے 17 سال تک قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ پنڈت جی نے قید و بند کے ایام میں اردو سیکھی اور اک قلیل عرصے میں قرآنی احکام اور شریمد بھگوت گیتا کے شلوکوں کا تقابلی مطالعہ اپنی تصنیف 'بھگوت گیتا' میں پیش کیا۔ اس کتاب میں 'تعارف' کے عنوان سے بابائے اردو مولوی عبدالحق (جو ان دنوں انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری تھے) رقم طراز ہیں ''پنڈت لکشمی نارائن مصرا ایم ایل اے (اڑیسہ) بڑے ذہین شخص ہیں۔ انھوں نے اردو جیل میں سیکھی اور جیل ہی سے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور مطالعہ کے لیے اردو کی بعض کتابیں طلب کیں۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے اردو میں اتنی اچھی استعداد پیدا کرلی کہ ایک ایسی قابلِ قدر کتاب کے مصنف ہوگئے...'' (12)

سعید رحمانی نے اپنے مضمون 'اڑیسہ میں اردو' (مطبوعہ اردو دنیا، شمارہ 8 اگست 2012) میں مولوی عبدالحق کے مذکورہ بالا 'تعارف' کو 'دیباچہ' بتایا ہے جو سراسر غلط ہے۔ جب کہ 'بھگوت گیتا' کا پیش لفظ اس کتاب کے اعزازی ناشر ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب نے لکھا تھا۔

غرض کہ صوبۂ اڑیسہ صدیوں سے اردو فارسی کلچر کا گہوارہ رہا ہے۔ اس مضمون میں جن شخصیات کا اختصار کے ساتھ ذکر آیا ہے اس کی حیثیت مشتے نمونہ از خروارے کی ہے اور انھی احوال و اذکار کے تناظر میں اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اڑیسہ جیسے دورافتادہ خطے میں اردو زبان و ادب اپنی تہذیب و تاریخ کے حوالے سے کتنی جان دار، ہمہ رنگ اور متنوع واقع ہوئی ہے!!

■

Khawar Naqeeb 'Tarweej', P.O. Kood, Sungra, Dist. Cuttack - 754221(Odisha)

شمالی ہند کی مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی

ابن کنول

شاعری میں غزل کے بعد مثنوی سب سے مقبول صنف رہی ہے۔ گزشتہ صدیوں میں اردو کے تقریباً سبھی غزل گوشعرا نے صنف مثنوی میں ضرور قسمت آزمائی کی ہے بلکہ دکن کے بیشتر شعرا کی شناخت تو ان کی مثنویوں ہی کی وجہ سے قائم ہے۔ نظامی کی 'کدم راؤ پدم راؤ' سے لے کر سراج اورنگ آبادی کی 'بوستانِ خیال' تک متعدد مثنویاں لکھی گئیں بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ دکن میں غزل سے زیادہ مثنویوں کی طرف توجہ دی گئی۔ وجہی کے علاوہ غواصی، مقیمی، ملک خوشنود، نصرتی، ابن نشاطی، طبعی، جنیدی، فائز، ہاشمی وغیرہ اپنی مثنویوں ہی کی وجہ سے اردو شاعری کی تاریخ کا اہم حصہ بنے ہوئے ہیں۔ شمالی ہند میں افضل کی 'بکٹ کہانی' سے مثنوی کی تاریخ کی ابتدا ہوتی ہے لیکن اٹھارہویں صدی میں جب باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز ہوجاتا ہے تو ہر شاعر مثنوی لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فائز، حاتم، آبرو کے بعد سودا، میر اور میر حسن جیسے شاعر صنف مثنوی کی نئی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دیگر شعرا مثلاً مصحفی، انشا، جرأت، میر اثر، رنگین، نسیم، مومن، مرزا شوق وغیرہ نے خاص طور سے صنف مثنوی میں طبع آزمائی کی۔ دراصل مثنوی ایسی صنف ہے جس میں اظہار کی بے پناہ گنجائش ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہوسکتے ہیں، جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، تخیل ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔ مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں سب اس میں آجاتے ہیں۔''

(شعرالعجم ص 247، جلد چہارم، مطبع معارف اعظم گڑھ، 1923)

حالی بھی مثنوی کو اصناف سخن میں سب سے کارآمد اور مفید صنف مانتے ہیں اس کی وجہ ہے کہ مثنوی کا حقیقی یا غیر حقیقی بیان اس عہد کی تہذیبی تاریخ کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ مثنویوں کے ذریعے کسی بھی عہد کے تمدنی خاکے تیار کیے جاسکتے ہیں جس قدر سچی اور واضح تہذیبی تصاویر مثنوی میں دکھائی دیتی ہیں کسی دوسری شعری صنف میں نہیں ملتیں۔ ہر داستان یا منظوم داستان یعنی مثنوی اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ ہوتی ہے۔ شمالی ہند میں لکھی گئی مثنویاں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی لکھنوی اور دہلوی معاشرت کی عکاس ہیں۔ باغ و بہار یا فسانۂ عجائب کی طرح سحرالبیان اور گلزار نسیم میں بھی ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ میر یا مصحفی کی مثنویاں ہوں یا مرزا شوق کی 'زہر عشق' میں ہندوستانی تہذیبی اقدار شعوری یا لاشعوری طور پر پیش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے طلسم ہوش ربا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''طلسم ہوش ربا ایک تہذیبی دستاویز ہے، اس لیے قابل احترام ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ میں لکھنؤ رچا بسا ہے اور لکھنؤ ہماری ہندوستانی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ اس میں سارے شمالی ہند کی تہذیب سمائی ہوئی ہے۔ اس میں بادشاہ کا تصور بھی خالص ہندوستانی ہے اور جادوگر بھی ہندوستانی ہیں۔ جادوگر تو جادوگر طلسم کے مسلمانوں تک کی روح ہندوستانی ہے کیونکہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔''

راہی معصوم رضا کا یہ بیان مثنویوں کی فضا پر بھی صادق آتا ہے۔ مثنویو ں کے شاہزادوں اور شاہزادیوں کا تعلق خواہ کسی بھی ملک سے ہو لیکن ان سب کا رہن سہن، رسم و رواج ہندوستان کی معاشرت کا حصہ ہیں۔ مثنویوں کی تہذیب دہلی، لکھنؤ یا فیض آباد کی حدود سے باہر نہیں جاپاتی۔

ازروئے قیاس یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مشرقی ممالک میں سب سے زیادہ رسمیں ہندوستانی میں رائج ہیں جس کا سبب یہاں بہت سے نسلی گروہ اور مختلف مذہبی عقائد کے افراد کی موجودگی ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کی بیشتر رسومات میں اس قدر یکسانیت ہے کہ بقول سید احمد دہلوی ''مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب ان کے مردوں میں جس قدر رسمیں مروج ہیں وہ تقریباً سب کی سب ہندوانی رسمیں ہیں جن میں بہت سی رسمیں توجوں کی توں ہیں۔'' مثنویوں میں ولادت سے لے کر وفات تک کی رسموں کا ذکر باقاعدگی کے ساتھ ملتا ہے۔ دراصل شاعری میں یہی ایک ایسی صنف ہے جس میں ہر قسم کے مضامین کو تفصیل سے بیان کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ سید امداد امام اثر عظیم آبادی نے اپنی تصنیف 'کاشف الحقائق' میں اس بات کا اظہار کیا ہے:

''مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہے ہر طرح کے داخلی اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں... یہ وہ صنف شاعری ہے جس میں شاعر شاعری کا کمال حسبِ مراد دکھلا سکتا ہے۔'' (کاشف الحقائق عرف بہارستان سخن لاہور، 1951، ص 299)

موضوعات کی پابندی نہ ہونے کے سبب شعرا نے روایتی قصے کہانیوں کے علاوہ دیگر موضوعات کو بھی مثنوی کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے سبھی شعرا نے طویل مثنویوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی قلمبند کی ہیں اور ان میں ہندوستانی معاشرت کی مختلف جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ فائز ہندوستانی تہذیب کے ایک منظر کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہر اک پنہا رواں کی اچھرا تھی
کنویں کے گرد اندر کی سبھا تھی
بیاں کیوں کر کروں ان کی میں رفتار
کروں تقریر کیا پچھن کی جھنکار
لے آتی تھی جھریا ایک سندر
لے جاتی تھی گگریا سیس پر دھر
سبن کی رنگ رنگ لہنگا و ساری
کنارے ان کے تھی ٹانکی کناری

میر مثنوی میں ہولی کا منظر بیان کرتے ہیں:

قمقمے جو گلال کے مارے
مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں
گل کی بتی ملا اڑاتے ہیں
جشن نو روزِ ہند ہولی ہے
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

مثنویوں میں ہندوستان کے مختلف تیوہاروں اور موسموں کا بیان ملتا ہے جگہ جگہ میلوں ٹھیلوں کا ذکر ہوتا ہے، اپنے اپنے عہد کی طرز معاشرت، محلات کی زندگی، عوامی رہن سہن، شادی بیاہ کی تقاریب و رسومات، زیورات وملبوسات غرضیکہ مختلف اقسام کے کھانوں تک کا ذکر مثنویوں میں موجود ہے جس طرح نثری داستانیں اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ بیان کرتی ہیں مثنویاں بھی باوجود شعری پابندیوں کے اپنے دور کی معاشرت کی عکاس ہیں۔ پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''مثنوی نگاروں نے اپنے شعری کارناموں میں اپنے عہد کے تہذیبی عناصر کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں ہمیں ایک گزشتہ تہذیب اور ایک مٹے ہوئے تمدن کی تصویریں نظر آتی ہیں۔'' (تاریخ ادب اردو جلد اوّل، 1998، ص 177)

کوئی بھی ایسی مثنوی جس میں کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے، اس قصے میں مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے کردار ہوتے ہیں، ان کرداروں کے اطراف کی زندگی ان کے عہد کی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے، وہ تمام رائج رسومات بھی ادا کرتے ہیں، توہم پرست بھی ہوتے ہیں، اپنے عقائد کی پاسداری بھی کرتے ہیں، سماجی تفریحات میں بھی شرکت کرتے ہیں جوش وخروش کے ساتھ تیوہار بھی مناتے ہیں اور موسموں کا لطف بھی اٹھاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی مثنوی اپنے عہد کے معاشرہ کی زندہ تصویر بن جاتیں ہے۔

شاید ہی دنیا کا کوئی علاقہ یا قوم ہو جو توہمات سے آزاد ہو، عرب مصر او ریونان وغیرہ کی طرح ہندوستان میں بھی زمانۂ قدیم ہی سے یہاں کے لوگ توہم پرست ہیں۔ مثنویوں میں جگہ جگہ اس کی مثالیں موجود ہیں:

کوئی بولی پری کے سائے تلے
آ گئی ہے کہیں یہ بال کھلے
کوئی بولی کہ دوڑ ہی جاؤ
مرچیں جاکر کہیں پڑھا لاؤ
کوئی بولی کہ صدقہ دو فی الحال
کوئی بولی دکھاؤ جاکر فال
کوئی بولی کہ بید کو لاؤ
اس کی ناڑی تو اُس کو دکھلاؤ
الغرض تھی بہت یہ ہانک پکار
نہ کھلے تھا کسی پہ یہ اسرار
کہ یہ نازک بدن جو کمھلائی
یک بہ یک اس پہ کیا بلا آئی

(مثنوی جذبۂ عشق از مصحفی ماخذ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں، ص 248)

ہندوستان کے توہم پرستانہ ماحول میں ایسے علوم سے عوام وخواص کو ابتدا ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ جن سے آدمی علم غیب سے باخبر ہو سکے انسان کے دل میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے ایسے علوم کا سہارا تلاش کیا جاتا ہے۔ ایسے علوم پر پورے ایشیا میں یقین کیا جاتا ہے بقول مشہور سیاح برنیر ''ایشیائی لوگ اکثر احکامِ نجوم کے ایسے معتقد ہیں کہ ان کے نزدیک کا کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جو کواکب وافلاک کی گردش پر منحصر نہ ہو اور اس لیے وہ ہر ایک کام میں نجومیوں سے مشورہ لیا کرتے ہیں۔'' (سفرنامہ برنیر ص 235)

موضوعات کی پابندی نہ ہونے کے سبب شعرا نے روایتی قصے کہانیوں کے علاوہ دیگر موضوعات کو بھی مثنوی کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے سبھی شعرا نے طویل مثنویوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی قلمبند کی ہیں اور ان میں ہندوستانی معاشرت کی مختلف جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

مثنویوں کے بادشاہوں اور شاہزادوں کے ساتھ بھی نجومی موجود ہیں۔ بادشاہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ نجومی اور پنڈتوں کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں سحر البیان میں شاہزادہ بے نظیر کی ولادت سے قبل نجومی، رمال اور پنڈت بیان کرتے ہیں:

نجومی و رمّال اور برہمن
غرض یاد تھا جن کو اس ڈھب کا فن
بلا کر انھیں شہ کنے لے گئے
جونہیں بروبہ روشہ کے سب وے گئے
نجومی بھی کہنے لگے در جواب
کہ ہم نے بھی دیکھی ہے۔۔۔ اپنی کتاب
نحوست کے دن سب گئے ہیں نکل
عمل اپنا سب کر چکا ہے زُحل
کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار
تو کچھ انگلیوں پر کیا پھر شمار
جنم پترا شاہ کا دیکھ کر
تلا اور برچھک پہ کر کر نظر
کہا: رام جی کی ہے تم پر دَیا
چندرماں سابالک ترے ہووے گا
و لیکن مقدر ہے کچھ اور بھی
کہ اس بھلے میں برے طور بھی

'طلسم الفت' میں آفتاب الدولہ قلق لکھنوَ نے نجومیوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

جمع ہوکر نجومی و رمال
آئے پیش شہِ خجستہ خصال
خوب آپس میں کر کے سوچ بچار
عرض کی اے شہ سپہر وقار
ہے یہ لڑکا بڑا گنی بھیا
سب طرح اس پہ رام کی ہے دیا

پھر کچھ اٹھارویں برس ہے خلل
کہ زحل ہوگا مہمان حمل
شہ نے پوچھا کہ جان کی تو ہے خیر
عرض کرنے لگے وہ ساکن دیر
بال بیکا نہ ہوگا ایک اس کا
ہو مگر دام زلف میں وہ پھنسا

مغلیہ عہد تک ہندوستان کو اپنی گنگا جمنی تہذیبی پر ناز تھا۔ ہندو مسلمانوں کے رسم ورواج بھی ایک سے تھے، عقائد پر بھی مقامی اثرات تھے۔ جس کی گواہی اس عہد کا ادب دیتا ہے۔ میر حسن جب سحر البیان کی ابتدا کرتے ہیں تو پہلے حمد اور نعت ہوتی ہے اور پنڈت دیا شنکر نسیم جب گلزار نسیم شروع کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمد حق و مدحتِ پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی
کرتا ہے زباں کی پیش دستی

دوسری طرف مثنویوں کی معاشرت صدفی صد ہندوستانی

ہے۔ اُس عہد کے عام مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور سماجی زندگی اہل ہند کے رسم و رواج سے بے حد متاثر تھی۔ مثنویوں میں ان کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ولادت سے لے کر وفات تک کی تفصیلات ان مثنویوں میں موجود ہیں۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ ''صرف پہناوے یا سامانِ آرائش ہی میں نہیں بلکہ سارے کا سارا رہن سہن ہندوسانی ماحول کی تصدیق کرتا ہے۔'' (مثنوی سحرالبیان گنگا جمنی تہذیب کا مرقع ماخوذ مثنوی اور بیانیہ شاعری، ص 98)

عام ہندوستانی ماحول کی طرح ولادت کے وقت جشن منائے جاتے ہیں، کسی شاہزادے یا شاہزادی کی چھٹی کی رسم ادا کی جاتی ہے، کسی کی برس گانٹھ منائی جاتی ہے۔ کہیں دودھ بڑھائی کی رسم پر خوشی کا ماحول ہوتا ہے۔ مکتب نشینی یعنی بسم اللہ کے وقت بھی عزیز و اقربا کو جمع کیا جاتا ہے۔ شادی کے وقت بے شمار رسومات بڑے جوش و خروش کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں اور وفات کے وقت بین کرنا یعنی چیخنا چلانا، سینہ پیٹنا، بال کھولنا غرضیکہ سب کچھ اسی طرح مثنویوں میں موجود ہے جو ہندوستانی معاشرت کا حصہ ہے۔ شادی کی رسومات کے متعلق مرزا قتیل جو نومسلم تھے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمان بیٹے بیٹی کی شادی میں چند رسموں کو چھوڑ جیسے آگ کے گرد چکر لگانا باقی سب رسمیں ہندوؤں کی طرح ہیں۔''

(ہفت تماشا از مرزا قتیل، ص 139)

مثنویوں میں مذکورہ تقریبات کچھ اس طرح پیش کی گئی ہیں:

مبارک تجھے اے شہ نیک بخت
کہ پیدا ہوا وارثِ تاج و تخت
نقیبوں کو بلوا کے یہ کہہ دیا
کہ نقارخانے میں دو حکم جا
کہ نوبت خوشی کی بجادیں تمام
خبر سن کے یہ شاد ہوں خاص و عام
چلے لے کے نذریں وزیر و امیر
لگے کھینچنے زر کے تودے فقیر

چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات
کہ دن عید اور رات تھی شب برات

برس گانٹھ جس سال اس کو ہوئی
دل بستگاں کی گرہ کھل گئی

وہ گل جب کہ چوتھے برس میں لگا
بڑھایا گیا دودھ اس ماہ کا
طوائف وہی اور وہی راگ رنگ
ہوئی بلکہ دونی خوشی کی ترنگ
(سحرالبیان)

شاہی خاندانوں میں شاہزادوں کو تمام علوم سکھائے جاتے تھے، ان کی مکتب نشینی کے وقت پھر ایک جشن کا ماحول ہوتا تھا۔ ہر فن کے استاد بلائے جاتے تھے۔ مثنوی میں اس کا بیان اس طرح ملتا ہے:

ہوئی اُس کے مکتب کی شادی عیاں
ہوا پھر انھیں شادیوں کا سماں
معلم، اتالیق، منشی، ادیب
ہر اک فن کے استاد بیٹھے قریب
کیا قاعدے سے شروعِ کلام
پڑھانے لگے علم اس کو تمام

شادی کی رسومات کا ذکر عموماً مثنویوں میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مغلیہ عہد میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کی شادیوں کا جشن کئی کئی ماہ تک چلتا تھا پورے شہر کو سجایا جاتا تھا عوام و خواص کو انعامات دیے جاتے تھے۔ مثنویوں میں ان کی جھلک دکھائی دیتی ہے:

الماس کے واں تھے جھاڑ فانوس
یاں جلوہ فروش تخت طاؤس
مہتاب سی چاندنی کا واں فرش
یاں چرخی سے چرخ میں سرعرش
بارانِ گلاب و بارشِ گل
ہو کر بڑھے آگے باتجمل
(گلزارنسیم)

وہ دولہا کے اٹھتے ہی غل اک پڑا
لگا دیکھنے اٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑے کو لانے لگا
کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
وہ شہنائیوں کی سہانی دھنیں
جنھیں گوش زہرہ مفصل سنیں
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے
پتنگے خوشی سے غزلخواں ہوئے
اناروں کا دغنا، بھچمپے کا زور
ستاروں کا چھٹنا، پٹاخوں کا شور
وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار
کہ ہر رنگ کی جس سے ہو دونی بہار
(سحرالبیان)

جب آئی وہ دلہن کے گھر پر برات
کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات

اترنے کی واں سمدھنوں کی پھبن
کھلیں پھول جیسے چمن در چمن
گلوں میں پہننا وہ ہنس ہنس کے ہار
سٹا سٹ وہ پھولوں کی، چھڑیوں کی مار
قہاقے، ہنسی، شور و غل، تالیاں
سہانی سہانی نئی گالیاں

ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان
پلا سب کو شربت دیے خاصدان

اٹھا پھر تو نوشاہ بعد از نکاح
محل میں بلانے کی ٹھہری صلاح

رکھا مصحف اور آرسی کو نکال
دھرا بیچ میں سر پہ آنچل کو ڈال
وہ جلوے کا ہونا وہ شادی کی دھوم
وہ آپس میں دولہا دلہن کی رسوم
گئی کوئی واں گال سے کچھ لگا
گئی کوئی دولہا کی جوتی چھپا

وہ دولہا کا دلہن کو گودی اٹھا
بٹھانا محافے میں آخر کو لا
چلے لے کے چنڈول جس دم کہار
کیا دو طرف سے زر اُس پر نثار

دکن کے شعرا کی طرح شمالی ہند کے بیشتر شعرا نے بھی کئی کئی مثنویاں لکھی ہیں اور ان کے موضوع صرف شاہزادوں اور شاہزادیوں کے عشق کا بیان نہیں، بلکہ اپنے عہد کے دیگر معاملات و مسائل اور عام لوگوں کی زندگی پر بھی مثنویاں قلمبند کی گئیں۔ میر اور سودا کی مثنویاں ان کے دور کے حالات بیان کرتی ہیں۔ نسیم، شوق، اور ان کے معاصر شعرا بھی مختلف موضوعات پر مثنویاں لکھ کر اپنے عہد کی تہذیب و تمدن کو تاریخ کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ بلاشبہ کسی بھی زمانے کے معاشرے کی صحیح عکاسی اس زمانے کی مثنویاں ہی کرتی ہیں اسی سبب سے مثنویوں کو تہذیبی تاریخ کہا جاسکتا ہے۔

■

Prof. Ibne Kanwal, Dept of Urdu, Dehli University, Delhi-110007

عبدالرشید اعظمی

فیض احمد فیض!
نئی تفہیم قدیم لفظیات

فیض احمد فیض 1911 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شرافت ان کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ سلطان فاطمہ اور سلطان محمد خاں کے چشم و چراغ تھے۔ والد سلطان محمد خاں پیشے سے معروف وکیل تھے۔ شعروادب سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ ایسے ماحول میں فیض کی شخصیت کا نکھر نالازمی تھا۔

فیض کی زندگی کا ایک استعجابی پہلو یہ ہے کہ ان کا گھرانہ روایتی مسلم گھرانہ تھا۔ ان کی تعلیم بھی مسجد مدرسہ میں قرآن، اردو اور فارسی سے شروع ہوئی تھی۔ تاہم خود فیض کو دنیا نے جب دیکھا تو وہ کمیونزم کے علمبردار تھے۔ ان کے اپنے گھر میں اقبال کی شاعری وفکر کا چرچہ تھا۔ والدمحترم خود اقبال کے قدردانوں میں تھے۔ ان کی راہ و رسم بھی ادیبوں اور شاعروں سے تھی جن کے اثرات فیض کی زندگی پر گہرے پڑے۔ گھریلو تعلیم کے بعد کالج سے ڈگریاں حاصل کیں۔ شاعری کا آغاز بھی کلاسیکی طرز پرحسن جاناں، شعلہ رخاں اور زلف پیچاں سے ہوا۔ حسن وعشق ہی فیض کا مرکزِ سخن ہے۔ بقول کیٹس love is Beauty and Beauty is love (حسن ہی محبت ہے اور محبت ہی حسن ہے) کیٹس کا یہی تصور فیض کا مطمحِ نظر اور محور تخلیق ہے لیکن وسیع تر معنوں میں۔ فیض کی محبوبہ کوئی مخصوص لحمی و شحمی گلعزار و گلبدن نہیں۔ وہ غم جاناں و پری خانہ کی قیدو بند سے آزاد ہوکرغم زمانہ وغم دنیا کی بیکراں وسعتوں میں پرواز کرتے ہیں۔ مسائل حیات و مسائل انسان ان کا محبوب موضوع ہیں۔ میر، غالب، مومن اور ذوق کی شاعری کو ہم نشاطیہ شاعری کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ تاہم ان کی شاعری بھی تقاضائے حال کے مطابق مسائل کی مظہر ہے۔ مذکورہ شعرا کے کلام محض ادب برائے لذت ونشاط ہی نہیں بلکہ ادب برائے زندگی سے سروکار بھی رکھتے ہیں۔ زندگی کے بدلتے ہوئے رویے، تیز رفتاری اور گوناگوں مسائل سے نبردآزما ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے روایتی و کلاسکی شاعری و ادب کی اساس پر نئے ادب کی حویلی تعمیر کی اور عوام الناس کے مسائل کو ذاتی مسائل سے ہم آہنگ کر کے حسن جاناں وزلف پریشاں کی مانند سنوارنے وسلجھانے کی سعی کی۔ شعروادب کوتعمیر وتہذیب کا آلہ بنایا۔ جب ادب سماج اور مسائل کا ترجمان بنا تو سماج کی ترقی وفلاح کے ساتھ تہذیب وثقافت، امن وآشتی اور اردوزبان وادب کی ترویج وتبلیغ بھی ہوئی۔ اردو ادب، خاص طور سے شاعری کچھ مخصوص عبقری شخصیات کی مرہون منت ہے۔ جنھوں نے اس کی نشوونماو پروان چڑھانے میں کوتاہ دستی نہیں کی۔ غیراردوآبادیوں اور غیرمسلموں میں اردوغزل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ان شخصیات کے قربانیوں و کوششوں کا زندہ ثبوت ہے۔ ایسے وقت میں استعماری قوتیں بھی اپنی سطوت و ہیبت کا سکہ جما رہی تھیں۔ پورے سماج پر جبرو استبداد کا غلبہ ثابت کر رہی تھیں۔ دوسری جانب عام طبقے کی زبوں حالی، ان کا غم اور روایتی قدروں کا زوال تھا۔ ایسے کرب انگیز حالات میں اپنے ذاتی مفاد سے ہٹ کر سوچنا شعرا وادبا کے لیے ایک مقام ابتلا تھا۔ تاہم پھر بھی ادیبوں اور شاعروں نے ذاتیات سے ہٹ کر کائنات کی بات کہی اور ادب کو اس کا آلہ کار بنایا۔ داخلی جذبات و احساسات کے اظہار پر قدغن لگایا۔ نفسی دنیا کے تغیرو تبدل اور حرکات وسکنات سے شعروادب کی زلفوں کو سنوارنے کے بجائے خواہش نفس سے گریز کر کے سماج کے مسائل کو موضوع سخن بنایا۔ تڑپتی ہوئی انسانیت کے دکھ درد کا اظہار کیا۔ دکھی آتماؤں کے لیے مداوا ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اسی احساس کے تحت ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے معرکۂ خیروشر میں حصہ لیا۔ جہاں ایک طرف مفکرین، مناظرین اور مؤلفین کا گروہ تھا جوانسانی اقدار و روایات کوفروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کر رہا تھا، وہیں شعرا کی بھی ایک جماعت تھی جس نے اپنے فرائض کومحسوس کیا۔ نتیجتاً جابر و قاہر حکومتوں کے عتاب سے دوچار ہوئے۔

اقبال، ولیم ورڈس ورتھ اور جان کیٹس نے مناظر فطرت اور پیغام محبت عام کرنے کے لیے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بطور آلہ استعمال کیا۔ انھیں کی اس روایت کو فیض نے آگے بڑھایا، امن وآشتی اور پیغام محبت کو اپنی شاعری کے ذریعے عام کیا اور ایک مثالی ومعیاری سماج کا نظریہ پیش کیا جو سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی فروغ کے لیے ایک ورثہ ہے۔

تعلیمی سفر سے فراغت کے بعد 1935 سے فیض کی خدمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کے سبب فیض کو کسی ایک مقام پر قرار نہیں تھا۔ ان کے اندر ایک سیمابی کیفیت رہتی تھی اسی وجہ سے امرتسر اور لاہور کی تدریسی ذمے داری ترک کر کے 1942 میں فوج میں داخل ہوئے اور بتدریج فوج کے عہدوں سے گزرنے کے بعد 1947 میں مستعفی ہوکرلندن چلے گئے۔ 1964 میں لندن سے واپس آکر کراچی میں سکونت اختیار کی اور درس وتدریس کے ماحول میں عبداللہ ہارون کالج میں پرنسپل ہو گئے۔ اسی دوران ایک عیسائی لڑکی، جارج

ایلس کتھرائن سے شادی کی ،جس سے ان کی دو بیٹیاں ہیں۔فیض احمد فیض کو غالباً اپنی سیمابی کیفیت اور ذہنی تغیر و ارتقا کا بخوبی اندازہ تھا، جس کا اظہار انھوں نے اس شعر میں کیا:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

1947 میں ہندو پاک کی تقسیم کے بعد فیض متعدد رسائل و جرائد کے مدیر رہے۔ ان رسائل و جرائد کے ذریعے انھوں نے اپنے جذبات و احساسات عوام تک پہنچائے۔ 1965 میں ہندو پاک جنگ چھڑی، اس وقت جنگ کے خلاف فیض نے نظمیں لکھیں۔ ان نظموں کے وسیلے سے جنگ کے خلاف نفرت اور انسانی ہمدردی کا اظہار کیا۔ کمیونزم نظریات سے گہری وابستگی کے باعث 1950 سے 1960 تک پاکستان میں کمیونزم کو فروغ دینے میں لگے رہے۔ اس امید میں میجر جنرل اکبر خاں کی پوری مدد کی کہ انقلاب آئے گا تو پاکستان میں کمیونزم کو فروغ ملے گا اور کمیونسٹ پارٹی کو سرکاری درجہ حاصل ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ راولپنڈی سازش کیس میں چار سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس حبس زنداں اور اسیری کے سبب ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی اور ان کی شاعری کو نیا موڑ ملا۔ 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' اسی قید و بند کی زندگی کا ثمرہ و مظہر ہیں۔ راولپنڈی سازش کیس کا فیض کے اوپر بہت گہرا اثر پڑا، جس کا ذکر ایک شعر میں بھی کیا:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

فیض حسن و عشق کے شاعر تھے۔ روایتی شعری اسلوب سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ لیکن ان کے حسن و عشق کی دنیا بہت وسیع تھی۔ سرسید نے اپنے خطبات میں محبت اور حسن کی بات کی ہے اور ہندوستان کو ایک حسین دلہن سے تعبیر کیا ہے اور ہندو مسلم کو اس حسین دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دی ہے۔ فیض احمد فیض نے اپنے ذوق جمال کے مطابق پاکستان کو ایک خوبصورت دوشیزہ سے تعبیر کیا۔ دن کا اجالا ہو کہ رات کی سیاہی، ہمہ وقت اس دوشیزہ کے حسن میں نکھار دیکھتے ہیں اور رجائیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ امید رکھتے ہیں کہ ایک دن زنداں کے شب و روز اور اس کی سختی سے ضرور نجات ملے گی۔

فیض احمد فیض چونکہ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں بلکہ لڑنا سکھا رہے ہیں۔ اس لیے روشنی، بہار، گلشن اور چاک گریباں جیسے الفاظ استعمال کر کے وطن میں آزادی کی جھلک دکھانا مقصود ہے تاکہ باطل سے برسرپیکار انسانیت کا جذبہ ماند نہ پڑ جائے، حوصلہ پست نہ ہو جائے۔ فیض تاریکی میں ایک چراغ امید جلا رہے ہیں تاکہ آگے بڑھنے کے لیے راہ ملے۔

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جاناں ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

جیل کے اندر آزادی کا جذبہ ہے۔ سورج کی روشنی اور رات کی تاریکی سے آزادی اور غلامی کا استعارہ کرتے ہیں۔ لیکن انداز بیان کتنا پیارا ہے کہ باہری دنیا کا نقشہ در زنداں سے پیش کرتے ہیں۔ زنداں کے در و دیوار سے روشنی غائب ہو جاتی ہے تو فیض کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ وطن کی گلیوں میں اب تاریکی کا دور دورہ ہے۔ لیکن 'تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی' سے استعارہ کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ستاروں کے بجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ تاہم پھر بھی ستارے حسن کی علامت ہیں، جن سے دوشیزائیں اپنی مانگ سجاتی ہیں۔

فیض احمد فیض نے کلاسیکی الفاظ و تعبیرات اور تشبیہات و استعارات کو شعوری طور پر اختیار کیا ہے اور عمداً اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے، ان کے اس رویے سے اردو زبان و ادب کو وسعت ملی اور احساسات و خیالات کے اظہار کے لیے وسائل و سہولت بہم پہنچی۔ لغوی اور محدود معانی سے انحراف نہیں کیا بلکہ قدیم و جدید اور فکر و فن کے امتزاج سے ایک نئے آہنگ کی بنیاد ڈالی۔ اس لحاظ سے فیض احمد فیض ایک علاحدہ مکتبِ فکر و فن کے خالق اور مالک بھی ہیں۔ فیض احمد فیض نے اپنی شاعری میں زلف و رخسار، گل و گلزار، زنداں و قفس، باد صبا اور ذکر مرغانِ گرفتار کا استعمال کر کے ایک شاعرانہ نظام قائم کیا۔ بقول فراق گورکھپوری:

''فیض نے ایک مدرسۂ شاعری قائم کیا، انھوں نے جس بصیرت افروز احساس، خلوص و فنکارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا ہے، یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز تھی اور قابل قدر تھی۔'' (تقریظ نسخہ ہائے وفا)

انھیں یہ احساس بھی تھا کہ نہ جانے یہ دشمنانِ جاں میرے ان شعری وسائل کو کیا معنی پہنائیں، لہٰذا اس کا انھوں نے اظہار بھی کیا۔

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی

فکرِ دلداریِ گلزار کروں یا نہ کروں
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں
جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوس
مدحِ زلف ولب و رخسار کروں یا نہ کروں

فیض احمد فیض کی شاعری 'غم جاناں' سے شروع ہو کر غم دوراں پر تمام ہوتی ہے۔ ماسکو میں 'لینن امن انعام' تقریب کے موقعے پر فیض نے اپنے اس خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

''مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی جانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہیں اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن ہے اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے۔''

فیض احمد فیض نے قدیم اسلوب ولفظیات کو نئے معنیٰ پہنائے ہیں، کلاسیکی آہنگ و تعبیرات کو فنی حسن سے مزین کر کے نئے مسائل کے اظہار کا متحمل بنایا ہے۔ گویا پرانے جام کو رنگا رنگ کی نئی شراب سے بھر دیا ہے۔ مسائل کی تلخی میں اپنے اسلوب و فن سے نشاط و لذت پیدا کیا، جس سے قدما کے مستعمل شعری لوازمات اور انداز و الفاظ میں معنیٰ کا ایک جہان آباد کیا۔ فیض نے اپنی نظموں کے ذریعے عوامی مسائل کو اپنی عالمگیر فکر سے آفاقیت عطا کی اور محدود روایتی لفظیات کو حسن و عشق، گل و بلبل، زلف و رخسار، شراب و جام اور لب و عارض کی مخصوص و محدود معنویت سے نکال کر سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی و ثقافتی دنیا سے روشناس کرایا۔ اس اسلوب سے انسانی مسائل کے اظہار میں سہولت پیدا کی۔ احوال گلستاں اور معاملاتِ میخانہ کو فیض احمد فیض نے وسعت دے کر ملکی و قومی آرائش و زیبائش اور چمن بندی پر تطبیق دی۔

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

■

Dr. Abdur Rahseed A-187/3, IInd Floor
Shaheen Bagh, Okhla, New Delhi - 110025

ایس نسیم بانو

علامہ اقبال اور قومی یکجہتی

انسانی ذہن احساسات و جذبات کا بحرِ بے کراں ہے۔ کسی بھی قوم میں شاعر کی ذمے داریاں بڑی ہوتی ہیں۔ ہر عہد کے بالغ نظر شعرا نے اپنی ذمے داری کو محسوس کیا اور انھوں نے قوم کی رہنمائی اپنے عصر کے حالات میں بہتر سمتوں میں کی۔ علامہ اقبال بھی ایسے ہی عظیم اور ذمے دار شعرا کی صف میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ اقبال دنیا کے ایک باخبر، باشعور اور صاحب علم شاعر تھے۔ آپ کی عظمت ان کے فلسفے یا افکار کی گہرائی اور گیرائی کی وجہ سے نہیں فکر کے شعر بننے یا فلسفے کے شعر میں ڈھلنے کی وجہ سے ہے۔ اردو ادب میں اقبال وہ واحد شاعر ہیں جن کی شاعری ایک مخصوص شعری حکمت عملی کو نمایاں کرتی ہے۔

ہر انسان اپنے خطۂ ارض سے بے پناہ محبت رکھتا ہے۔ جذبۂ حب الوطنی دوسری نعمتوں کی طرح ودیعت ایزدی ہے اور کوئی اس نعمت کا انکار نہیں کرسکتا۔ وطن کا مادی تصور جغرافیائی حدود سے وابستہ ہے جس پر اقبال نے اعتراض کیا ہے۔ وطن کے مادّی تصور کے نقائص پر قتل و غارت گری کی تاریخ گواہ ہے ایسے وطنی تصور سے انحراف کرکے ایک آفاقی وطن کا تصور جس میں اخلاقی اور روحانی اقدار موجود ہوں۔ اقبال نے پیش کیا ہے۔ شروع میں اقبال نے ہندوستانی قوم میں اپنی نظموں کے ذریعے حب الوطنی کو فروغ دیا جس سے آزادی کی قومی جدوجہد میں بڑی قوت ملی۔ ایسی نظموں میں ہمالہ، تصویر درد، ترانۂ ہندی ہندوستانی بچوں کا گیت اور نیا شوالہ وغیرہ کافی مشہور نظمیں ہیں۔ وطن کی موجودہ صورتِ حال کی اندوہناک تصویر اقبال نے اس طرح پیش کی ہے:

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں

اور حال کے آئینے میں مستقبل کے اندیشے کی پیشین گوئی اس طرح کرتے ہیں:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ان اشعار کی کربناکی اس بات کی شاہد ہے کہ اقبال کے سینے میں حب الوطنی کا جذبہ کتنا شدید تھا۔ وطن کے تئیں محبت اور وطن کی بزرگ ہستیوں کے تئیں عقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔ اقبال وطن سے دور جب رہتے تھے۔ تب بھی وہ اپنے دل و دماغ سے اپنے وطن کو فراموش نہ کرسکے۔ جس کا ثبوت یہ ہے:

یوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے تیرے
اک ذرا افسردگی، تیرے تماشاؤں میں تھی
میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے کوہ پیاؤں میں تھی

مذہبِ انسانیت جو کہ اقبال کا مذہب تھا۔ اسی لیے اقبال نے انسانیت کے قافلے کی رہنمائی کی اور وہ دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیتے تھے:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

یہیں پر اقبال کا تصور وطنیت آفاقیت کی روح سے

جلا پا کر منور و درخشاں ہو جاتا ہے۔ اقبال کا تصور وطنیت محدود وطنی تصور سے پھیل کر پوری کائنات پر چھا جاتا ہے۔ آپ نے اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے بکھرے ہوئے عناصر کو سمیٹا اور ایک فلسفیانہ نظام کے تحت قومی یکجہتی کے مروجہ خام تصور کو فلسفیانہ جہت عطا کی بلکہ فلسفیانہ نظریہ قائم کیا۔

'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کے متعلق مہاتما گاندھی 1938 میں رسالہ جوہر (دہلی) کے خصوصی شمارے اقبال نمبر کے ایڈیٹر کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم 'ہندوستاں ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودا جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں۔ تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

ایک اور موقعے پر مہاتما گاندھی نے اردو ہندی کے نزاع کو نپٹانے کی غرض سے ترانۂ ہندی کا حوالہ دیتے ہوئے اس ترانے کو ہندوستان کی قومی زبان کا نمونہ کہا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

''کون ایسا ہندوستانی دل ہے جو اقبال کا 'ہندوستان ہمارا' سن کر دھڑکنے نہیں لگتا۔ اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔''

ہندوستان کو آزادی ملنے پر بھی گاندھی جی نے پرارتھنا سبھا کے آخر میں یہ ترانہ گایا تھا:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

دہراتے ہوئے دعا کی تھی کہ ہم آئندہ مسائل کو حل کرنے کے لیے کبھی تلوار نہ اٹھائیں۔ یہی نہیں بلکہ دوردرشن کی نئی علامتی دھن جو پنڈت روی شنکر نے بنائی وہ اسی نظم پر مبنی ہے اور اسے خود شریمتی اندرا گاندھی نے پسند کیا تھا۔ اس کے متعلق مظفر حسین برنی لکھتے ہیں:

''1975 کی بات ہے۔ جب میں وزارتِ اطلاعات ونشریات کا سکریٹری تھا... اصل میں یہ تجویز بھی خود شریمتی اندرا گاندھی مرحومہ کی ہی تھی کہ دوردرشن کی نئی علامتی دھن اسی قومی گیت پر بنائی جائے۔''

اقبال اتحاد اور قومی یکجہتی کے حامی تھے۔ یہ نظریہ صرف فلسفیانہ نہیں بلکہ عملی بھی تھا:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں

اقبال ایک علمی ادبی اور عملی شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے اخلاق واطوار پرکشش تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مداحوں اور چاہنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ مسلمان تو مسلمان دوسرے مذہب اور فرقے کے لوگوں کے ساتھ مرد وعورتوں کے حلقے میں بھی وہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی بمبا دلیپ سنگھ اقبال کی بڑی قدر دان تھیں اور آپ سے ملاقات کی بے حد خواہش مند تھی۔ علامہ اقبال جب بمبا کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ بمبا کو معلوم تھا کہ اقبال حقہ پیتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اعلیٰ درجے کا حقہ بنوایا اور خود حقہ اٹھا کر لائی اور برآمدے میں رکھ دیا۔ علامہ بہت خوش ہوئے اور بولے۔ دیکھیے مرزا صاحب ہمیں رنجیت سنگھ کی پوتی نے اپنے ہاتھ سے حقہ پلایا۔

اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم 'ہندوستاں ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودا جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں۔ تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

کون ایسا ہندوستانی دل ہے جو اقبال کا 'ہندوستان ہمارا' سن کر دھڑکنے نہیں لگتا۔ اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔

مہاتما گاندھی

سچ تو یہ ہے کہ اقبال فکری اور عملی دونوں جہتوں سے ہندوستانی قوم کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یکجہتی کے لیے بے حد کوشاں اور نہایت متمنی رہے۔

آپ کے نزدیک مذہبی ہونا یا مذہب پسندی، تعصب کی نفی کرنا ہے اور متعصب ہونا اقدار کی نفی کرتا ہے۔ ملتیں اور قومیں تعصب کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اور انسانیت اپنے آپ مر جاتی ہے۔ اقبال اس خیال کے مبلغ ہی نہیں۔ داعی بھی تھے۔ جیسا کہ ان کی عملی زندگی کے مطالعے سے واضح ہو چکا ہے۔ آپ نے لسانی تعصب کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور کہا تھا کہ:

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

کیوں کہ وہ زبانوں کو بھی انسانی خدمت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔

اقبال کشادہ قلب وسیع النظر اور راسخ العقیدہ تھے۔ وہ اپنے سینے میں انسان دوستی اور باہمی ہمدردی کا پرخلوص اور سچا جذبہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں عبدالرشید طارق بیان کرتے ہیں ''علامہ کی قیام گاہ کے نزدیک ایک سینما گھر تھا۔ ایک بار راوی نے سینما گھر کے شور وغوغہ کی طرف علامہ کی توجہ دلاتے ہوئے دریافت کیا کہ آپ جیسے فلسفی اور شاعر کے آرام میں اس سے خلل نہیں پڑتا۔ تو اقبال صاحب فرمانے لگے کہ مجھے تو اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ کوٹھی بدلنے کی صلاح کو علامہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کوٹھی کے وارث دو یتیم ہندو بچے ہیں جنھیں میں ایک سو تیس روپیہ کرایہ دیتا ہوں۔ میں نے اگر یہ کوٹھی چھوڑ دی تو اس کا اتنا کرایہ شاید یتیموں کو نہ مل سکے۔

حالات وواقعات سے یہ ثابت ہے کہ اقبال کے مراسم و روابط لوگوں سے بہت اچھے تھے اور یہ روابط بعضوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر گئے جن کے متعلق علامہ کہتے ہیں:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

آج ہمارا معاشرہ ذہنی کشمکش سے دوچار ہے اور یہ تناؤ اور ذہنی کشمکش بے سبب نہیں۔ اس کا سبب معاشرہ کے درمیان لین دین کے روابط کا ٹوٹ جانا ہے۔ یاس ناامیدی بے اعتمادی کا یہ ماحول ایک نیا پس منظر پیش کرتا ہے۔ موجودہ حالات میں قومی یکجہتی کی ضرورت اور اہمیت وافادیت کو سمجھنے کے لیے ہیں ان حالات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جن سے اقبال کا واسطہ پڑا تھا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی معاشرہ ہر طرح کے تعصبات سے پاک ہوکر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تازہ اور صحت مند ہوا میں سانس لے۔ اس کے لیے ہمیں قومی یکجہتی کو فروغ دینا ہوگا۔ اب پھر کوئی علامہ اقبال نہیں پیدا ہوگا۔ بلکہ ہم سب کو اقبال کے قومی ترانے اور قومی یکجہتی سے بھرپور نظمیں دل سے الاپنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی کرنا ہوگا۔ تبھی علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی روح سرشار رہے گی۔

■

Dr. S Naseem Bano
Dept of Urdu, Nehru College Hubli, Karnataka

پہلی جنگِ آزادی اور بہادر شاہ ظفر

عبدالعزیز عرفان

1857 کی جنگِ آزادی ایک عظیم انقلابی جدوجہد تھی۔ اس جنگ کو پہلی جنگِ آزادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں اسے جنگ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس کا روپ مختلف تھا۔ درحقیقت جدوجہد آزادی کا یہ پہلا مرحلہ تھا اسی لیے ہندوستان کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1857 سے قبل انگریزوں کا ظلم وستم بڑھ چکا تھا۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہوچکی تھی۔ یہ لاوا عوام اور دیسی راجاؤں کے دلوں میں موجزن تھا۔ اس جنگِ آزادی میں ہندوستانیوں کا جذبۂ آزادی ایک دم پھوٹ پڑا تھا۔ یہ انگریزوں کا تختہ الٹ دینے کی پہلی متحدہ کوشش قومی تحریک بن گئی تھی۔

لارڈ ڈلہوزی نے 1856 میں مسئلہ الحاق کے ذریعے 82 ریاستوں کا الحاق کرلیا تھا۔ اس مسئلہ الحاق اور زود افتاد اصلاحات کی وجہ سے دیسی راجا اور عوام انگریزی حکومت سے بدظن ہوگئے تھے۔ اس لیے ان بادشاہوں اور عوام میں یگانگت اور اتحاد کا جذبہ پیدا ہوا اور وحدتِ قومی کا تصور زور پکڑنے لگا۔

اسی تحریک جنگِ آزادی کا ایک عظیم مجاہد گزرا ہے جسے دنیا بہادر شاہ ظفر کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ان کا نام سراج الدین ابومحمد، بہادر شاہ لقب اور ظفر تخلص تھا۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے فرزند ارجمند تھے۔ ان کی پیدائش 24 اکتوبر 1775 کو منگل کے روز مسماۃ لال بائی کے بطن سے ہوئی۔ مغل شہزادوں کی طرح تعلیم وتربیت پائی۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد 30 ستمبر 1837 کو تخت نشین ہوئے۔ امام میر احمد علی امام جامع مسجد شاہی نے رسم تاج پوشی کا افتتاح کیا۔

تخت نشینی کے بعد ہی انگریزوں کی طرف سے انھیں ستانے اور حکومت کا خاتمہ کرنے کی کوششیں شروع ہوگئی تھیں۔ انھوں نے شاہی خاندان کے تنازعات اور اختلافات کو ہوا دینا شروع کیا۔ 31 اگست 1844 کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کے حکم کے مطابق گورنر جنرل نے اپنے دہلی کے ایجنٹ کو یہ ہدایتیں دی۔

''جب دہلی کے بادشاہ کا انتقال ہوجائے تو اس کا جانشین بنانے کے سلسلے میں گورنر جنرل سے منظوری لینی چاہیے۔ کمپنی مرزا فخر کو ولی عہد بنانا چاہتی تھی۔ اس طرح اختیارات شاہی کو ختم کرنے کے لیے ذلیل حرکتیں کرنے لگی۔ بادشاہ کا جلوس ان کو پسند نہیں تھا۔ بادشاہ کے خطوط میں انگریزوں کو القاب وآداب میں فرزند ارجمند لکھا جاتا

بدقسمتی سے انگریزی سرکار کو بغاوت کا علم ہوگیا۔ بنگال کے لفٹیننٹ کرنل نے ملک کے تمام حصوں میں ہندوستانیوں کے منصوبہ کی اطلاع بھجوا دی۔ اسی اثنا میں میرٹھ میں 9 مئی 1857 کو فوجیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا۔ انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ 10 مئی کو ان کے ساتھیوں نے بغاوت کردی اور علی الصبح میرٹھ سے تین سو جری سپاہیوں کا ایک دستہ دھلی میں داخل ہوگیا

تھا۔ اب وہ اعتراض کرنے لگے۔ جنگِ آزادی سے قبل بادشاہ نے شاہِ ایران کو خط لکھا تھا۔ یہ خط مرزا نجف ایران لے کر گئے تھے۔ بادشاہ کی تمام انگریز دشمن سرگرمیوں کے متعلق آگاہ کردیا۔ محمد درویش سیاح نے 24 مارچ 1857 کو لفٹیننٹ گورنر آگرہ کو خط لکھ کر آگاہ کردیا تھا جس کی وجہ سے جنگ کی پلاننگ کا راز فاش ہوگیا۔

دراصل بغاوت کی ابتدا بنگال کے فوج سے ہوئی۔ انھیں نئے رائفل دیے گئے تھے۔ اس کے کارتوس کے بالائی حصے کو دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ فوجیوں میں یہ افواہ گشت کرگئی کہ کارتوس میں گائے اور سور کی چربی ملی ہے۔ اس سے ہندو اور مسلمان مشتعل ہوگئے۔ 29 مارچ 1857 کو میرٹھ چھاؤنی کے سپاہی منگل پانڈے نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا اور دو انگریز افسروں کو مار ڈالا۔ اسے گرفتار کرکے 8 اپریل 1857 کو پھانسی دی گئی۔ اس واقعہ نے فوج کا ولولہ اور جوش بڑھا دیا۔ 31 مئی 1857 بروز اتوار بغاوت کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ اتوار کو عیسائی چرچ جاتے ہیں۔ تمام سرکاری ملازموں اور فوجیوں کو آگاہ کردیا تھا کہ اس دن بغاوت کا آغاز کریں۔ تمام یورپین عہدیداروں کو ختم کریں جیل خانوں سے قیدیوں کو چھڑا دیں اور سرکاری خزانہ اور قلعوں پر قبضہ کریں۔

'آدھی روٹی، لال رومال' دیکھا میرٹھ کا کمال جیسے نعرے زور پکڑ رہے تھے۔ ان سے انقلاب کی آواز چاروں طرف پھیلتی رہی۔ بدقسمتی سے انگریزی سرکار کو بغاوت کا علم ہوگیا۔ بنگال کے لفٹیننٹ کرنل نے ملک کے تمام حصوں میں ہندوستانیوں کے منصوبہ کی اطلاع بھجوا دی۔ اسی اثنا میں میرٹھ میں 9 مئی 1857 کو فوجیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا۔ انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ 10 مئی کو ان کے ساتھیوں نے بغاوت کردی اور علی الصبح میرٹھ سے تین سو جری سپاہیوں کا ایک دستہ دہلی میں داخل ہوگیا۔ فوجیوں نے سلیم پور کی چوکی کے کلکٹر کو قتل کیا۔ کمشنر فریزر اور کپتان ڈگلس کا کام تمام کیا۔ شہر کی رجمنٹ کے فوجیوں نے کھلی بغاوت کا اظہار کیا۔ اس طرح فوجیوں نے اضافہ ہوتا گیا۔ یہ بپھرے فوجیوں نے انگریزوں کو مارنا شروع کیا۔ مجاہدین قلعہ میں آئے 11 مئی 57 کو دن کے 3 بجے بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کرکے حکومت کا اعلان کیا گیا اور 21 توپوں کی سلامی دی گئی۔ 12 مئی سے شہنشاہِ ہندوستان کا یہ اعلان کیا جاتا ہے۔

خلقت خدا کی
ملک بادشاہ کا
کمپنی کا نام اڑا دیا گیا

ایک انگریز کپتان Alexender Heatherling

الور کے توپ خانے کا کپتان تھا۔ اردو اور فارسی کا شاعر تھا۔ بادشاہ اور مجاہدین کے بارے میں یوں رقم طراز ہے:

یہ دہلی رسید ند جملی لعین　　درآں جنگ خواہند شد شرگیں
مسلماں جہادی ہندوں ہمہ　　جمع ہر سہ کشتند ازاں کہہ و ماہ
بہادر شاہ طلبیدہ آں ہر سہ را　　قسم خوردہ آورد بر مدعا
ہنوداں قسم رام گنگا خواہد　　مسلماں قرآن برسہ نہند
پسر خویش را شاہ جرنیل کرد　　پسر کہ بود آن را کرنیل کرد
یدنو د و مسلماں بہ لعین و کرم　　بہم کشتہ با خود بدین و دھرم

جس کا نچوڑ یہ ہے کہ:

باغی دہلی پہنچے اور جنگ کا آغاز کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے ہندو اور مسلمانوں کو جمع کیا اور جہاد کا اعلان کیا۔ ہندوؤں نے گنگا جل اور مسلمانوں نے قرآن سر پر رکھ کر قسم کھائی۔ بادشاہ نے اپنے بیٹوں کو سپہ سالار بنایا اور فوج نے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔

بادشاہ ظفر اعلان نامہ کے بعد ایک فرمان جاری کرتے ہیں۔ جسے جہاد نامۂ ظفر کہا جاتا ہے۔ یہ فتویٰ 19 جولائی 1857 کے صادق الاخبار میں شائع ہوا تھا۔ یکم اگست 1857 کو بقرعید اور ہندوؤں کی دوج تھی۔ سب نے مل کر بادشاہ کی فتح کی دعائیں مانگیں اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ بادشاہ نے بخت خاں کو لکھا جسے سپہ سالار بنایا گیا تھا:

لشکرِ اعداء الٰہی آج سارا قتل ہو
گورکھوں سے لے کر تا نصاریٰ قتل ہو
آج کا دن عید قربان کا جبھی پائیں گے ہم
آج ظفر تہ تیغ گر دشمن ہمارا قتل ہو

اس دن انگریزوں نے گاؤکشی کا الزام لگا کر ہندو مسلم فساد برپا کرنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ نے اس فتنہ کو جلد فرو کردیا۔ 25 اگست 1857 کو بہادر شاہ ظفر نے دوسرا جہاد نامہ جاری کیا جس میں مجاہدین کے نصب العین اور کارگزاری کے بارے میں اہم باتیں تحریر تھیں۔ ہندوستانیوں نے انگریزوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اگست اواخر میں بریگیڈیر نکلسن Nichalson پنجاب سے انگریز اور گورکھوں کی فوج لاکر دلی کا پانچ جانب سے محاصرہ کرلیا اور ستمبر میں توپ خانوں کے ساتھ حملے کا آغاز کرتا ہے۔

ادھر مجاہدین کو محاصرہ کی وجہ سے گولہ بارود اور غذا کی فراہمی نہ ہونے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت بادشاہ کے عزیز و اقارب خط و کتابت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش اور شاہی طبیب احسن اللہ خان انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ بادشاہ اور مجاہدین کی سرگرمیوں کے متعلق انگریزوں کو خبریں دی جارہی تھیں۔ بادشاہ کے ساتھ دوغلی پالیسی سے پیش آرہے تھے اور غلط رہنمائی کی جارہی تھی۔ آخر انھیں پھنسایا گیا۔ کشمیری دروازے کو انگریزوں نے اڑا دیا... قتلِ عام شروع کردیا۔ 14 ستمبر کو جامع مسجد گھیر کر مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ 17 ستمبر 1857 کو بادشاہ ظفر پرانے قلعے کے گھاٹ گئے وہاں سے نظام الدین اولیا کی درگاہ گئے۔ موئے مبارک کو منتظمین کے حوالے کیا اور ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزیں ہوئے۔ 19 ستمبر کو انگریزوں نے دہلی کے اہم مقامات پر قبضہ کرلیا اس کے بعد میجر ہڈسن اور جنرل ولسن نے بہادر شاہ ظفر ملکہ زینت محل اور جوان بخت کو ہمایوں کے مقبرے پر گرفتار کرلیا۔ مولانا امداد صابری کے مطابق دوسرے دن ہڈسن ان کے دو بیٹوں مرزا مغل، مرزا خضر اور پوتے مرزا ابوبکر ان تینوں کو خونی دروازے پر عریاں حالت میں گولیوں کا نشانہ بناتا ہے۔ شہ رگ کو سنگین سے چیر کو خون پیتا ہے اور ان کے سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ انگریز سپاہی کہتا ہے۔ ظل سبحانی نذر قبول ہو۔

بادشاہ سلامت اسے دیکھ کر جواب دیتے ہیں۔

الحمدللہ۔ تیمور کی اولاد اسی طرح سرخ رو ہوکر باپ کے سامنے آتی ہے۔

بادشاہ پر مقدمہ چلا جس کی کارروائی 27 جنوری 1858 سے شروع ہوئی اور 9 مارچ 1858 میں ختم ہوئی۔ ان پر سنگین الزامات عائد کیے گئے تھے:

1. شہنشاہِ وقت نے حکومتِ برطانیہ کے خلاف راجا نواب اور رعایا کو لے کر اعلانِ جنگ کردیا جو ملک سے غداری کرنے کے مترادف ہے۔
2. بھارت سرکار کے پینشن یافتہ ہونے کے باوجود 10 مئی 1857 تا اکتوبر 1857 تک صوبے دار محمد بخت خان اور دیگر سپاہیوں کو بغاوت کے لیے اکسایا۔
3. 16 مئی 1857 کو لال قلعے کے اندر 49 انگریزوں کا قتل کرادیا۔
4. آپ نے برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے سپاہیوں کو دلی میں اکٹھا کر کے سرکار کے خلاف جنگ کے لیے اکسایا اور شاہِ ایران سے سازباز کی۔

فوجی کمیشن نے ان عائد شدہ الزامات پر جلاوطنی کی سزا دی۔ 17 اکتوبر 1857 کو بادشاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ آخر موت رنگون کی قید فرنگ اور قیدِ حیات کو ختم کرنے کے لیے 7 نومبر 1862 بروز جمعہ کو آئی اور نواسی سال کی عمر میں اپنا شکار بنا کرلے گئی۔ وہیں دفن کیے گئے۔

بادشاہ کی اسیری کی کل مدت پانچ سال ایک ماہ اور 16 دنوں کی ہوتی ہے۔ ظفر کی عمر کا آخری حصہ زنداں کی نظر ہوا۔ قیدِ زنداں نے ان کے لب پر مہر ثبت کردی تھی ان کی متاعِ لوح و قلم بھی چھن چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر نہ بکھیرتے ہوئے زندان کی دیواروں پر کوئلے سے تحریر کیا۔ اس میں ایک مجبور و بے کس قیدی بادشاہ کی تڑپ اور ضعیف دل کی پکار سنائی دیتی ہے۔ ان کی ایک ایام اسیری کی غزل ملاحظہ فرمائیں:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی، کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
نہ تھا شہر دہلی، یہ تھا ایک چمن، کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا، وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
سبھی جا وہ ماتمِ سخت ہے کہو کیسی گردش بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
کیا ہے غم ظفر تجھے حشر کا جو خدا نے چاہا تو برملا
ہمیں ہے وسیلہ رسولؐ کا وہ ہمارا حامیِ کار ہے

بادشاہ قیدِ رنگون سے اپنی بیٹی کلثوم زمانی کو خط لکھتے ہیں۔ جس میں ایک مجبور و بے بس باپ کی آواز اور فریاد سنائی دیتی ہے اور انگریزی سرکار کے ظلم و ستم کی داستان بھی نمایاں ہوتی ہے۔

ولیم ہڈسن کے ذریعہ بہادر شاہ ظفر کو قید کئے جانے کا منظر

بہادر شاہ ظفر کا خط کلثوم زمانی کے نام

قید خانہ رنگون 18 مئی 1860

پیاری بیٹی

تم نے اپنے قیدی والد کو خط بھیجا۔ خط کیا تھا، میری جان اور آنسوؤں کے نام تھا۔ جواں بخت نے پڑھ کر سنایا۔ ایک دفعہ سنا تو جی نہیں بھرا۔ پھر کہا، بیٹا پھر سنانا، پھر سنا وہ بھی رویا میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ کہا، بابا ایک دفعہ اور پڑھو۔ کیا لکھواؤں بیٹی کہ مجھ پر تمھارے خط کا کیا اثر پڑا۔ تین دفعہ سننے کے بعد بھی دل کو قرار نہیں آیا۔ سچ کہتی ہو میری جان، دہلی والے مجھ کو روتے ہوں گے۔ تو کیا یہ نہیں جانتے کہ میں بھی ان کو روتا ہوں۔ میں تو زندہ بیٹھا ہوں۔ وہ تو بغیر آئی موت مرگئے۔ کتنوں کے والد، کتنوں کے بیٹے، کتنوں کے بھائی پھانسیوں پر چڑھ گئے۔ کتنے بچے یتیم ہوگئے۔ کتنی عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ گھر لٹ گئے نہیں، بلکہ کھد گئے اور ان پر گدھوں کے ہل چل گئے۔ دہلی میں جب میرا مقدمہ ہورہا تھا، اسی زمانے میں تباہی اور بربادی کے قصے سنے تھے۔ میرے یہاں آجانے کے بعد خبر نہیں اور کیا کیا آفت شہر والوں پر بپا ہوں گی۔ یہ سب میرے اعمال کا شوئی تھی۔ سپاہیوں نے بھی غضب کیا تھا۔ بھلا عورتوں اور بچوں کو مارنا کس مذہب میں آتا ہے۔ اب روئے یا ہنسے، کوئی فائدہ نہیں...

اچھا بیٹی، اب زیادہ لکھوایا نہیں جاتا۔ خدا اگر تمھیں یہاں لایا اور تم میری زندگی تک یہاں آگئی تو دل کی بات کہوں گا اور دل و جگر میں جہاں جہاں زخم ہے دکھاؤں گا۔ کیا خبر یہ خط تم کو ملے گا یا بھی نہیں۔

تمھارے قیدی باپ نے لکھوایا۔"

بہادر شاہ ظفر تقریباً ایک سال دلی میں نظر بند رہے۔ انھیں انگریزی ظلم و ستم کی خبریں موصول ہورہی تھیں کہ انگریزوں نے فتح پا کر انتقام لینا شروع کردیا تھا۔ انھوں نے غدر کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا۔ ان کا عتاب مسلمانوں پر نازل ہوا۔ سرکاری دستاویزات اور یورپین شاہدین کا فرمان ہے کہ یہ واقعہ روح فرسا حادثہ تھا۔ اسے نادر شاہ کی لوٹ سے بھی زیادہ دردناک واقعہ کہا گیا ہے۔ سرکاری دستاویزات سے انکشاف ہوتا ہے کہ فوج کو تین دن تک لوٹنے کی اجازت تھی اور سات دنوں تک متواتر قتل عام جاری رہا۔ تقریباً 27 ہزار مسلمان قتل کیے گئے۔

14 فروری 1858 تا مارچ 1858 چیف کمشنر پنجاب لارڈ لارنس ذمے دار تھا۔ بعد ازاں کرنل برن کی نگرانی میں دلی کی بربادی اور اہلِ دلی کی تباہیاں ہوئیں۔ برن نے چاندنی چوک کوٹھی میں اقامت کی۔ ایک سپاہ گشتی مقرر کی۔ وہ دن بھر سارے شہر میں چکر لگاتے تھے۔ گھر گھر کی تلاشی لی جاتی تھی۔ لوگوں کو گرفتار کرتے اور پھانسی پر چڑھاتے یا قتل کردیتے تھے۔ شارع عام پر پھانسی دی جاتی تھی۔ شہر میں پھانسی کے تین اہم مقامات کا ذکر ہوتا ہے۔ جس میں چاندنی چوک اور محلّہ بلی ماران اہم تھے۔ دونوں مرکز مسلمانوں کی آماجگاہ تھیں۔ خاموش رہنے والوں کو پھانسی اور زبان کھولنے والوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ گلی کوچوں میں لاشیں پڑی تھیں۔ ان کی بدبو سے گشتی سپاہی پریشان تھے۔ مٹکاف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسلم نوجوانوں کا شکار کرتا تھا۔ پنجاب رجمنٹ میں سکھوں نے بھی اپنا کمال دکھایا۔ ہر تنومند اور خوبصورت مسلمانوں کو نشانہ بنایا۔ ادھر غیرت مند اور عصمت مآب خواتین نے اپنے بے عصمت اور بے پردہ ہونے کے خوف سے مرنے کو مناسب سمجھا اور کنوؤں میں کود کر جان دے دیں۔ پھانسی اور قتل و غارت کے بعد علمائے کرام اور تعلیم یافتہ لوگوں کو کالا پانی کی سزائیں دیں۔ جزائر انڈومان نکوبار کی جیل ان ہی لوگوں کی یادگار ہے۔ مرزا غالب نے نوحۂ دہلی 1857 پر اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دلی کا ذرّہ ذرّہ خاک　　تشنۂ خون ہے ہر مسلماں کا
گاہ چل کر کیا کیے شکوے　　سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم　　ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

بہادر شاہ ظفر بھی مالکِ دو جہاں سے فریاد کرتے ہیں سنیے:

مجھ عاشقِ جانباز کو کیوں تو نے ستایا
بتلا دے کسی بات میں باہر مجھے پایا
زندہ کو تو 'مردہ کیا' مردے کو جلایا
اے عیسیٰ دوراں تجھے کچھ رحم نہ آیا
کیوں چرخِ ستم گر، میرا یہ حال تباہ ہے
شہباز کو کنجشک کے پنجے میں رکھا ہے

مختصر یہ کہ پہلی جنگ آزادی نے بہادر شاہ ظفر کو تاریخ میں امر کردیا ہے۔ ان کی بیش بہا قربانیوں کو ہم فراموش نہیں کرسکتے ہیں۔ جب تک آپ کی شاعری کی آواز زندہ ہے تب تک آپ کا نام تابندہ رہے گا اور اس عظیم مردِ مجاہد کی قربانی کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ ان کی آواز ساری داستان کہہ جائے گی:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

حوالہ جاتی و استفادہ کردہ کتب

1. انقلاب 1857 تصویر کا دوسرا رخ: شیخ حسام الدین 1982
2. 1857 خمیازہ اور انعام: شمیم طارق، انقلاب بمبئی
3. اردو کا حبسیاتی ادب: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، اورنگ آباد
4. ہفتہ وار پٹنہ، 8 ستمبر 1984
5. نئی دنیا، دہلی، اگست 2010
6. کٹگھرے میں بہادر شاہ ظفر: ڈاکٹر ستیہ نارائن شرما (ہندی مضمون)
7. روزنامہ منصف حیدرآباد، 15 اگست 2006 سلیم باسط
8. 1857: ڈاکٹر اجمل فاروقی
9. 1857: آصف جیلانی لندن، اردو ٹائمز ممبئی 2007
10. ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی: محمد عادل انصاری قومی راج ممبئی، اگست 1982
11. بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد: رئیس احمد جعفری، لاہور

Dr. A. Aziz Irfan,Opp. Azad Collage
Hersul Road, National Colony, Plot No 34/2
Aurangabad - 431001 (MS)

مولانا آزاد

ایس ایم رحمت اللہ

ہندوستان کی ایک عبقری شخصیت

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہمہ جہت صلاحیتوں کی حامل ہے۔ وہ عالم دین بھی تھے اور مدبر بھی، مفسر قرآن بھی تھے اور مفکر بھی، بیباک صحافی بھی تھے اور شاعر و صاحب طرز ادیب بھی، صف اول کے سیاست داں بھی تھے اور بے مثال مقرر بھی، مکتوب نگار بھی تھے اور انشا پرداز بھی اور مجاہد آزادی بھی تھے اور وزیر تعلیم بھی۔ مزید یہ کہ لسانیات، لغات، اصطلاحات، ترجمہ، سائنس، تاریخ و جغرافیہ، منطق و فلسفہ، حدیث و فقہ، قیادت و سیاست اور تعلیم و ثقافت جیسے متعدد میدانوں میں انھوں نے مقام امتیاز حاصل کیا تھا۔ مولانا آزاد کی ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کرنا اور نمایاں خصوصیات کو ضبط تحریر میں لانا یقیناً جوئے شیر بہا لانے کے مترادف ہے۔

مولانا آزاد کی خانگی زندگی

مولانا ابوالکلام آزاد بتاریخ 11 نومبر 1888 مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام خیر الدین اور والدہ محترمہ کا نام عالیہ بیگم تھا۔ آزاد کا اصلی نام ابوالکلام غلام محی الدین، تاریخی نام فیروز بخت، لقب ابوالکلام اور تخلص آزاد تھا۔

مولانا آزاد اپنے بھائی اور بہنوں میں چھوٹے تھے۔ ان کی تین بڑی بہنیں اور ایک بڑا بھائی تھا۔ آزاد اپنے بھائی اور بہنوں میں نسبتاً بہت ذہین تھے۔ ان کے مزاج میں بچپن سے ہی مولانا جیسی صفات شامل تھیں۔ وہ بہت کم دوسرے بچوں کی طرح کھیلا کرتے تھے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی اور اس پر ان کی زبردست گرفت تھی۔ انھوں نے فارسی اور اردو زبانیں بھی سیکھیں اور ان پر عبور حاصل کیا۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی انھوں نے بخوبی واقفیت حاصل کی تھی۔ مذہبی تعلیم، فقہ، منطق علم کیمیا اور فلکیات کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا اور ریاضی، طب کی بھی تعلیم حاصل کی تھی۔

مولانا آزاد کے والد 1895 میں گر پڑے اور ان کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مکہ میں علاج سے پوری طرح صحت مند نہیں ہوئے۔ چنانچہ بغرض علاج مع اہل و عیال کلکتہ آ گئے اور یہاں علاج سے پوری طرح ٹھیک ہو گئے مگر مکہ واپس نہیں گئے۔ بتاریخ 15 اگست 1908 کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا آزاد کے گھر کا ماحول چونکہ تقلیدی عقائد کا حامل تھا لہٰذا مولانا کی پرورش انھیں عقائد کی پابندیوں میں ہوئی۔ تاہم مختلف علوم بالخصوص فلسفے کی تعلیم نے مولانا کے موروثی عقائد کو متزلزل کر دیا۔ لہٰذا انھوں نے تقلیدی عقیدے کو ترک کرتے ہوئے تحقیقی عقیدے کو اپنایا۔ 1907 میں مولانا کی شادی ان کے والد کے ایک مرید آفتاب الدین صاحب کی صاحب زادی زلیخا بیگم سے انیس برس کی عمر میں ہوئی۔ مولانا کے یہاں صرف ایک لڑکا پیدا ہوا مگر اس کا انتقال چار سال کی عمر میں ہی ہو گیا۔

مولانا آزاد چھریرے بدن و گورے رنگ کے مالک تھے۔ سگریٹ پیتے تھے اور چائے کا ان کو بہت شوق تھا۔ غبار خاطر میں ان کے چائے کے شوق کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ مولانا آزاد حق پرست، ذہین اور حوصلہ مند انسان تھے۔ ان میں حب الوطنی کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ اگر مولانا اپنے خاندانی عقائد و روایات کی پیروی کرتے تو ان کی ساری زندگی عیش و آرام میں گزر سکتی تھی مگر وہ وطن سے محبت کی بدولت آزادی کی جدوجہد میں کود پڑے۔ اس طرح اپنے لیے سیاست کے پر خار راستے کا انتخاب کیا اور تاعمر اسی پہ رہے۔

مولانا آزاد بحیثیت شاعر، ادیب اور صحافی

مولانا آزاد کی ذہنی تربیت بچپن سے ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں ادبی ذوق مزاج کا جز بن گیا چنانچہ مولانا کی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ عبدالواحد جو کہ اکثر مولانا کے گھر آیا کرتے تھے مولانا کو اکثر اشعار سنایا کرتے تھے۔ ان کی صحبت میں مولانا کو شعر گوئی سے رغبت ہوئی اور انھیں کی تجویز پر مولانا نے تخلص آزاد اختیار کیا۔ مولانا نے دس، گیارہ سال کی عمر سے اشعار کہنا شروع کیا اور شاعری کی تمام مشہور اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔

مولانا کے زمانے میں مختلف شہروں سے شعری گلدستے نکلا کرتے تھے جن میں مولانا چھپا کرتے تھے۔ ارمغان فرخ، نیرنگ عالم، انتخاب، سفینہ نجات صحن چمن، مخزن، الپنچ وغیرہ میں مولانا آزاد کے کلام کی کثرت سے اشاعت عمل میں آئی ہے۔ گلدستوں میں چھپنے، مشاعروں میں شرکت کرنے اور داد و تحسین کے پانے سے مولانا میں خود ایک گلدستہ شائع کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے 1899 میں کلکتہ سے ایک گلدستہ 'نیرنگ عالم' شائع کیا۔ اس کے آٹھ شمارے نکلے اور پھر وہ بند ہو گیا۔ ان دنوں مولانا آزاد اس خیال کے حامی تھے کہ بلند مقام کی تحصیل کے لیے مضامین کی اشاعت کرنا اور بلند تر مقام کی تحصیل کے لیے کسی اخبار یا رسالے کا مدیر ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مولانا نے شعر گوئی کا سلسلہ زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رکھا۔

مولانا آزاد نثر نگاری کی جانب متوجہ ہوئے اور ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں اور خود اپنے رسالوں اور اخباروں میں چھپتے رہے۔ مولانا کے مضامین میں کچھ دینی و علمی ہیں تو کچھ معلوماتی، کچھ تحقیقی ہیں تو کچھ اصلاحی، کچھ میں فکر و فلسفے کی گہرائی ہے تو کچھ میں انشا کا زور اور کچھ خطابت کا نمونہ ہیں تو کچھ اسلوب کا پیکر۔ مولانا نے نثر میں آراستہ و پیراستہ اسلوب کے ذریعے انفرادیت قائم کی۔ اس کے ذریعے وہ عوام کو نہیں بلکہ دانشوروں کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ مولانا کی تحریروں کی یہ خاص بات تھی کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے اس کا حق ادا کرتے تھے لہٰذا اس زمانے میں مولانا کی نثر اور اس کے اسلوب نے لوگوں کو بے حد متاثر کیا تھا۔ حسرت موہانی کو مولانا آزاد کی نثر کے آگے اپنی نظم پھیکی معلوم ہوتی تھی۔ لہٰذا خود انھوں نے ہی لکھا ہے:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مولانا ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی ہر تحریر کو اعلیٰ انشا

کی عمدہ مثال قرار دیا ہے۔ انھوں نے کیا خوب کہا ہے:

''مولانا کی ہر تحریر ایسی ہے کہ عش عش کرتے رہیں... جس کی تقلید ممکن نہیں۔ تحریر پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا سے پرے بہت پرے سے کوئی غیبی آواز بول رہی ہے۔''

مولانا آزاد کی شخصیت کا ایک اور تابناک پہلو ان کی صحافت نگاری ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا کی صحافت نگاری سے بے حد متاثر تھے۔ اس ضمن میں خود ان کے الفاظ اس طرح سے ہیں:

''وہ اپنے طرز و انشا کے جس طرح موجد ہیں اسی طرح اس کے خاتم بھی ہیں۔ تقلید کی کوشش بہتوں نے کی...... تقریباً سبھی ناکام رہے...... بحیثیت مجموعی ابوالکلام اپنی انشا پردازی میں اب تک بالکل منفرد و یکتا ہیں اور بظاہر احوال یہی نظر آتے ہیں کہ غالب کی طرح ان کی بھی یکتائی وقتی نہیں مستقل ہے۔ حال ہی کے لیے نہیں مستقبل کے لیے بھی۔''

مولانا آزاد نے جنوری 1901 میں 'المصباح' کے نام سے ایک ہفتہ وار جاری کیا۔ اس میں مولانا آزاد کے علاوہ دوسروں کے مضامین کی اشاعت بھی عمل میں آتی تھی۔ اس ہفتہ وار میں 'ایڈیٹر کے قلم سے' کے تحت مولانا آزاد ایک کالم لکھا کرتے تھے۔ یہ اخبار بھی زیادہ دنوں تک چل نہ سکا۔ ان دنوں لکھنو سے نوبت رائے نظر کی ادارت میں ایک ماہنامہ 'خدنگ نظر' 1897 سے نکلا کرتا تھا جو کہ ایک شعری گلدستہ تھا اور جس میں مختصر سا نثری حصہ بھی ہوا کرتا تھا۔ اس گلدستے میں مولانا آزاد کے علاوہ ان کے بڑے بھائی ابو النصر آہ اور ان کی دونوں بڑی بہنیں فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو چھپا کرتی تھیں۔ 1902 میں اس گلدستے کے نثری حصے کی توسیع عمل میں آئی اور 1903 میں مولانا آزاد بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر اس کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے اور نثری حصے کی ایڈیٹنگ کے فرائض انجام دینے لگے۔ تاہم تقریباً سوا سال بعد مولانا آزاد نے اس ماہنامے سے علاحدگی اختیار کرلی اور ایک قلیل مدت کے لیے شاہجہاں پور کے اخبار 'ایڈورڈ گزٹ' کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

نومبر 1903 میں کلکتہ سے ایک ماہنامہ 'لسان الصدق' جاری کیا۔ اس ماہنامہ کے ابتدائی شمارے میں ہی مولانا نے اس کے مقاصد کو واضح کیا۔ مولانا مختلف علمی و ادبی جلسوں میں مقرر کی حیثیت سے مدعو کیے جانے لگے اور ان کا انداز خطابت سامعین کو بے حد متاثر کرنے لگا۔ پندرہ سولہ سال کی کم عمر میں خطیبانہ لہجے میں تقریر کرنا اور لسان الصدق جیسے موقر ماہنامے کی ادارت کے فرائض انجام دینا مولانا آزاد کے غیر معمولی کارہائے نمایاں تھے۔ لسان الصدق کی اشاعت تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہی اور مولانا آزاد کی باصلاحیت ادارت کے باعث اس رسالے نے صحافتی دنیا میں بقول مالک رام 'دھوم مچادی'۔ احسن الاخبار، تحفۂ احمدیہ، الندوہ، وکیل، دارالسلطنت، اقدام، پیغام اور الجامعہ جیسے اخبارات اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو صحافت میں 'الہلال' ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ایک ہفتہ وار رسالہ تھا جو کہ مولانا آزاد کی زیر ادارت بتاریخ 13 جولائی 1912 کلکتہ سے جاری ہوا تھا۔ اس رسالے کی اشاعت کو 18 جنوری 1914 کا شمارہ شائع ہونے کے بعد بند کردینا پڑا۔ کیوں کہ انگریزی حکومت نے اس رسالے کی دو ہزار روپیوں کی پرانی ضمانت کو ضبط کرتے ہوئے دس ہزار روپیوں کی نئی ضمانت کا مطالبہ کیا تھا۔

الہلال کے بند ہونے کے ایک سال بعد مولانا نے اپنی زیر ادارت الہلال کی ہو بہو نقل کرتے ہوئے ہفتہ دار 'البلاغ' کو بتاریخ 12 نومبر 1915 جاری کیا۔ نیاز فتح پوری نے الہلال اور البلاغ کا آپس میں تقابل بڑے ہی خوب صورت انداز میں اس طرح سے کیا ہے:

''الہلال کے بعد مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا لیکن طریقۂ ابلاغ کچھ مختلف تھا۔ تیور وہی تھے لیکن رخ دوسرا تھا۔ انداز قدر وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال نفسیات عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیات ذہنی کا۔ الہلال حرکت و عمل، جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔''

انگریزی کی حکومت کی جانب سے مولانا کے صوبہ بدر کردیے جانے پر اپریل 1916 میں البلاغ کو بھی بند کردینا پڑا۔ تحریک آزادی کی مصروفیات کی بدولت مولانا آزاد کئی سال تک صحافت سے دور رہے۔ تاہم ان کی صحافتی خدمات کا آغاز پھر سے اس وقت ہوا جب الہلال کے دوسرے دور کے پہلے شمارے کی اشاعت بتاریخ 10 جون 1927 عمل میں آئی۔ مگر انگریزوں کی سازشوں اور مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات کے باعث 9 دسمبر 1927 کے شمارے کی اشاعت کے بعد اس کو بھی بند کردینا پڑا۔ اس طرح مولانا آزاد کا صحافتی سفر جس کا آغاز 1899 میں ہوا تھا 1927 میں اختتام کو پہنچا۔

اس مرحلہ پر مولانا آزاد کی تصنیفات کا ذکر کرنا اشد ضروری ہے۔ غبار خاطر، تذکرہ، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی اور ترجمان القرآن مولانا کی اہم کتابیں ہیں۔ انڈیا ونس فریڈم، بھی مولانا کی ہی ایک کتاب ہے جس کو ہمایوں کبیر نے تحریک آزادی سے متعلق مولانا کے دیے گئے ڈکٹیشن پر انگریزی میں تحریر کیا تھا۔ اس کے چند اردو تراجم کی اشاعت 'ہماری آزادی' کے نام سے عمل میں آچکی ہے۔ مزید یہ کہ مولانا کی چند مختصر تحریروں کو کتابچوں کی شکل میں شائع کیا گیا ہے جن میں اہم اعلان الحق، مسلمان عورت، مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب، قول فیصل، داستان کربلا، الحریت فی الاسلام، اسلام اور آزادی، اسلام اور نیشنلزم، اسلام کا نظریہ جنگ، میرا عقیدہ وغیرہ ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا کے مکتوبات کو بھی کتابوں کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ جن میں غبار خاطر، نقش آزاد، تبرکات آزاد، کاروان خیال اور مکتوبات آزاد اہم ہیں۔ مزید برآں ماقبل و مابعد آزادی ہند مختلف موقعوں و موضوعات پر دیے گئے مولانا آزاد کے خطبات پر مشتمل 'خطبات آزاد' نامی کتاب کی اشاعت اردو زبان میں اور "Speeches of Maulana Azad1947-58" نامی کتاب کی اشاعت انگریزی زبان میں عمل میں آئی ہے۔ یہ کتابیں کافی مشہور و مقبول ہیں۔

مولانا آزاد بحیثیت مجاہد آزادی اور ان کی سیاسی بصیرت

مولانا آزاد نے تین وجوہات سے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

پہلی وجہ انگریزی حکومت کا تقسیم بنگال کا فیصلہ تھا۔ مولانا تقسیم بنگال کے مخالف تھے۔

دوسری وجہ مولانا کا مصر، شام، ترکی وغیرہ جیسے ملکوں کا دورہ تھا جہاں پر ان کی ملاقات چند انقلابی قائدین سے ہوئی اور جن کی تحریک سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ان کو ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لینا چاہیے اور مسلمانانِ ہند کو تحریک آزادی میں پوری طرح شامل ہونے کی ترغیب دینی چاہیے۔

تیسری وجہ ان کا عالم دین اور مفکر ہونا تھا۔ جس کی بدولت وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ طلب آزادی دراصل شرعی تقاضا اور فرض دینی ہے۔ جس کی تکمیل کے لیے ملک کی سیاست میں نمایاں حصہ لینا چاہیے۔

مذکورہ وجوہات سے مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت بھی واضح ہوتی ہے۔

مولانا کی سیرت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ان میں بڑا جوش اور ولولہ تھا اور اگر وہ کوئی فیصلہ کر لیتے تو ہر حالت میں اس پر برقرار رہتے تھے۔ مولانا نے جس وقت ہندوستانی سیاست میں دلچسپی لینے کا فیصلہ کیا اس وقت ان کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال تھی۔ وہ اپنے فیصلے پر برقرار رہے اور تاعمر سیاست سے کنارہ کشی اختیار نہ کی۔ تحریک ترک

موالات، تحریک ہندوستان چھوڑو، قانون نمک کے خلاف تحریک، دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزوں سے عدم تعاون کی تحریک، غرض کہ ہندوستان کی آزادی کی تمام تحریکوں میں مولانا آزاد پیش پیش رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بھی مولانا آزاد نے تحریکِ آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے 1923 اور 1940 میں دو مرتبہ مولانا آزاد کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف ہندوستان چھوڑو تحریک کی قرار داد کی منظوری دراصل مولانا آزاد کی صدارت میں ہی بتاریخ 18 اگست 1942 ہوئی تھی۔ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے مولانا نے کافی مصیبتیں جھیلیں تھیں۔ حکومت بنگال نے مولانا کو مارچ 1916 میں ریاست بدر کیا تھا۔ دوسری کئی ریاستوں نے بھی ان کے داخلے پر امتناع عائد کیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ کلکتہ سے نکل کر رانچی میں مارچ 1916 سے ستمبر 1919 تک نظر بند رہے۔ انگریز سرکار نے کئی مرتبہ مولانا کو گرفتار کیا اور محروس رکھا۔ مولانا کی جملہ محروسی کی مدت کوئی دس سال پر محیط ہے۔

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ حصول آزادی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد قائم ہو اور مسلمان قومی سیاست میں عملی طور پر حصہ لیں۔

مولانا آزاد گو کہ سرسید احمد خان کی تحریروں سے کافی متاثر تھے لیکن ان کی مسلمانوں کے سیاست سے دور رہنے کی پالیسی کی مولانا نے الہلال کے ذریعے مخالفت کی۔ مولانا نے مذہب کا سہارا لیتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام آزادی کا علمبردار ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے دوسری قوموں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ مولانا کا انداز کامیاب ثابت ہوا اور الہلال نے مسلم سیاست کا رخ بدل دیا۔ کل تک جو کانگریس سے دور تھے وہ جوق در جوق کانگریس میں شامل ہونے لگے۔

جدوجہد آزادی سے متعلق مولانا آزاد کا ایک اور عظیم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے تحریک خلافت اور تحریک آزادی کو ایک پلیٹ فارم پر لاتے ہوئے گاندھی جی، لوکمانیہ تلک اور دیگر کانگریسی قائدین کے علاوہ سماج کے اکثریتی طبقے کی تائید تحریک خلافت کے حق میں حاصل کی۔ اس طرح مولانا نے ملک کے دو بڑے فرقوں کو انگریزوں کی استبدادی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد کیا۔

مولانا آزاد ملک کی تقسیم کے خلاف تھے وہ عجلت میں ملک کی آزادی حاصل کرنے پر ہندو مسلم اتحاد کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ اسلامی قومیت کے نظریے کے تحت مسلم لیگ کی جانب سے پیش کردہ دو قومی تصور کے خلاف تھے۔ ملک کی تقسیم سے حاصل ہونے والی آزادی انھیں کبھی قبول نہیں تھی۔ اس ضمن میں ان کا ایک قول کافی مشہور ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کردے کہ سوراج چوبیس گھنٹوں کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوگی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر ہمایوں کبیر، مالک رام وغیرہ نے مولانا کے تصور قومیت کی تحسین کی ہے۔ لیکن ملک کے حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ مولانا کو بادل نخواستہ ملک کی تقسیم کو تسلیم کرنا پڑا۔

مولانا آزاد کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا تھا:

''مولانا' انڈین نیشنل کانگریس کے سردار ہیں اور ہندوستانی سیاست کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کو چاہیے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے۔''

مولانا آزاد بحیثیت وزیر تعلیم

مفکر تعلیم ماہر تعلیم سے بھی بالا رتبے کا حامل ہوتا ہے۔ کیوں کہ ماہر تعلیم، تعلیمی نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے تعلیم کی ترقی کے لیے کوشش کرتا ہے جب کہ مفکر تعلیم، تعلیمی نظام کی تشکیل کرتا ہے۔ مولانا آزاد کا شمار مفکرین تعلیم میں ہوتا ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے بلیغ افکار سے ہندوستانی تعلیمی نظام کو ایک نیا رخ، نئی جہت اور ٹھوس بنیادیں عطا کیں۔

مولانا آزاد کا تعلیم کے بارے میں ایک عظیم نظریہ تھا وہ چاہتے تھے کہ ذات پات اونچ نیچ اور جنس کی تفریق کے بغیر اعلیٰ معیار کی تعلیم سب کو میسر ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ سماج میں لبرل، جدید اور عالمی معیار کی تعلیم کا نظام ہو، جس میں ہندوستانی فنون، ثقافت اور انسانی اقدار کی نمایاں جھلک ہو۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ پرائمری تعلیم مادری زبان میں مہیا کرائی جائے اور یہ تعلیم چودہ سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے مفت کردی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ لڑکیوں کی تعلیم، ووکیشنل ٹریننگ، زراعتی تعلیم اور تکنیکی تعلیم بھی سرکار کی طرف سے مہیا کرائی جائے۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ انگریزی زبان سیکھی اور سکھائی جائے۔

مولانا آزاد نے تین مرتبہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ملک کی آزادی سے قبل ہی ستمبر 1946 میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد وزیر اعظم پنڈت نہرو کے اصرار پر مولانا آزاد پہلی مرتبہ بتاریخ 15 جنوری 1947 وزارات میں شامل ہوئے تھے۔ گاندھی جی کے مشورے پر انھیں وزیر تعلیم کا قلمدان دیا گیا اور بعد میں سائنس اور کلچر کی اضافی ذمے داری بھی ان کے سپرد کی گئی۔ 1952 کے عام انتخابات کے بعد بھی مولانا آزاد وزیر تعلیم بنے۔ قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیقات کی اضافی ذمے داریوں کا بوجھ بھی ان پر ڈالا گیا۔ 1957 کے دوسرے عام انتخابات کے بعد بھی وزیر تعلیم کا قلمدان ان ہی کے سپرد کیا گیا۔ اس مرتبہ بھی سائنسی تحقیقات کی اضافی ذمے داری ان کے حوالے کی گئی۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ تعلیم کے ذریعے طالب علم کی مکمل شخصیت کی تشکیل ہو۔ انھوں نے بحیثیت وزیر تعلیم کئی کارہائے نمایاں انجام دیے۔

مولانا آزاد نے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے سنٹرل اور اسٹیٹ دونوں سطحوں پر تعلیمی نظام میں عصری ضروریات کے پیش نظر تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ ابتدائی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم اور ہندوستانی ثقافت کی ترقی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ کی تربیت کے لیے انھوں نے Central Institute of Education قائم کیا۔ اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے انھوں نے UGC جیسا ادارہ قائم کیا، یونیورسٹیوں کو خود مختاری عطا کی اور ان کو Centre for Excellence کے طور پر ترقی پانے کے مواقع فراہم کیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے لیے Centre for Scientific Industrial Research کو قائم کیا اور Indian Council for Cultural Relations کے قیام کو عمل میں لاتے ہوئے ہندوستانی کلچر، ثقافت، تاریخ اور تہذیب ہندوستان اور بیرونی ممالک میں فروغ کے لیے کوشش کی۔ علاوہ ازیں مولانا آزاد نے سنگیت ناٹک اکادمی، ساہتیہ اکادمی اور للت کلا اکادمی جیسے ثقافتی ادارے بھی قائم کیے۔

مولانا آزاد ایک شاعر، ادیب، مفسر، محدث، مفکر، صحافی، مجاہد آزادی اور وزیر تعلیم کی بھرپور ستر سالہ زندگی گزار کر بتاریخ 22 فروری 1958 دہلی میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ■

Prof. S M Rahmatullh, Rajistarar, MANUU, Gachchi Bowli, Hyderabad (AP)

رئیس الدین رئیس

انسانی قدروں کے ترجمان
طوطی ہند امیر خسرو
اور مہاکوی کبیر

طوطی ہند امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین جو وسط ایشیا میں شہر بلخ کے آس پاس واقع قبیلہ 'لاچین' کے ایک قوی وجری سردار تھے، وہ فتنہ چنگیز کی تباہ کاریوں سے عاجز آکر ہندوستان کے لیے آمادہ ہجرت ہوئے اور شاہِ مملکت شمس الدین التمش کی پناہ میں آکر اپنی خوبی شجاعت اور حسنِ کردار سے شاہ وقت کا دل جیت لیا۔ خوش ہوکر التمش نے انھیں ایٹہ میں گنگا کے کنارے واقع پٹیالی کا علاقہ بطور جاگیر سونپ دیا۔ انھوں نے دلی کے باشکر و بااختیار سیہ فام سردار عمادالملک کی بیٹی دولت ناز سے شادی کی اور انھیں کے بطن سے یمین الدین نے جنم لیا اور بڑے ہوکر یہی یمین الدین امیر خسرو کہلائے۔ ان کی پیدائش سے لے کر موت تک ان کی والدہ کی عمر اپنے والد کے یہاں بسر ہوئی اس طرح امیر خسرو بھی اپنے نانا کے یہاں دہلی میں پروان چڑھ کر بڑے ہوئے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا خسرو آٹھ برس کے تھے۔ خسرو کے حوالے سے وہ 1254 میں پیدا ہوئے تھے اور وہ اوائل عمری سے ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔

خسرو کی عالمانہ استعداد کے تناظر میں سلیمان اشرف فرماتے ہیں:

''امیر خسرو کی ذات ایک بے مثل، مایہ ناز وفخر ہے۔ وہ صوفی کے لحاظ سے فنافی اللہ، ندیم کی حیثیت سے ارسطوئے زمانہ، عالم کی حیثیت سے متبحر علامہ، موسیقی میں امام المجتہد مورخ کی حیثیت سے بے نظیر محقق اور شاعر کی حیثیت سے ملک الشعرا ہیں۔''

خسرو نے اپنی زندگی کے بہتر سال التمش تا محمد تغلق، لگا تار پانچ بادشاہوں کے درباری اور مصحف برداری کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں صرف کردیے۔ انھوں نے پانچ دیوان مرتب کیے اور پانچ تاریخی نوعیت کی عظیم مثنویاں تخلیق کیں جن کو 'رسائل الاعجاز' میں یکجا کیا۔ وہ پانچ زبانوں پر قدرت کاملہ رکھتے تھے اور انھیں پانچ علوم پر بھی یکساں عبور حاصل تھا۔ فارسی میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی، مخمس اور مسدس کے علاوہ آپ نے ہندی میں دوہے، گیت، کہمن، کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں بھی تخلیق کیں۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے وہ اپنے قول و عمل، سیرت و کردار اور تمام تر تہذیبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور ذاتی سطح پر اپنے اوصاف وخصوصیات کی بنا پر ایک بہترین و بے نظیر انسان کی شکل میں نظر آتے ہیں ان کی عملی زندگی اصلاً ایک ایسا صاف و شفاف آئینہ ہے جس میں اعلیٰ انسانی قدروں (Human Values) کی جھلک نمایاں نظر آتی ہیں۔

بلا امتیاز و مذہب وملت اور بلا تفریق رنگ ونسل وہ سیاسی غداروں اور منافقوں کے خلاف سخت گیر رویے کے حامل تھے۔ وہ چاہے شہنشاہ ہندوستان ہو یا ولی عہد سلطنت یا صوبائی گورنر، وہ جس کی بھی ملازمت کرتے تھے اس کے وفادار بن کر رہتے تھے اور اپنے ذاتی عقائد و نظریات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے فرائض منصبی ادا کرتے تھے۔ ان کا واسطہ خوش خصال شاہوں سے بھی پڑا اور بدکردار فرماں رواؤں سے بھی مگر انھوں نے اپنے کام سے کام رکھا۔ یہاں تک کہ قطب الدین خلجی جو مبارک شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جیسے ڈومینوں، بھانڈوں اور بدتمیز مسخروں میں گھرے رہنے والے، زنانے لباس میں ملبوس اور دربار کو چنڈو خانہ بنا دینے والے اغلام باز شاہ کی درخواست پر جب وہ تاریخ مثنوی 'نہ سپہر' تخلیق کرتے ہیں تو اس میں شاہ کے جملہ اوصاف کا کھلے دل سے ذکر کرتے ہیں اور پیشہ مصحف برداری کو اپنے احساس تنفر سے داغ دار نہیں ہونے دیتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ جنگی محاربوں میں شامل ہوتے ہیں تو اس وقت وہ محض ایک سپاہی ہوتے ہیں اور اس کے برعکس جب وہ اپنے مرشد اعلیٰ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے دربار میں حاضری دیتے ہیں تو درباری شان وشوکت کے لباس کے بجائے سادہ لباس زیب تن کر لیتے ہیں۔ خدا سے، شیخ سے، خدا کے بندوں سے اور انسانیت آمیز اصولوں سے ان کی محبت ہی ان کی اعلیٰ قدروں کا حقیقی شناس نامہ ہے۔ جب ان کے پیر طریقت محبوب الٰہیؒ کا وصال ہوا آپ ترہت کے محاذ پر تھے، وہاں جیسے ہی انھیں اپنے پیر کی رحلت کی خبر ملی ان پر بجلی سی گر پڑی، انھوں نے سر منڈوالیا، کپڑے پھاڑ لیے، چہرے پر کالک مل لی اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے دلی پہنچے اور کہا اب میرے لیے زندہ رہنا مشکل ہے اور ہوا بھی یہی آپ اس سانحے کے بعد بمشکل چھ ماہ زندہ رہ کر انتقال فرما گئے۔ پیر کے لیے کہا ان کا یہ دوہا امر ہو چکا ہے:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھوں دیس

عشق و عاشقی بذات خود ایک ارفع واعلیٰ قدر ہے۔

غزل میں فرضی محبوب کا ذکر جمالیاتی مسرت کے حصول سے زیادہ ایک شعری ضرورت بھی ہے کیونکہ محبوب کے وسیلے سے شاعر کو یہ سہولت مل جاتی ہے کہ وہ اس کی آڑ میں انسانیت نوازی انسان دوستی، پاسِ ادب، رشتوں کے احترام اور عقیدت ومحبت کی حرمت کے جذبات کو عام کر سکے اس لیے کلاسیکی دور سے لے کر ترقی پسند دور تک کے شعرا کے یہاں انسانی قدروں کا ذکر ہمیں عشق و عاشقی کے مضامین میں ہی نہیں ملتا ہے۔ ارضی حقیقتوں زمینی سچائیوں اور عصری مسائل کو موضوع بنا کر شعر کہنے کا رواج تو

جدیدیت اور مابعد جدید دور کی دین ہے۔امیر خسرو تیرہویں صدی کے کلاسیکی شاعر ہیں۔ ان کی فارسی کی غزلوں میں محبوب کا جو ادب و احترام ملتا ہے وہ صالح انسانی قدروں کا احترام ہے۔ ذیل میں خسرو کی فارسی غزلوں کے اردو میں ترجمہ کیے گئے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن میں اعلیٰ انسانی قدروں کی جھلک موجود ہے جیسے حسن و عشق اور عشقیہ واردات و تجربات کے آئینے میں ہی دیکھا جاسکتا ہے:

دل میں اس کی یاد تھی شعلہ فشاں
عشق میں بن کر میں پروانہ رہا
جا رہے تھے لوگ مسجد کی طرف
میں روانہ سوئے بت خانہ رہا
جان و دل اور تن بدن اس کا خیال
ایک تھے پر میں ہی بیگانہ نہ رہا

مت کہہ کہ کسی اور کو چاہوں اگر ہو بھی
ملتا ہے حسیں تجھ سا زمانے میں کہاں اور
اب تو ہی بتا کس طرح زندہ رہے خسرو
تھا خود وہ کہیں اور مگر جان جہاں اور
خاکِ پا تیری مری خوئے نیاز
عاشقی کا میں پھر کروں آغاز
میں گھوموں یوں ترے کوچے میں لے کر
دل پر خوں گریباں پارہ پارہ

نرگن بھگتی کے مہاکوی کبیر نے 1518 میں انتقال فرمایا تھا اور جہاں تک ان کی پیدائش کا تعلق ہے صحیح معلومات کسی کو بھی نہیں ہے۔ مختلف ذرائع سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ ان کے والد کا نام نیرو اور ماں کا نام نیما تھا۔

نیز کمال اور کمالی ان کے بیٹا بیٹی تھے۔

گاگرون گڑھ کے راجپوت راجہ پیپا جو کبیر کے پیر بھائی بھی تھے ان کا کہنا ہے کہ نرگن بھگتی کی روایت کو مستحکم کرنے اور اُسے زندہ رکھنے کا سہرا کبیر کے سر بندھا ہے ورنہ تو وید، لوک اور کلجگ اسے کب کا نگل چکے ہوتے۔ وید سے یہاں مراد مذہبی بالادستی سے ہے جب کہ لوک سے مراد عہد وسطیٰ کے پندرہویں صدی کے اُس سماج سے ہے جو ضعیف الاعتقادی اور بے سروپا رسم و رواج میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ کلجگ علامت ہے مذہبی منافرت، ذات پات کی تفریق، دوسروں کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھنا اور جارحیت و تشدد کی طرف جھکاؤ۔

کبیر نے ان سماج دشمن رجحانات و میلانات، رسم و رواج اور ذات پات کے بھید بھاؤ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور ان کے خلاف نکتہ چینی کا اپنی کویتاؤں میں باقاعدہ ایک محاذ قائم کر لیا۔ اُن کی نرگن بھگتی کے دو زریں اصول ہیں بھگوان سے اور بھگوان کے بندوں سے پریم کرنا اور دکھ سکھ میں ان کے کام آنا نیز انھیں سماجی برائیوں کی جکڑ بندیوں سے رہائی دلانا۔ ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ اور فطری آزادی کی نعمت سے انھیں مالا مال کرنا۔ وہ برہمن کو اس لیے بڑا نہیں مانتے کہ وہ اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہے اور شودر کو وہ اس لیے چھوٹا نہیں مانتے کہ وہ نچلی ذات کا ہے۔ وہ اچھے برے اور اعلیٰ و ادنیٰ میں تمیز کا پیمانہ انسانی اعمال کو بناتے ہیں۔ اگر کوئی برہمن کا بیٹا ہے اور اعمال اُس کے برے ہیں تو اس کے سبھی بندے چاہے وہ برہمن کے گھر میں پیدا ہوں یا شودر کے گھر میں بس ایک سمان ہیں۔ وہ خاندانی شان و شوکت، ذات کی افضلیت اور دولت و شہرت کے بل پر کسی کو قدر و منزلت کا حقدار تسلیم نہیں کرتے۔ وہ انسان کو اس کے انسانیت آمیز رویے اور اس کے عملی اوصاف سے بڑا مانتے ہیں۔ ان کی بھگتی محض انسانی قدروں (Human Values) کو ہی خاطر میں لاتی ہے۔ سماجی برائیوں کو دور کرنے کا ان کا سب سے موثر آلہ بھگوان سے اور ہر طبقے کے انسانوں سے ان کا پریم یا محبت ہے۔ ان کے معتقدات اور نظریات کا انحصار و دار و مدار ان کے اسی پریم پر ٹکا ہوا ہے۔ ان کے خیالات، نظریات، قلبی واردات، تجربات اور جذبات و احساسات سبھی میں ان کے پیار کا بے لوث جذبہ متحرک نظر آتا ہے۔ پریم ہی ان کا سب سے طاقتور ہتھیار ہے جس کی مدد سے وہ عام انسانی قدروں کے تحفظ کا کام لیتے ہیں۔ اُن کے ذاتی، مذہبی اور سماجی سبھی سروکاروں میں پریم کی گنگا جمنا بہتی نظر آتی ہے۔ وہ ساری دنیا کو ہی پریم کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں بھگوان کے پریمی بھگتوں کی ذات ہی سب سے بلند و برتر اور قابل تعظیم ذات ہے۔ ان کے مطابق اس ذات میں یونہی شمولیت ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے کڑی ریاضت، تپ و تپسیا اور تزکیہ نفس درکار ہے۔ سادھک یا سادھو کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قلب کے آئینے پر جمی دھول مٹی کو صاف کرے اور اپنے قلب کو روشن کر کے طہارت و تقدس کے اعلیٰ معیار سے متصف ہو جائے۔ جب وہ اپنی ریاضت کے بل پر یہ بلند مقام حاصل کر لے گا تو اس کی الوہیت کی منزل مقصود اس کے سامنے آ جائے گی اور وہ خود بخود دیکھ لے گا کہ اس کی محبت میں بے قرار ہو کر بھگوان کبیر، کبیر پکارتا ہوا خود اس کے پیچھے آئے گا:

کبیر من نرمل بھیا، جیسے گنگا نیر
پانچھے لاگا ہری پھرے، کہت کبیر، کبیر

کبیر جتنا پیار بھگوان سے کرتا ہے اتنا ہی وہ اس کے بھگتوں اور سماج کے افراد سے بھی کرتا ہے۔ ان کے اس پریم میں ایک خاص توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ اپنے اس پریم سے انھوں نے بھگوان اور اس کے بندوں کو باہم قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شعری کہکشاں اور ان کے ظاہر و باطن میں بھی اس پریم کو جلوہ گر دیکھا جاسکتا ہے۔ کبیر نے پریم کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ وہ زمانے بھر کے مردوں اور عورتوں میں اپنے خالق کا جلوہ دیکھ کر مست و سرشار ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے جہاں سماجی رشتوں ناتوں کو بھگوان کے بندھن میں باندھا ہے وہیں انھوں نے معاشرے میں ایکتا، یکجہتی اور انسانی حقوق کے تحفظ پر بھی زور دیا ہے نیز انھوں نے انسانی قدروں کو بھی اعتبار و افتخار عطا کیا ہے۔ ''جے تی عورتاں کہیے سب میں روپ تمھارا'' کا خالق کبیر کسی ایک جاتی، ایک برادری، ایک قبیلے اور کسی گروہ کا فرد نہ ہو کر ساری جاتیوں، قوم قبیلوں کا ترجمان ایک ایسا وسیع النظر اور ذہین انسان ہے جو انسانوں کے حقوق کے تحفظ اور ظلم و تشدد سے دور رکھ کر انھیں حقیقی و فطری آزادی کی فضا میں سانس لینے اور امن و سکون کی زندگی بسر کرنے کی بشارت دیتا ہے۔

■

Raeesuddin 'Raees'
10/1725, Dehli Gate, Aligarh- 202001 (UP)

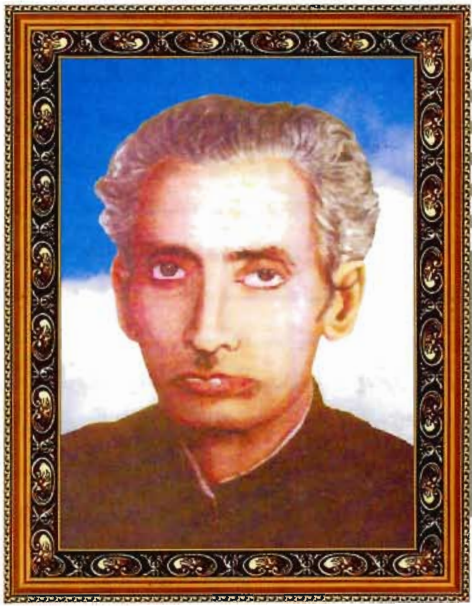

فاروق ارگلی

شاعرِ حقیقت

نشور واحدی

بیسویں صدی میں اُردو شاعری کی تاریخ کا وہ سنہرا دور ہی تھا جب اقبال کا الہامی پیغامِ بیداری تمام سوادِ مشرق میں گونج رہا تھا، جب جوش کی انقلابی گھن گرج سے برِصغیر کی فضائیں لرزہ براندام تھیں، جگر، فراق، مجاز اور جذبی کی دلنواز نغمگی جذبوں کی آنچ بن کر روحوں کو گرما رہی تھی، ایسی لازوال آوازوں کے ساتھ ہی ایک مدھم، سریلی اور سماعتوں کو چونکانے والی آواز بھی سنائی دے رہی تھی جس میں فن کی تازگی، فکر کی متانت، حقیقتوں کی اثر آفرینی اور غزل کی روایتی لطافت کے ساتھ ایک نیا رنگ و آہنگ تھا، بات کہنے کا نرالا اسلوب کہ پرانا مضمون بھی نیا نیا معلوم ہو، سلاست و سادگی میں جیسے جادو بھر دیا گیا ہو:

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتا ہے

دلوں میں اُتر جانے والی یہ آواز تھی شاعرِ حقیقت نشور واحدی کی، جن کی تخلیقی انانیت نے مروّجہ غزل کی روایات و تلازمات کی پاسداری کے ساتھ اپنی الگ راہ بنائی اور اپنی جداگانہ شناخت قائم کی، نشور کی اس خصوصی پہچان اور شاعرانہ انفرادیت کی اساس ہے ان کا فلسفیانہ اور متصوفانہ فکری عمق، انسانی جذبات و احساسات کی حقیقت آمیز ترجمانی، مطالعے و مشاہدے کی فراوانی اور زبان و بیان کی شیرینی۔ اپنی خداداد صلاحیتوں اور انتھک ریاضتوں کی بنا پر ایک مفکر و دانشور شاعر کی حیثیت سے شہرت اور قبولیت کے اس مرتبے پر فائز ہوئے، جس کا ذکر کیے بغیر اُردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ بلاشبہ وہ اپنے عہد کے کامیاب نغز گو تھے، جیسا کہ نشور کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ہم عصر ناقد پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

''غالب نے کہا تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے اور معنی آفرینی کی جان نغز گوئی ہے، نشور واحدی کی اچھی غزلوں میں نغز گوئی کی مثالیں ملتی ہیں، ان کی غزلیں سجیلی ہیں بناوٹی نہیں ہیں، ان میں آرائش ہے تصنع نہیں کیونکہ انھوں نے اپنی شاعری کی آبیاری خونِ جگر سے کی ہے اس لیے ان کی کیاریاں شگفتگی اور شادابی سے لہلہا رہی ہیں۔''

خود نشور واحدی نے اپنی شاعری کے بارے میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے:

فکر میں وسعت ہو اور گہرا ہو کچھ رنگِ غزل
جانتے ہیں سب نشور اس طرز کا بانی مجھے

وقت نے ثابت کردیا ہے کہ نشور واقعی اپنی فکری وسعت اور غزل کی گہری رنگت کے حوالے سے واقعی اپنے طرز کے بانی ہیں، ان کی شاعرانہ خلاقی اور علمی و فنی عظمت پر تفصیل سے گفتگو کے لیے ایک دفتر چاہیے، تاہم ان کے چند اشعار سے ہی اس کا اندازہ بہ آسانی ہوسکتا ہے:

اپنا نشور انداز جدا ہے فکرِ حسیں سے آہِ رسا تک
ہم نے فضائے لالہ و گل میں برق و شرر کو روک لیا ہے

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اِک سلسلۂ دارورسن ہم نے بنایا

حقیقت جس جگہ ہوتی ہے تابانی بتاتی ہے
کوئی پردے میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے

حسن کیا چیز ہے پوچھو یہ مری نظروں سے
آئینہ ہاتھ سے رکھ دو ابھی دیکھا کیا ہے

میری آنکھوں میں ہیں آنسو تیرے دامن میں بہار
گل بنا سکتا ہے تو، شبنم بنا سکتا ہوں میں

گل رنگیں یہ کہتا ہے کہ کھلنا حسن کھونا ہے
مگر غنچہ سمجھتا ہے نکھرتا جارہا ہوں میں

نشور آلودۂ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے
یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

حیات تامامات ایک سلسلہ ہے عشق کا
کہاں ہیں وہ جو مرگ کو حیات کہتے آئے ہیں

جو سماج آج ہے کل نہ تھا جو مزاج کل تھا وہ اب نہیں
کسی اِک نظامِ حیات کو جو ثبات ہو تو بتایئے

نشور کی کائناتِ غزل میں موضوعات کی ایک کہکشاں جگمگا رہی ہے۔ ان کی مجتہدانہ خلاقی نے بلامبالغہ غزل کو ترسیل و ابلاغ کی اس نئی راہ پر گامزن کیا کہ وحشی صنفِ سخن قرار دینے والے سخت گیر مغرب زدہ ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد کو اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑا۔ اس ضمن میں معروف ادیب و مبصر رضوان احمد بیان کرتے ہیں:

''غزل شکن ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد کے آخری دنوں میں مجھے ان کی خدمت میں حاضری دینے کا موقع ملتا رہا، وہ جوانی میں جتنے خاموش رہا کرتے تھے، آخری

ایام میں اتنا ہی بولنے لگے تھے۔ ایک ذرا سا چھیڑ دیجیے پھر دیر تک بولتے رہتے تھے۔ غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہنے والا ناقد اپنے ہی قاعدے کلیے سے دست بردار ہوگیا تھا۔ میں نے ایک دن پوچھا: 'آپ تو غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہتے تھے، پھر اس کے قائل کیسے ہوگئے؟' انھوں نے کہا: 'میں ایک روز ریڈیو سن رہا تھا تو اس پر مشاعرہ براڈ کاسٹ ہونے لگا، ایک شاعر بڑے اچھے لحن سے غزل پڑھ رہے تھے، ان کی غزل کے اشعار نے جیسے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، میرے اندر ایک کوندا سا لپک گیا، وہ اشعار تھے:

یہی کانٹے تو کچھ خوددار ہیں صحنِ گلستاں میں
کہ شبنم کے لیے دامن تو پھیلایا نہیں کرتے
سلیقہ جن کو ہوتا ہے غمِ دوراں میں جینے کا
وہ یوں شیشے کو ہر پتھر سے ٹکرایا نہیں کرتے
قدم مے خانہ میں رکھنا بھی کارِ پختہ کاراں ہے
جو پیمانہ اُٹھاتے ہیں وہ تھرایا نہیں کرتے

نشور کی غزل نے غزل کے مخالف کلیم الدین احمد کو ہی اپنا اسیر نہیں بنایا بلکہ ہم عصر ناقدین کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا۔ رضوان احمد نے نشور واحدی کے فن پر اپنے تجزیاتی مقالے میں فراق گورکھپوری کی یہ رائے بھی نقل کی ہے:

''نشور چھوٹی یا اوچھی باتیں نہیں کہتے، وہ زندگی کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں اور یہی دامن جب لہراتا ہے تو شاعری کی قوسِ قزح بن جاتا ہے۔''

پروفیسر آل احمد سرور نشور واحدی کے مجموعۂ کلام 'فروغِ جام' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''نشور ان شاعروں میں سے ہیں جو شاعری کے حقیقی حسن سے واقف ہیں اور جن کی غزلوں اور نظموں میں اس دور کے درد و داغ کو حسن کارانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ نشور کے کلام میں چیخ و پکار نہیں ہے، اشارہ ہے تبصرہ نہیں۔ نہ وہ غم ہے جو مایوسی کے سمندر میں غرق کردے، نہ سستی رجائیت ہے جو رومانیت کی پروردہ ہوتی ہے، ان کے یہاں تیز روشنی یا گہرے اندھیرے کا بھی احساس نہیں ہوتا، ان کی شاعری ایک جذبۂ شفق رنگ ہے جس میں روشنی اندھیرے سے ملتی ہے، ایک رنگ دوسرے رنگ سے لپٹا ہوا ہے، فضا میں نغمے بکھر رہے ہیں اور ہم ایک سرخوشی کے عالم میں ڈوبے جارہے ہیں۔''

فضائے حیات میں نغمے بکھیرنے والے نشور واحدی نصف صدی تک ملک گیر مشاعروں پر چھائے رہے، ادبی محفلوں کا یہ حال رہا کہ ان کے بقول:

ہر ایک شعر پر گویا بھڑک اُٹھی محفل
نشور آپ کا بھی کیا کلام ہوتا ہے

اس مقبولِ عام و خاص شاعر کی شخصی زندگی جد و جہد، محنت و ریاضت اور اعلیٰ اقدار و روایات کی پاسداری سے عبارت ہے، حفیظ الرحمٰن نشور واحدی 15 اپریل 1912 کو اپنے ننہال ضلع بلیا کے ایک گاؤں چندائر میں ایک معزز روحانی خانوادے میں پیدا ہوئے، ان کے خاندان کا تعلق مخدومانِ جونپور کے عظیم صوفی بزرگ حضرت حاجی شاہ پھول جونپوریؒ کے گھرانے سے ہے جن کا مزار سکندر پور شرقی کے قریب موضع چک حاجی پور میں واقع ہے۔ یہی مقام نشور صاحب کا آبائی وطن ہے جو اب موجودہ ضلع بلیا میں شامل ہے۔ نشور کے والد جمیل احمد خوش گو شاعر تھے اور یکتا تخلص کرتے تھے۔ حفیظ الدین نشور واحدی نے خانقاہِ رشیدیہ جونپور کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم عربی، فارسی اور اُردو میں حاصل کی، اس کے بعد الٰہ آباد کے مدرسہ مصباح العلوم میں اس وقت کے کامل اساتذہ سے عربی فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور معروف صوفی بزرگ حضرت مولانا عبدالشکور چشتی قادریؒ سے بیعت ہوکر روحانی تربیت حاصل کی، یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت نشور واحدی سلسلۂ چشتیہ، قادریہ، صابریہ اور نقشبندیہ کے صاحبِ خلافت مرشد بھی تھے، لیکن تصوف و روحانیت کے رنگ میں شرابور ہونے کے باوجود انھوں نے پیری مریدی اور خانقاہی طرزِ حیات کے بجائے درس و تدریس اور شعر و سخن کا راستہ اپنایا۔ انھوں نے 1924 میں منشی اور 1926 میں کامل کے امتحانات پاس کیے اور اپنے مدرسہ مصباح العلوم الٰہ آباد میں ہی مدرس بن گئے۔ 1931 میں انھوں نے اُردو میں اعلیٰ قابلیت حاصل کی، طب یونانی کی تعلیم سے بیحد دلچسپی تھی۔ 1935 میں تکمیل طب کی سند بھی حاصل کرلی اور یوپی کے بورڈ آف یونانی میڈیسن میں بطور طبیب ان کا رجسٹریشن بھی ہوگیا۔ طلبِ علم کے جوش و جنون نے انھیں انگریزی تعلیم کی جانب شدت سے راغب کیا۔ 1945 میں انھوں نے الٰہ آباد بورڈ سے ہائی اسکول پاس کیا تھا۔ 1950 میں کرسچین کالج لکھنؤ سے فارسی کا ریفریشر کورس بھی کیا۔ بعد میں وہ کانپور کے ایک مدرسے میں فارسی کے استاذ ہوگئے۔ جس وقت وہ مدرسے میں اپنی عمر سے دو تین گنی عمر کے طلبہ کو فارسی پڑھا رہے تھے، کانیہ کبج کالج کے پرنسپل کی نظران پر پڑگئی، اور وہ اس کالج کے ٹیچر بنا دیے گئے۔ انھوں نے کچھ عرصہ نارائن کھتری کالج کانپور میں بھی فارسی پڑھائی لیکن پھر 1947 میں وہ حلیم مسلم کالج سے وابستہ ہوگئے جہاں 25 برسوں تک اُردو فارسی کے باوقار استاذ کی حیثیت سے

دلّی کی زبان

اُردو کو یوں ہی سحر رواں کہتے رہیں گے
دلّی ہے تو دلّی کی زباں کہتے رہیں گے
ترتیب خیالات کو زباں کہتے رہیں گے
گلدستۂ نازک کمراں کہتے رہیں گے
بے سود ہے ہر آہ رسا بزم طرب میں
گوشِ گل رنگیں کو گراں کہتے رہیں گے
پہچان گیا اہلِ سیاست کی زباں بھی
یہ آگ لگی ہو تو دھواں کہتے رہیں گے
اس دور میں جو لوگ ہیں نباضِ گلستاں
پھولوں کو بھی شبنم کی دکاں کہتے رہیں گے
(نشور واحدی)

تدریسی خدمات انجام دے کر 1972 میں ریٹائر ہوئے۔

ادب اور شاعری کا ذوق ان کے خون میں شامل تھا۔ دورانِ تعلیم بارہ سال کی عمر ہی سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ بیس سال کی عمر میں باقاعدہ شاعری کی ابتدا کی، نشور تخلص اختیار کیا لیکن کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا، وہ اپنا کلام خود ہی اپنے مطالعے کی روشنی میں جانچتے پرکھتے اور اپنی اصلاح کرتے رہے۔

1938 میں جب نشور صاحب 26 برس کے نوجوان تھے ان کا اوّلین مجموعۂ کلام 'صہبائے ہند' مکمل ہوا جو 1939 میں شائع ہوا۔ یہ ان کی ابتدائی نظموں پر مشتمل تھا، لیکن اُردو شاعری کی تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ تھا کہ ایک مبتدی شاعر نے ایک جہاندیدہ اور پختہ کار صاحبِ علم و دانش اور ماہرِ عروض و بلاغت، فلسفی شاعر کی طرح علامہ اقبال کے فلسفیانہ آہنگ کی ایک طرح سے توسیع پیش کرنے کی کوشش کی۔ 'صہبائے ہند' آج تک اہلِ دانش و بینش کو حیران کیے ہوئے ہے جس میں نشور واحدی نے اس روحانی انقلاب کو شعر کے پیکر میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کیا جو ہندوستان اور فکر اسلامی کے اتصال سے ظہور پذیر ہوا۔ نشور برصغیر کے اوّلین فلسفی شاعر ثابت ہوئے جنھوں نے اقبال کے نظریات کے برخلاف ہندوستانیت کی عظمت اور اہمیت کو اپنے فلسفے کی اساس بنایا۔ نشور نے واضح کیا کہ دینوی اور مادّی ترقی روحانی انقلاب پیدا کرتی ہے۔ 'صہبائے ہند' کی شاعری از اوّل تا آخر قاری کو ایک نئی سوچ کی طرف لے جاتی ہے، یہ اس سائنسی اور صنعتی عہد کا فلسفہ ہے جہاں محنت اور عمل سے ہی کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ ایک نوخیز شاعر کے اس اندازِ بیان نے اسی وقت ظاہر کردیا تھا کہ نشور کی پروازِ

نشور واحدی، جگر مرادآبادی (بائیں جانب) مسعود اختر جمال کے ساتھ

سخن انھیں مستقبل میں کن بلندیوں کی طرف لے جانے والی ہے، 'صہبائے ہند' میں نشور کا اندازِ بیان دیکھیے:

جب کہ سبحان الذی کی منزلیں ہوں گی قریب
جب کہ ہوگی مادّی معراج انساں کو نصیب
ہوگی اِک وحدت نمایاں گلشنِ تحدید میں
ڈوب جائے گا زمانہ قلزمِ توحید میں
جذبۂ فقر و ولایت رہنمائے لامکاں
قوتِ امر و نبوت کارپردازِ جہاں

نشور واحدی کا یہ کلام جو 1939 میں شائع ہوا یہ ان کی دس بارہ سال کی ریاضت کا نتیجہ تھا، اس وقت وہ 26 برس کے تھے اور یہ اشعار اغلباً انھوں نے سولہ اٹھارہ برس کے سن میں کہے ہوں گے، وطنی شاعری کے مشہور زمانہ شعرا کے یہاں بھی ایسا پرشکوہ شعری آہنگ مشکل سے ملے گا۔

ہے تری تعمیر میں شامل وطن کی ہست و بود
کیوں کہ ہیں خاکِ وطن سے تیرے اجزائے وجود
ہیں تری روشن دماغی سے وطن کو نسبتیں
تندرستی سے تری پنہا وطن کی قوتیں
ہند کی دلکش زمیں وہ خاکِ دامن گیر ہے
ذرّہ ذرّہ جس کا عالم، عالمِ تعمیر ہے

نشور واحدی کی شاعری کا تابناک ارتقائی دَور آزادیِ وطن کے بعد کانپور کی ادبی وتہذیبی فضاؤں میں شروع ہوا جب وہ حلیم مسلم کالج میں پڑھا رہے تھے، اس زمانے میں شہر کانپور میں رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی (م 1951)، ناطق لکھنوی، وفا شاہجہاں پوری، گنگادھر فرحت، کرشن سہائے ہنتکاری، وحشی کانپوری اور سخا شاہجہاں پوری جیسے مشاہیر جلوہ فگن تھے، ادبی محفلیں، مشاعرے اور نشستیں بھی خوب منعقد ہوتی تھیں۔ نشور واحدی نے ان محفلوں میں خوب سیکھا اور سکھایا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ان کا شمار شہر کے ہی نہیں ملک کے اہم ترین شعرا میں ہونے لگا۔ وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے لیکن خود ان کے تلامذہ بےشمار تھے، جن میں سے بعض نے علم وادب کی دُنیا میں بہت شہرت حاصل کی، ان کے نہایت عزیز شاگرد پیام فتح پوری کا شمار نئی غزل کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔

نشور واحدی کا شعری سفر کالج کی تدریسی ذمے داریوں، ملک گیر مشاعروں اور مختلف مصروفیات کے باوجود تیز رفتاری سے جاری رہا، یکے بعد دیگرے ان کے مجموعہ ہائے کلام منظرِ عام پر آتے رہے۔ 'صہبائے ہند' کے بعد 'شورِ نشور' (1942)، 'آتش و نم (1946)، فروغِ جام (1959) سوادِ منزل (1968)، گل افشانیِ گفتار (1977)، سلکِ شبنم (1978)، جیسے مقبول عام مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ نشور صاحب ایک صاحبِ اسلوب نثر نگار بھی تھے، ان کی نثری تخلیقات 'دانشِ آخرالزماں'، 'تاریخ فلسفۂ خودی'، 'ایشیا اور ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقا' ان کی فکر انگیز تحریریں ہیں جن میں وہ ایک فلسفی اور مفکر کی حیثیت سے اپنے معاصرین میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مختلف علمی، ادبی اور معاشرتی موضوعات پر متعدد مضامین لکھے جو ہندوپاک کے مؤقر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ریڈیو سے ان کا کلام مسلسل نشر ہوکر کروڑوں سامعین تک پہنچتا رہا۔ حلیم مسلم کالج میں انھوں نے ربع صدی تک لاتعداد طلبہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔

شخصی زندگی میں نشور واحدی ایک متقی و پرہیزگار روحانی شخصیت تھے، بزرگانِ دین سے نسبت کا انھیں ہر لحظہ خیال رہا، انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو اخلاق کے منافی ہو، غصّے کی حالت میں بھی کوئی نازیبا کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ انھوں نے ایسا کوئی شعر نہیں کہا جسے مخربِ اخلاق کہا جاسکے۔ خیالات کی پاکیزگی ان کی شاعری کا خاص جوہر ہے۔ فرماتے ہیں:

نشورِ واحدی کی بھی غزل کیا خوب ہوتی ہے
تخیل پاک بازانہ مگر انداز رندانہ

نشور واحدی کی شادی 1930 میں دیوریا کے رئیس خان بہادر مولوی محمد حامد چشتی کی صاحبزادی مومنہ خاتون سے ہوئی تھی۔ محترمہ نہایت سلیقہ شعار اور دانشمند خاتون تھیں۔ نشور صاحب کو خدا نے تین فرزندوں اور دو بیٹیوں سے نوازا تھا، جن کے نام ہیں: نیاز احمد واحدی، اعجاز احمد واحدی اور امتیاز احمد واحدی۔ اعجاز احمد واحدی کا انتقال کم سنی میں ہی ہوگیا تھا، صاحبزادیوں کے نام ہیں: ثروت واحدی اور عشرت واحدی۔ اپنے سبھی بچوں کو نشور صاحب نے اعلیٰ تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا۔ بڑے صاحبزادے نیاز احمد حکومت اترپردیش میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔

نشور واحدی 71 برس کی عمر میں 4 جنوری 1983 کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ نشور صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نیاز احمد واحدی خاصے ادبی ذوق کے مالک تھے، انھوں نے اپنے والد کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جن میں ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقا (1993) بچوں کے لیے کہی گئی ان کی نظمیں 'پھولوں کی انجمن' (1998) اور اشکِ خونچکاں سے عصرِرواں تک (2000)، شامل ہیں۔ نیاز واحدی نے اپنے والد کے پرانے مجموعوں کو نئے انداز میں مرتب کرکے شائع کیا۔ وہ 'کلیاتِ نشور' مرتب کررہے تھے لیکن 21 مئی 2012 کو نیاز صاحب کا انتقال ہوگیا۔ خدا مغفرت کرے۔ معلوم ہوا ہے کہ کلیات کا مسودہ مکمل ہے، اسے شائع ہونا چاہیے۔ اترپردیش اُردو اکادمی کو اس بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

نشور صاحب کے فن وشخصیت پر متعدد مقتدر ادبی شخصیات نے مقالات لکھے ہیں جن میں خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر احمد لاری، ڈاکٹر اجمل اجملی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور کیفی اعظمی جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نوہروی کی نگرانی میں عظیم شاعر چکبست کی پوتی محترمہ اوما چکبست نے پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھا جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح پروفیسر احمد لاری کے شاگرد ڈاکٹر محمد راشد خاں نے بھی پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جو 'نشور واحدی: فن اور شخصیت' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر مصلح الدین نے پٹنہ سے 'نشور واحدی کی غزل گوئی' کے عنوان سے وقیع کتاب شائع کی ہے۔

نشور واحدی کی شاعری سدا بہار ہے، آنے والے زمانوں تک اس کی معنویت اور اہمیت برقرار رہے گی، ان پر تحقیق وتنقید کا خاطر خواہ کام بھی ہوا ہے لیکن یہ اُردو کے اربابِ اقتدار کو سوچنا ہوگا کہ کیا اس عہد ساز شاعر کو اس طرح یاد کیا جارہا ہے جس طرح یاد کیا جانا چاہیے؟

■

FAROOQ ARGALI
25, Ganesh Park, Rasheed Market, Delhi-110051

شمیم ارشاد اعظمی

کوثر چاندپوری
بحیثیت طبیب

حکیم سید علی جنھیں ادبی دنیا میں کوثر چاند پوری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہت متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر، ادیب، مؤرخ، افسانہ نگار و ناول نگار، خاکہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے ادبی دنیا میں آپ کی تشہیر ہوئی۔ شاعری اور صحافت بیچ راستے میں ہی دم توڑ گئی لیکن افسانہ نگاری اور ناول نگاری سے تاحیات دامن نہیں چھڑا سکے۔ کوثر چاند پوری نے ناول و افسانہ نگاری کو ذریعہ معاش کے طور پر کبھی نہیں اپنایا، بلکہ اس سے ان کا مقصد سسکتی، بلکتی اور کراہتی انسانیت کا پیغام دردلوگوں تک پہونچانا تھا۔ ان سب کے علاوہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کوثر چاند پوری ایک اچھے معالج اور طبیب بھی تھے۔ یہی دراصل ان کی شخصیت کا اصل رخ ہے مگر اتنا ہی تشنہ ہے۔ بھوپال سے دہلی تک علاج و معالجے کی جو خدمات انجام دی ہیں اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو والوں نے حکیم کوثر چاند پوری پر بہت سارے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ طبی حلقے کی جانب سے بہت کم ان کی تحریروں اور کارناموں کا سراہا گیا ہے۔ اس سلسلے کی یہ ایک حقیر کوشش ہے۔

حکیم کوثر چاند پوری سیوہارہ کے مشہور طبی خانوادے میں 8اگست 1900 میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا حکیم سید منصور علی اور والد محترم حکیم سید مظفر علی کا شمار بجنور کے مشاہیر اطبا میں ہوتا تھا۔ طبیبوں کا یہ خاندان ضلع میں بہت احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس خاندان کا سلسلہ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا کر مل جاتا ہے۔

کوثر چاند پوری نے ابتدائی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد محترم سید علی مظفر چاند پوری سے حاصل کی۔ آپ کے والد جہاں ایک حاذق طبیب تھے وہیں آپ کا ادبی اور شعری ذوق بھی کافی بلند تھا۔ تحریک آزادی کے دوران خلافت اور دوسری تحریکوں کی تشہیر کے ساتھ ساتھ آزادی کے متوالوں کو اپنی نظموں کے ذریعے للکارتے بھی رہے۔ یہ نظمیں کتابی شکل میں شائع ہوئی تھیں مگر افسوس کی برطانوی حکومت کی نذر ہوگئیں۔ والد محترم کے علاوہ کوثر

> **حکیم صاحب کا نسخہ کم ادویہ اور سہل الحصول ادویہ پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ طویل نسخے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ نبض شناسی، تشخیص اور تجویز میں منفرد تھے۔ امراض گردہ اور جلدی بیماریوں بالخصوص برص کے علاج میں ماہر تھے۔ گردے کی پتھری بغیر آپریشن کے نکالنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اس کی شہرت عرب ممالک تک پھیلی ہوئی تھی**

چاند پوری نے دو مشہور شخصیت میاں جی عبدالعزیز اور منشی سلیم اللہ سے فارسی کی گلستان و بوستان پڑھیں۔

کوثر چاند پوری اپنے بڑے بھائی حکیم سید علی اکبر کے ساتھ 1914 میں آصفیہ طبیہ کالج بھوپال میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا۔ طب کے جدید مضامین میں اناٹومی اور میٹریا میڈیکا آگرہ کے ڈاکٹر مٹھن لال سے پڑھی اور میڈیسن رحمت اللہ سے۔ کوثر صاحب کا شمار کلاس کے ہوشیار، محنتی، سنجیدہ اور قابل طلبا میں ہوتا تھا۔ ہر سال اور ہر جماعت میں اوّل نمبر سے کامیاب ہوئے۔ سرجری اور میڈیسن میں انھوں نے امتیازی نمبرات حاصل کر کے نقرئی تمغہ کے مستحق ہوئے۔ فراغت کے بعد 1922 میں ریاست بھوپال میں ہی ملازمت مل گئی اور بھوپال ہی کے ہوکر رہ گئے۔ سب سے پہلے تحصیل سلوانی کے یونانی شفاخانے میں مامور ہوئے گو کہ یہاں ان کو علمی و ادبی ماحول ملا مگر طبیعت یہاں نہیں لگ پائی اور اپنا تبادلہ جاور کرا لیا۔ 1935 میں قصبہ بیگم گنج میں تبادلہ ہوگیا۔ بیگم گنج سے رائے سین پہنچے اور پھر ترقی کرتے کرتے صدر یونانی شفا خانہ بھوپال میں افسر الاطبا مقرر ہوئے اور یہیں سے 1955 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھوپال میں ہی 'کوثر صحت' نام سے ذاتی مطب قائم کیا۔

زمانہ طالب علمی سے ہی مضمون نویسی اور شعر گوئی کا ذوق پروان چڑھنے لگا تھا۔ طبی مضامین لکھنے کا سلسلہ آصفیہ طبیہ کالج میں منعقد مجلس مذاکرہ سے شروع ہوا۔ ہر سنیچر کو کالج میں مجلس مذاکرہ کا انعقاد ہوتا جس میں کوثر چاند پوری مضمون قلم بند کرتے۔ مضمون کو خوب پسند کیا جاتا۔ آپ کے ادبی و طبی مضامین اس زمانے کے مشہور و معیاری رسائل میں جگہ پاتے تھے۔ طبی مضامین الطبیب (لاہور)، الحکیم (لاہور)، خادم الاطبا (لکھنؤ)، مصباح الحکمت (سہارنپور)، ہمدرد صحت (دہلی) اور ہمدرد اخبار (کراچی) میں شائع ہوتے تھے۔ تاریخی و ادبی مضامین اور افسانہ و ناول نیرنگ خیال، ادبی دنیا، شاہکار اور نگار میں چھپتے تھے۔ حکیم کوثر کی انھی طبی اور ادبی صلاحیت سے متاثر ہوکر ماہنامہ الطبیب لاہور کے مدیر حکیم محمد شریف نے آپ کو اپنے ماہنامہ کا نائب مدیر بنایا۔ حکیم صاحب جاور سے تین ماہ کی چھٹی لے کر لاہور گئے لیکن وہاں دل نہ لگا اور واپس بھوپال آگئے۔

کوثر چاند پوری سے حکیم عبد الحمید صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے۔ آصف علی روڈ پر نوتعمیر شدہ ہمدرد نرسنگ ہوم کے چلانے کے لیے حکیم عبدالحمید صاحب کی جوہر شناس نظر حکیم کوثر چاند پوری پر گئی اور انھیں ہمدرد نرسنگ ہوم کے سربراہ کے طور پر بلا لیا گیا۔ اس طرح اپریل 1964 کے آخری ہفتے میں حکیم کوثر چاند پوری حکیم عبدالحمید صاحب کی دعوت پر ہمدرد نرسنگ ہوم سے وابستہ ہوگئے اور 1988 تک بہت ہی ذمے داری اور خلوص نیت کے ساتھ خدمات انجام دیتے رہے۔ حکیم کوثر چاند پوری بہت ہی خوش مزاج، روشن خیال، ہمدردوں

کے ہمدرد، علم دوست، وسیع القلب اور سب سے بڑھ کر انسانیت پرست تھے۔ ملازموں اور اپنے ماتحتوں سے بہت ہی شفقت اور محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ نرسنگ ہوم کے جونیر ڈاکٹر اور تمام عملہ ان کے حسن اخلاق کا گرویدہ تھا۔ درجہ چہارم کے ملازمین انھیں پیار میں 'اباحضور' کہتے تھے۔ حکیم کوثر چاند پوری کا نرسنگ ہوم میں یہ معمول تھا کہ صبح نو بجے سے ایک بجے تک مطب دیکھتے اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد چندلمحات کے لیے کمرہ میں استراحت جسے عرف عام میں قیلولہ کہا جاتا ہے فرماتے اور پھر نہایت یکسوئی کے ساتھ مضامین لکھنے یا کتابوں کے مطالعے کے لیے بیٹھ جاتے۔ یہ شغل تین چار گھنٹہ جاری رہتا۔ شام کو انڈور (IPD) کے مریضوں کا دیکھنے کے لیے راونڈ پر جاتے تھے۔

حکیم کوثر چاند پوری کا طب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اطبا کی نگارشات، تجربات اور ان کے طبی کارناموں پر بڑی گہری نظر تھی۔ جالینوس، رازی اور ابن سینا کے طبی نظریات اور ان کے تجربات ومعمولات کی روشنی میں پیچیدہ سے پیچیدہ امراض کے علاج کرتے تھے جس میں انھیں کامیابی بھی ملتی تھی۔ حکیم صاحب کا نسخہ کم ادویہ اور سہل الحصول ادویہ پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ طویل نسخے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ نبض شناسی، تشخیص اور تجویز میں منفرد تھے۔ امراض گردہ اور جلدی بیماریوں بالخصوص برص کے علاج میں ماہر تھے۔ گردے کی پتھری بغیر آپریشن کے نکالنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اس کی شہرت عرب ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔

حکیم کوثر چاند پوری طب یونانی کو زمانے سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ خذما صفا اور دع ما کدر کے اصول کے مطابق تشخیص امراض اور دواسازی کے میدان میں جدید سائنسی آلات و ذرائع سے استفادہ کو مستحسن سمجھتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر طب کے حاملین تشخیص امراض اور دواسازی وغیرہ میں ان ذرائع سے کام لیں جن سے ڈاکٹر مستفید ہو رہے ہیں تو یہ وقت کے ساتھ چلنے کی دلیل ہے۔ موجودہ دور میں سائنس کی فرمانروائی اور برتری مسلم ہو چکی ہے۔ اس حقیقت سے انکار بصیرت، بصارت اور دانش وبینش کے منافی ہے۔''

اسی طرح ایک جگہ مزید رقمطراز ہیں:

''طب قدیم کی اساس اس بنا پر قائم ہے کہ قلب کسی بھی جراحت کو برداشت نہیں کرسکتا، مگر دور جدید کی سائنس نے نہ صرف قلب کو جراحت برداشت کرنے کا اہل سمجھا اس میں تبدیلی کو بھی ممکن العمل بنا دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ سینے کو چیر کر اور ناکارہ دل کو نکال کر اس کی جگہ ایک مشین فٹ کر دی ہے جو اسے عمر طبعی گزارنے میں مدد دیتی ہے۔ اس بات کے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اب یہ فن کہنہ، ناقص اور بوسیدہ ہو چکا ہے بلکہ اظہار اس بات کا مطلوب ہے کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ماضی کے بہت سے عقائد میں تبدیلیاں آچکی ہیں۔ انسان پہلے جن چیزوں کو محض چھونے کی تمنا کرسکتا تھا آج ان کی گود میں بیٹھ کر ہمک سکتا ہے، چل پھر سکتا ہے اور سوسکتا ہے۔ انسانی ذہن اور شعور کی ترقی لامحدود ہے اور یہ ہزار ہا برس سے روبہ ارتقا ہے، اس کو ابھی کسی منزل پر ٹھہرا لینا اپنے ذہن و ادراک کے پیروں میں زنجیر ڈالنا ہے۔''

حکیم کوثر چاند پوری بنیادی طور سے طبیب تھے اور آخر عمر تک فن طب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ آپ نے ادب کو اصلاح معاشرہ کے طور پر اختیار کیا تھا۔ آج کے ادیبوں کی طرح آپ نے ادب کو پیشے سے کبھی نہیں مربوط کیا۔ حکیم کوثر چاند پوری نے طب وادب پر بہت کچھ لکھا ہے

یہ حقیقت ہے کہ ابن سینا نے سب سے پہلے قلب کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور 'رسالہ الادویہ القلبیہ' لکھا، یقیناً اس کا یہ کام اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن زمانہ بدل رہا ہے، حالات بدل رہے ہیں، نت نئی تحقیقات اور انکشافات سامنے آرہے ہیں۔ ان سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔

طبی تصانیف

حکیم کوثر چاند پوری کی حیات و خدمات پر پی ایچ ڈی ہو چکی ہے، کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ سب سے مستند مآخذ ظفر احمد نظامی کی لکھی ہوئی کتاب 'کوثر چاند پوری' ہے، یہ کتاب ساہتیہ اکادمی، دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ظفر احمد نظامی نے حکیم کوثر چاند پوری کی مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی کتابوں کی فہرست بھی دی ہے۔ ان کا تعلق ناول، افسانہ، تنقید و تحقیق، انشائیے، رپورتاژ، سوانح، طنز ومزاح، ادب اطفال اور طب ہے۔ طب سے متعلق نو کتابوں کا ذکر ہے جبکہ سوانح کے ذیل میں طب سے متعلق اطباعہد مغلیہ اور حکیم اجمل خاں جیسی دو اہم کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کا تعلق علاج و معالجہ، کلیات طب اور تاریخ طب سے ہے۔ مترجم کی حیثیت سے بھی حکیم کوثر چاند پوری کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ موجز القانون اور لوامع البشر یہ اس کی روشن مثال ہیں۔ کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

1. اطبا عہد مغلیہ (1960)
2. حکیم اجمل خاں (1973)
3. طب قدیم میں دوسرے علوم کی آمیزش (1976)
4. موجز القانون (1984)
5. الدق مسمیٰ بہ تدقیق کوثر — مطبوعہ
6. محسن اطفال مسمیٰ بہ علاج کوثر — مطبوعہ
7. رسالہ آتشک — مطبوعہ
8. قدح کبریٰ — مطبوعہ
9. دستور العمل — مطبوعہ
10. لوامع شبریہ فی علاج امراض بشریہ (ترجمہ) — مطبوعہ
11. کتاب المباحثۃ العلائیہ والاغراض الطبیہ (ترجمہ) — غیر مطبوعہ

حکیم کوثر چاند پوری بنیادی طور سے طبیب تھے اور آخر عمر تک فن طب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ آپ نے ادب کو اصلاح معاشرہ کے طور پر اختیار کیا تھا۔ آج کے ادیبوں کی طرح آپ نے ادب کو پیشے سے کبھی نہیں مربوط کیا۔ حکیم کوثر چاند پوری نے طب وادب پر بہت کچھ لکھا ہے۔

13 جون 1990 میں دہلی میں آپ کا انتقال ہوا۔ اور جامعہ ملیہ کی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

ماخذ:
(1) تذکرہ اطباعصر، حکیم سید ظل الرحمٰن، ابن سینا اکادمی علی گڑھ، 2010
(2) جگر لخت لخت، حکیم سید غلام مہدی راز، نیو پرنٹ سنٹر، نئی دہلی، 2007
(3) ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں، کھرے پریس، تلیا، بھوپال، 2012
(4) کوثر چاند پوری، ظفر احمد نظامی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 2008
(5) موجز القانون ...

Kausar Chandpuri Asst Professor, Jamia Tibbiya Deoband, G.T. Road, Deoband, Dist. Saharanpur - 247554 (U.P)

معید رشیدی

مومن کے تذکرے

مطالعۂ مومن میں 'آبِ حیات' کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ 'آبِ حیات' کی پہلی اشاعت وکٹوریہ پریس، لاہور سے 1880 میں ہوئی۔ آزاد نے تذکرے کو تاریخ سے ملانے کی کوشش کی۔ پانچ ادوار قائم کیے اور ہر دور کے شعری خصائص پر اظہارِ خیال کیا۔ ابتدا میں اردو کے آغاز وارتقا پر گفتگو کی جس سے اردو کی لسانی تشکیل کا ایک نظریہ بھی سامنے آیا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ [اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو، برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندستانی زبان ہے۔] [1] آزاد کا نظریہ کارگر نہ ہوا، اور رد کردیا گیا۔ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن کا ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ مومن کو شامل نہ کرنے کا کوئی خاص جواز بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ آزاد نے عذرِلنگ یہ پیش کیا کہ ان کے حالات انھیں نہ مل سکے۔ انھوں نے خطوط لکھ کر لوگوں سے حال جاننا چاہا لیکن ناکام رہے۔ ان کا عذرِلنگ کام نہ آیا۔ جب 'آبِ' حیات شائع ہوا تو اس پر متعدد تبصرے لکھے گئے اور مومن کی عدم شمولیت پر احتجاج کیا گیا۔ دوسرے ایڈیشن میں مومن شامل کیے گئے۔ آزاد مومن کی تمہید میں لکھتے ہیں:

پہلی دفعہ اس نسخے میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ دورِ پنجم جس سے ان کا تعلق ہے، بلکہ دورِ سوم و چہارم کو بھی اہلِ نظر دیکھیں کہ جو اہلِ کمال اس میں بیٹھے ہیں، کس لباس وسامان کے ساتھ ہیں۔ کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان وشان اور وضع ولباس کے ساتھ ہو، جو اہلِ محفل کے لیے حاصل ہے۔ نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ خاں موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں۔ اپنے وطن کے اہلِ کمال کا شمار بڑھا کر اور ان کے کمالات دکھا کر ضرور چہرۂ فخر کا رنگ چمکاتا، لیکن میں نے ترتیبِ کتاب کے دنوں میں اکثر اہلِ وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے۔ وہاں سے صاف جواب آیا۔ وہ خط بھی موجود ہیں۔ مجبور اُن کا حال قلم انداز کیا۔ دنیا کے لوگوں نے اپنے اپنے حوصلے کے بموجب جو چاہا سو کہا؛ آزاد نے سب کی عنایتوں کو دامن پھیلا کر لے لیا۔ ذوق:

دو گالیاں کہ بوسہ خوشی پر ہے آپ کی
رکھتے فقیر کام نہیں ردّ و کد سے ہیں

البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض اشخاص جنھوں نے میرے حال پر عنایت کرکے حالاتِ مذکورہ کی طلب و تلاش میں خطوط لکھے اور سعی ان کی ناکام رہی۔ انھوں نے بھی کتاب مذکورہ پر ریویو لکھا، مگر اصل حال نہ لکھا، کچھ کچھ اور ہی لکھ دیا۔ میں نے اُسی وقت دہلی اور اطرافِ دہلی میں ان اشخاص کو خطوط لکھنے شروع کردیے تھے، جو خاں موصوف کے خیالات سے دل گزار رکھتے ہیں۔ اب طبع ثانی سے چند مہینے پہلے تاکید والتجا کے نیاز ناموں کو جولانی دی۔ انھی میں سے ایک صاحب کے الطاف وکرم کا شکرگزار ہوں جنھوں نے باتفاق احباب اور صلاح ہمدگر جزئیات احوال فراہم کرکے چند ورق مرتب کیے اور عین حالتِ طبع میں یہ کتاب مذکور قریب الاختتام ہے، مع ایک مراسلے کے عنایت فرمائے بلکہ اس میں کم وبیش کی بھی اجازت دی۔ [2]

'آبِ حیات' کی تفصیل، تسلسل، تاریخ اور ان سب میں انشاپردازانہ رنگ، یہ وہ چیزیں ہیں جو اسے اس عہد کے تذکروں سے ممیز کرتی ہیں۔ انشاپردازی آبِ حیات کی خوبی بھی کہی جاتی ہے اور خامی بھی۔ ایک ہی شے بیک وقت خوبی اور خامی ہوسکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ دیکھنے والا اسے اسی تناظر میں دیکھے۔ آبِ حیات کی تاریخی حیثیت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے؟ تذکروں میں اسے ریڑھ کی ہڈی بھی کہا گیا ہے۔ گیان چند جین نے اسے تاریخ بھی بتایا ہے اور تخلیق بھی۔ اس پر کلیم الدین احمد نے سیر حاصل تنقید کی ہے۔ اس تذکرے میں مومن کے حالاتِ زندگی سے متعلق حقائق، چند واقعات، صلاحیتوں کے ضمن میں مختلف علوم پر دستگاہ، مشغلہ، تلامذہ، اسفار، وغیرہ موضوعات کو نشان زد کیا گیا ہے۔ یہ معلومات حالی کے الطاف وکرم کا نتیجہ ہیں لیکن کلام پر رائے آزاد نے خود لکھی۔ اس کی وجہ آزاد نے یہ بتائی ہے:

اپنے شفیقِ مکرم کے الطاف وکرم کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے یہ حالات مرتب کرکے عنایت فرمائے، لیکن کلام پر رائے نہ لکھی اور باوجود التجائے مکرر کے انکار کیا۔ اس لیے بندۂ آزاد اپنے فہم قاصر کے بموجب لکھتا ہے۔ [3]

اور آزاد نے مومن کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجے پر پہنچایا ہے۔ ان میں معاملاتِ عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کیے ہیں۔ اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے، اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے۔ اشعار مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دل کش تراشیں ہیں کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں چند وصف خاص ہیں، جن کا جتانا لطف سے خالی نہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذاتِ شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف بلکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں۔ [4]

کلیم الدین احمد نے 'آبِ حیات' کی انشا کو اس کا اہم ترین عیب بتایا ہے۔ ان کی نظر میں اس کی کوئی تنقیدی اہمیت نہیں۔ اس کے برجستہ اور چست جملوں پر وہ سبحان اللہ کہتے ہیں اور انھیں مغز سے عاری بتاتے ہیں۔ وہ تذکروں کی لفاظی اور چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کے تمام اعتراضات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔

عبدالغفور نساخ کا شمار انیسویں صدی کی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کا مشہور تذکرہ 'سخن شعرا' 1864 میں ترتیب پایا لیکن اشاعت اس کے دس سال بعد 1874 میں ہوئی۔ نساخ نے اسے اپنی بارہ برسوں کی جاں فشانی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ 'سخن شعرا' تاریخی نام ہے جس سے 1281ھ یعنی سالِ ترتیب برآمد ہوتا ہے۔ محمود الٰہی نے اسے انیسویں صدی میں اردو شاعروں کا اردو میں لکھا جانے والا آخری ضخیم تذکرہ قرار دیا ہے۔ [5] نساخ کثیر المطالعہ شخص تھے۔ انھوں نے ماقبل کے تمام تذکروں

کا مطالعہ کیا اور شعوری طور پر کوشش کی کہ ان کا تذکرہ سب سے مختلف انداز کا ہو۔ اختصار اور جامعیت کے اصول پر چلتے ہوئے انھوں نے 2480 شعرا کا تذکرہ مرتب کیا جس میں 2441 شعرا، اور 39 شاعرات ہیں۔ انھوں نے براہ راست اپنے عہد کے شعرا سے رابطہ کر کے حالات اور کلام جمع کیے۔ نساخ مومن کے باب میں رقم طراز ہیں:

مومن تخلص [،] حکیم محمد مومن خان مرحوم ولد حکیم غلام نبی خان مغفور دہلوی ایک یا دو غزل میں نصیر دہلوی سے اصلاح لی تھی۔ اصلاح پسند نہ آئی۔ 1268ھ بارہ سو اٹسٹھ ہجری میں قضا کی [۔] ماتم مومن خان ان کی وفات کی تاریخ ہے۔ علم تنجیم وطب میں خوب دخل رکھتے تھے۔ جمیع اصناف سخن پر قادر تھے۔ اشعار ان کے پر مضمون و شیرین و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں [۔] راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گزرا نہیں [۔] کلیات ان کا نظر سے گزرا۔ (6)

تذکرے مومن تک پہنچنے کا براہ راست ذریعہ ہیں، لیکن تشنہ ہیں۔ مولوی کریم الدین [طبقات شعرائے ہند]، امداد امام اثر [کاشف الحقائق]، صفیر بلگرامی [جلوۂ خضر]، مولانا عبدالحیٰ [گل رعنا]، عبدالسلام ندوی [شعر الہند] وغیرہ نے بھی مومن کے احوال پر مختصر روشنی ڈال کر کلام کا انتخاب پیش کر دیا اور زیادہ ہوا تو ان کے تلامذہ پر گفتگو کر لی۔ ان کے کلام کی دو چار خصوصیات بتا کر ہاتھ جھاڑ لیا۔ تذکروں سے تاریخ تک کے سفر میں کافی نشیب وفراز ہیں۔

تذکروں کے ساتھ تاریخ کے صفحات بھی شعر وادب کے حوالہ جات سے پُر ہیں۔ رام بابو سکسینہ نے 'تاریخ ادب اردو' انگریزی میں تحریر کی تھی جس کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا۔ سکسینہ نے یہ تاریخ کیوں مرتب کی؟ سکسینہ کہتے ہیں، ''اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانہ قدیم سے لے کر زمانہ حال تک کا مع مشہور شعرا اور نثاروں کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔''(7) 'آب حیات' ہو یا 'سخن شعرا'، 'جلوۂ خضر' ہو یا 'شعر الہند'، کہیں تنقید پر اصرار نہیں کیا گیا۔ پہلی دفعہ رام بابو سکسینہ نے تنقید کا لفظ استعمال کر کے تنقید کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر زور دیا۔ پہلی بار یہ محسوس کیا گیا کہ ادب کی ترویج میں تحریکات ور جحانات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے سکسینہ نے تحریکوں اور طرزوں کی ابتدا اور ترقی اور زوال کے اسباب پر غور کیا۔ [اس تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹکسٹ بک تیار کی جائے تاکہ انگریزی دان جماعت بھی اردو ادب سے کماحقہ واقف ہوجائے۔ (8)] سکسینہ نے پروفیسر سینٹیسبری کی کتاب 'مختصر تاریخ انگریزی علم و ادب' کے طرز پر یہ کتاب ترتیب دی۔ ان کو کیا خبر تھی کہ نصابی ضرورت کے لیے تیار کی گئی یہ کتاب، تاریخ ادب اردو میں اہم مقام بنا لے گی۔ مرزا محمد عسکری 'التماس مترجم' میں لکھتے ہیں کہ ''اول سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش، جس کوشش وزورِ مطالعہ اور وسعتِ نظر سے اس میں کام لیا ہے۔ اسلوبِ بیان و تنقید وغیرہ میں جو صفائی مدنظر رکھی ہے۔ شعرا اور نثاروں کے کلام کا توازن کر کے ان پر جیسی صحیح بے باکانہ اور بے لاگ آرا قائم کی ہیں وہ اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں۔''(9) عسکری نے ان کی جتنی تعریف ہوسکتی تھی، کر ڈالی، لیکن سکسینہ کو اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ اسی لیے انھوں نے کوئی دعویٰ نہیں کیا اور اسے مکمل یا غلطیوں سے مبرا نہیں بتایا۔ اس کے لیے انھوں نے پروفیسر سینٹیسبری کا مزاحیہ قول بھی نقل کیا کہ اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں کوئی غلطی نہیں ہے تو وہ مسخرہ جھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی امید رکھے جس میں کوئی غلطی نہ ہو وہ اس سے بڑھ کر لغو ہے۔ (10) سکسینہ کی تاریخ میں کمیاں کافی ہیں لیکن چونکہ یہ اولین تاریخوں میں ہے، اس لیے اس کی بعض کمیاں نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔ سکسینہ نے مومن کے حالات، تصانیف، رنگ کلام، شاعرانہ مقام کا تعین اور ان کے تین اہم تلامذہ سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں دہلی اجڑتی اور بستی رہی۔ ولی کی آمد کے بعد یہاں بھی ریختہ گوئی کا رواج ہوگیا۔ پھر ایک وقت آیا جب لوگ ہجرت کر کے لکھنؤ جانے لگے۔ ایک نیا دبستان سامنے آیا۔ نادر شاہی حملوں کے بعد دیگر مراکز بھی بنے۔ اودھ کی کشش شعرا کو کھینچ رہی تھی لیکن کچھ شعرا، ایسے بھی تھے جنھیں دہلی چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ دہلی میں ویرانی اپنا سایہ دراز کر رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ سب کچھ ختم ہوجائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مغلیہ سلطنت اپنی آخری سانسیں گن رہی تھی اور ایک عظیم شعری روایت اپنے عروج کو پہنچنے والی تھی۔ غالب، مومن، ذوق، ظفر، شیفتہ ...... یہ وہ ستون ہیں جنھوں نے انیسویں صدی میں اردو شاعری کو لازوال بنا دیا۔ 'ہر عروج را زوال'، زمانے کا دستور ہے۔ سیاسی وسماجی اتھل پتھل تاریخی حقیقت ہے۔ کہتے ہیں کہ پر آشوب دور داخلی کیفیات کے اظہار کے لیے بڑا راس آتا ہے۔ دہلی کو اجڑتے ہوئے میر نے دیکھا تھا۔ اسی لیے میر کی شاعری کو دل اور دلی کا مرثیہ قرار دیا گیا:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

احتشام حسین نے صحیح کہا ہے کہ دلی مٹ مٹ کر بستی اور مر مر کر جیتی رہی۔ 1857 کا واقعہ غالب کی زندگی کا تاریخی موڑ ہے۔ خون سے لکھی گئی تاریخ اور جذبات کے اڈتے لہو کے سیلاب میں کی جانے والی شاعری نے باور کرایا کہ 'جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے'؟ مومن 1857 کے قہر تک موجود نہ تھے، کیونکہ 1852 میں ان کا انتقال ہوگیا تھا لیکن انھوں نے بغاوت کی آندھی کی آہٹ محسوس کر لی تھی۔ انگریزی تسلط کے خلاف مثنوی 'جہادیہ' لکھی۔ ان کی ذہنی تشکیل میں اس عہد کے خارجی محرکات نے اہم کردار ادا کیا۔ محض داخلیت کوئی شے نہیں اور شاعری میں محض خارجیت نام کی کسی چیز کا گزر نہیں۔ دونوں کے امتزاج ہی سے تخیل رنگ آمیزی کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے سیاسی ہندوستان کا عکس غالب و مومن کی زندگی میں صاف نظر آتا ہے۔ مومن نے ایسے وقت میں آنکھیں کھولیں جب ہندوستان کی سیاست اہم سیاسی فیصلوں کا سامنا کرنے والی تھی۔ ''مومن کی پیدائش سے تین سال پیشتر 1797 میں افغانستان کا امیر شاہ زمان سرحد اور پنجاب کو روندتا ہوا لاہور تک چڑھ آیا تھا۔ اس کا ارادہ دلی تک جانے کا تھا اور اس کا عزم یہ تھا کہ وہ مغلیہ خاندان کے اقتدار کو بحال کرانے کے لیے شمالی ہند سے مرہٹوں کا خاتمہ کر دے۔ شاہ زمان کی فوجی مہمات سے اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں میں کلکتہ میں بیٹھے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کے لیے شدید خطرات پیدا ہوگئے تھے۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا کہ دلی کی طرف بڑھتے ہوئے کمپنی کے قدم تھرتھرانے لگے ہیں مگر 1798 میں شاہ زمان کو ایرانیوں کے خلاف اپنی مغربی سرحدوں کی حفاظت کرنے کے لیے لوٹ جانا پڑا۔ مومن کی پیدائش سے سال بھر پہلے مئی 1799 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار اور جبر کے خلاف جنگ کرنے والے ہندستانی سپاہی سلطان ٹیپو کی شہادت واقع ہوچکی تھی۔''(11) مومن 1800 میں پیدا ہوئے۔ اس وقت دلی پر مادھوجی سندھیا کے جانشین دولت راؤ سندھیا کی عمل داری تھی۔ اس کی حکومت دلی سے آگرے تک تھی۔ شاہ عالم ثانی اس وقت دہلی کے بادشاہ تھے جو سیاسی طاقت سے محروم تھے۔ مرہٹہ سرداروں کے رحم و کرم پر گزر بسر ہو رہی تھی۔ قلعے کی چار دیواری میں قید و بے بس تھے۔ مومن ابھی بچے ہی تھے کہ 1806 میں شاہ عالم ثانی اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ (12) سلطنت مغلیہ کا زوال اورنگ زیب کے عہد ہی سے شروع ہوجاتا ہے۔ جاٹوں، مرہٹوں، سکھوں اور روہیلوں

کے حملوں کے بعد داخلی سازشوں نے اس سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ دہلی کا تخت گردشِ زمانہ کا شکار تھا۔ شاہانِ دہلی اقتصادی اور اخلاقی بحران میں مبتلا تھے۔ رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں۔ اورنگ زیب کے بعد شاہ عالم اول، کام بخش، جہاندار شاہ، فرخ سیر سے لے کر بیدار بخت، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ثانی [ظفر] تک کا سیاسی، اخلاقی اور اقتصادی دیوالیہ پن تاریخ میں کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی لوٹ مار کے بعد انگریزی حکومت کے تسلط نے مغلیہ حکومت کو مفلوک الحال کر دیا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس عہد کا سورج دیکھا جب مغلیہ سلطنت کا چراغ غروب ہو رہا تھا۔ تنزلی محض خارج میں نہیں تھی، بلکہ معاشرے کا داخلی نظام ابتری کی نذر ہو چکا تھا۔ ''مرکز کی کمزوری کے باعث شاہجہاں اور اورنگ زیب کی دلّی محض خواب بن کر رہ گئی تھی۔ بادشاہ عیش و راحت میں مشغول تھے۔ امرا اپنی رنگ رلیوں میں یا سازشوں میں محو تھے۔ علما نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ صوفیوں کو خانقاہوں کے سوا باہر کی خبر نہ تھی۔''(13)

جہاں دار شاہ ہو یا فرخ سیر سب نے اپنی عیاشی کے لیے شاہی خزانے کا منہ کھول رکھا تھا۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ پے در پے حملوں نے اقتصادی طور پر مفلوج کر دیا۔ نتیجے میں فوج بھی سرکش ہو گئی اور داخلی بغاوت نے سر اٹھایا۔ عسکری نظام میں استحکام نہ رہا۔ ایسی صورت حال میں کسی مصلح اور انقلابی ذہن کی ضرورت تھی۔ مصلح کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ظہور ہوا۔ ان کی سیاسی بصیرت کے سب قائل ہوئے۔ انھوں نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے جو اسباب بتائے انھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں:

(1) خالصہ کے علاقے کا محدود ہونا
(2) خزانے کی قلت
(3) جاگیرداروں کی کثرت
(4) اجارہ داری کے مسموم اثرات
(5) افواج کو وقت پر تنخواہ نہ ملنا (14)

شاہ ولی اللہؒ کا ذہن تصوف کی طرف مائل تھا۔ وہ تصوف کو علم و عمل کا امتزاج سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے افکار سے علم و عمل کا وہ در وا کیا جس سے ایک عہد نے فیض پایا۔ شاہ عبدالعزیزؒ ان کے بڑے صاحب زادے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ ان کے جانشین ہوئے۔ والد کی طرح انھوں نے بھی اپنے فکر و عمل سے بڑے حلقے کو متاثر کیا۔ مومن کے والد غلام نبی خاں کا مکان ان کی خانقاہ کے قریب تھا۔ مومن کے والد کا خانقاہ میں آنا جانا بھی تھا۔ وہ شاہ صاحب سے متاثر تھے۔ مومن کا شاہ صاحب کے خاندان سے گہرا رشتہ تھا۔ ان کی پیدائش کے بعد کان میں شاہ صاحب ہی نے اذان دی اور مومن خاں نام بھی انھوں نے ہی رکھا۔ ان کے شاگردوں میں شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ عبدالغنیؒ، شاہ محمد اسحٰقؒ، مفتی صدرالدین آزردہ، حضرت سید احمد شہیدؒ، مولوی شاہ اسمٰعیلؒ، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ وغیرہ جیسی ہستیاں تھیں اور [بقول ظہیر احمد صدیقی] 'ایک آفتاب کے گرد اتنا بڑا نظام شمسی قائم تھا اور ان میں ہر ایک بذات خود روشنی کا ایک کرّہ تھا۔' شاہ عبدالقادرؒ، شاہ ولی اللہؒ کے فرزند اور شاہ عبدالعزیزؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ['آبِ حیات' کے مطابق، مومن نے] ''بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادرؒ صاحب کی خدمت میں پہنچایا۔ ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے، فوراً یاد کر لیتے تھے۔ اکثر شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہٖ اسی طرح ادا کر دیتے تھے۔ جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھی کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔''(15) شاہ عبدالعزیزؒ سے انھیں عقیدت تھی۔ ان کی وفات پر انھوں نے تاریخ لکھی:

تواریخ ادب اردو میں مومن کی حیات اور فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سرسید احمد خاں نے 'آثار الصنادید' میں ان کی کافی تعریف کی ہے۔ سید اعجاز حسین نے 'مختصر تاریخ ادب اردو' میں مومن کو دو صفحات دیے ہیں۔ انھی میں ان کی حیات اور کچھ شاعری سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ تواریخ میں ان کی حیات سے متعلق جتنی بھی معلومات ملتی ہیں، وہ ساری تذکروں کی مرہون منت ہیں۔ اعجاز حسین نے ان پر بھی لکھتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہے۔ اصل میں ابتدائی تاریخیں تذکروں کے مزاج سے زیادہ الگ نہیں

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل
[1239ھ]

شاہ عبدالعزیزؒ کے انتقال کے بعد تک ملک کے حالات میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ مغلیہ سلطنت اپنے آخری دن گن رہی تھی۔ مسلمانوں کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف غم و غصہ تھا۔ تحریک جہاد کی ضرورت محسوس کی گئی۔ سید احمد شہید رائے بریلوی نے شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت کی۔ ان کی قیادت میں تحریک جہاد کا اعلان کیا گیا جس کا مقصد اصلاحی تھا اور انقلابی بھی۔ جہاد کی دو سطحیں تھیں۔ اول تو مذہبی خرافات اور سماجی و اخلاقی گراوٹوں کی اصلاح اور دوم، سیاسی جبر سے نجات۔ انگریزی تسلط سے آزادی اور عدل و رواداری کی اساس پر حکومت کا قیام، اس تحریک کا مقصد تھا۔ انگریزوں نے اسے وہابی تحریک کا نام دیا اور وہابی اور غدار کو ہم معنی قرار دیا۔ سید احمد شہید نے 1242ھ [1826] میں جہاد کے لیے بیعت شروع کی۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان کے اکثر افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شاہ اسماعیلؒ کا نام سرفہرست ہے۔ مومن جو ایک طرف عاشقانہ مزاج رکھتے تھے اور کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل جانے کی بات کر رہے تھے، جذبۂ جہاد سے سرشار ہوئے۔ جوشِ جہاد میں اعلانِ جہاد کی تاریخ کہی:

جو سید احمد امام زمان و اہلِ زمان
کرے ملاحدۂ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سال وغا
خروج مہدی کفار سوز کلک تفنگ
[1242ھ/1826]

نادم بلخی نے اپنی کتاب 'شعاعِ نقد' میں پہلا مضمون 'مومن اور وہابی تحریک' شامل کیا ہے جو اس ضمن میں اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ مومن عملی طور پر جہاد میں شرکت نہیں کر سکے لیکن لوگوں کو اس کی طرف راغب کرتے رہے۔ ان کے دل میں جذبۂ جہاد موجزن تھا۔ انھیں سید احمد شہید کی تحریک سے قلبی لگاؤ تھا۔ انھوں نے متعدد قصائد فارسی میں اور ایک مثنوی 'جہادیہ' اردو میں لکھی:

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو
حیات ابد ہے گر اس دم مرو
جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم
سزا وار گردن فرازی ہو تم
یہ ملک جہاں ہے تمھارے لیے
نعیم جناں ہے تمھارے لیے
شراکت یہاں کی ہے طالع کا اوج
کہاں ایسا امام اور ایسی ہے فوج
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

اس عہد کی دہلی پر نظر ڈالیے تو نشیب و فراز، ابتری، تنزلی، سیاسی جبر، اخلاقی پستی اور اقتصادی بدحالی کی

تصویریں روشن ہوجاتی ہیں لیکن انھی میں بعض شخصیات ایسی ہوئیں جنھوں نے زمانے کے رخ کو موڑا۔ تہذیب کے بنیادی ڈھانچے کے وقار کو محسوس کیا۔ ظالم سے آنکھیں ملائیں اور ظلم کا مقابلہ کیا۔ تشخص کی جنگ میں اتار چڑھاؤ بہت ہیں۔ نوآبادیات کی سائکی اپنا سایہ دراز کر رہی تھی۔ رد و قبول کا مسئلہ سامنے تھا۔ معاشرتی ہنگام اور سیاسی شکست و ریخت نے پورے تہذیبی ڈھانچے، ثقافتی نظام اور لسانی تشخص کو متاثر کیا۔ یہ معاملات ایک طرف، لیکن جب اس عہد میں دہلی کی ادبی فضا پر نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ علما، فضلا، شعرا، مشائخ، اطبا اور کیسے کیسے اصحابِ کمال یہاں جمع تھے۔ شاہ احمد سعیدؒ، شاہ عبدالغنیؒ، شاہ محمد آفاقؒ، سید احمد شہیدؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ، مفتی صدرالدین آزردہؒ، فضل حق خیر آبادیؒ، حکیم احسن اللہ خاں۔ حکیم محمد نجف خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم غلام حیدر خاں، شاہ نصیر، غالب، ذوق، بہادر شاہ ظفر، مومن، شیفتہ، امام بخش صہبائی وغیرہ۔ سیاسی اعتبار سے زمانہ بحران کا تھا، لیکن علمی و ادبی اعتبار سے نہایت توانا تھا۔ یہ اس زمانے کا امتیاز اور فخر تھا کہ ایسے باکمال بیک وقت ایک ہی جگہ جمع ہو گئے تھے۔ مومن نے اپنے عہد کے باطن میں اتر کر اسے محسوس کیا۔ تہذیبی عناصر کو اپنی شخصیت میں جذب کیا۔ مذہبی حمیت کا پاس رکھا۔ انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کی حمایت کی۔ مذہبی خرافات کے مخالف ہوئے۔ اصلاحی تحریک سے لے کر انقلابی رویوں کا خیر مقدم کیا۔ مختلف علوم میں مہارت حاصل کی لیکن شاعری کے آگے دیگر علوم پردۂ خفا میں چلے گئے۔ آج مومن کی شناخت کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے۔ تاریخ کے صفحات ان کے شعری رنگ و آہنگ اور فکری میلانات کی گواہی دیتے ہیں۔

تواریخ ادب اردو میں مومن کی حیات اور فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سرسید احمد خاں نے 'آثار الصنادید' میں ان کی کافی تعریف کی ہے۔ سید اعجاز حسین نے 'مختصر تاریخ ادب اردو' میں مومن کو دو صفحات دیے ہیں۔ انھی میں ان کی حیات اور کچھ شاعری سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ تواریخ میں ان کی حیات سے متعلق جتنی بھی معلومات ملتی ہیں، وہ ساری تذکروں کی مرہون منت ہیں۔ اعجاز حسین نے ان پر بھی لکھتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہے۔ اصل میں ابتدائی تاریخیں تذکروں کے مزاج سے زیادہ الگ نہیں۔ یہاں بھی مومن کے بارے میں تاثراتی جملے لکھے گئے ہیں۔ ان تاریخوں میں نظام نقد کی تلاش مناسب نہیں۔ اس لیے کہ یہاں شعری و فکری رویوں اور نظریوں کے بجائے بنیادی معلومات اور تعارف پر توجہ رہتی ہے۔ اعجاز حسین نے مومن کی پیدائش اور ان کے خاندان کے بارے میں بتاتے ہوئے ان کی شاعری پر اس نوع کی آرا قائم کیں:

- کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی آفرینی اور جدت بیان کے لحاظ سے اردو میں کم شعرا اس پایہ کے گزرے ہیں۔ فارسی ترکیبوں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے سادی بات کو بھی شاندار بناسکتے تھے۔ کبھی کبھی الفاظ کی تکرار تاثیر بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔
- اشعار میں تھوڑی سی پیچیدگی، طنز، تشبیہ اور استعارے کی ندرت ان کی انفرادی خصوصیات میں داخل ہیں اور فرسودہ خیال کو بھی اسلوب بیان کے زور سے نیا کر لیتے ہیں جس سے پر لطف معنویت پیدا ہوجاتی ہے۔
- ان کی جذبات نگاری میں اصلیت کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے، کیونکہ وہ واردات قلب اور محبت کی نفسیات کو مد نظر رکھ کر شعر کہتے تھے۔
- مومن کو مثنوی نگار کی حیثیت سے کوئی خاص شہرت نہیں حاصل ہوئی۔ ان کی مثنویاں ان کی حیات کی آئینہ دار ہیں۔
- قصائد کے اعتبار سے وہ قصیدہ لکھنے والوں کی پہلی صف میں نظر آتے ہیں۔ مگر طبیعت کی خودداری کسی بادشاہ یا امیر کا قصیدہ لکھنے سے مانع رہی۔ بزرگان دین کی شان میں متعدد قصیدے کہے۔ (16)

اپنے طور پر انھوں نے ادوار قائم کیے ہیں۔ ہر دور کی خصوصیات لکھی ہیں۔ غالب، مومن اور ذوق کے عہد کی خصوصیات لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالب اور مومن خیالات اور معنویت کی طرف زیادہ مائل تھے، جبکہ ذوق اور نصیر کا رجحان زیادہ تر زبان اور عروض کی طرف تھا۔ (17)

سید احتشام حسین نے بھی اعجاز حسین سے کچھ زیادہ الگ باتیں نہیں لکھیں۔ ان کی کتاب 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' بھی تنقید نہیں، تاریخ و تعارف ہے۔ مومن کی شاعری پر ان کے خیالات یوں ہیں:

- اچھے قصائد اور دلکش مثنویاں لکھنے کے باوجود ان کی شہرت کی بنیاد ان کی غزلیں ہیں۔
- ان کی شاعری کا موضوع عشق و محبت ہے اور اسی سے متعلق نفسیاتی اور جذباتی اظہار خیال۔
- مومن نے ایک محدود دائرے کے اندر عاشقانہ جذبات کو جن نئے نئے طریقوں سے پیش کیا ہے وہ دوسرے شاعروں کے یہاں مشکل سے ملے گا۔
- ان کے خیالات میں صداقت بھی ہے اور نفسیاتی کیفیت بھی لیکن گہرائی نہیں ہے۔
- شاعری میں وہ اس روایت کا تتبع کرتے ہیں جسے جرأت نے رواج دیا تھا۔
- ان کا محبوب کا تصور عامیانہ نظر آتا ہے۔
- کہا جاتا ہے کہ جوانی میں کسی طوائف سے یا ایسی ہی عورت سے محبت ہوگئی تھی جس نے ان کی مثنویوں اور غزلوں کو اسی رنگ میں غرق کر دیا۔
- زبان کسی قدر فارسی آمیز ہے۔ صنائع بدائع کے زیادہ استعمال سے کہیں کہیں مشکل بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا اسلوب اسی طرز کے دوسرے شاعروں سے مختلف ہے۔ کیونکہ ایک مخصوص پر کیف انداز کے علاوہ وہ جذبات محبت کے معمولی اظہار میں بھی کوئی ایسی پیچیدگی پیدا کرتے جو دلکش تو ہوتی ہے لیکن سمجھنے میں دشواری کا سبب بنتی ہے اور خیالوں کی چھوٹی ہوئی کڑیوں کو اپنی طرف سے جوڑنے ہی پر مطلب نکلتا ہے۔
- اس میں شبہ نہیں کہ ان کی غزلوں میں حسین بے ساختگی، لذت اور کیفیت کی فراوانی ہے جو فکر کا بدل بن جاتی ہے۔ (18)

اعجاز حسین ہی کی طرح انھوں نے بھی اس دور کی خصوصیات لکھی ہیں۔ اس عہد میں غالب کا سب سے بڑا بت بنتا ہے لیکن کوئی مومن کی غزل کا عاشق تھا اور کوئی ذوق کے طرز بیان کا حامی۔ کہتے ہیں کہ اس عہد میں دہلی کی مرتی ہوئی روح جاگ اٹھی تھی۔ زبان صاف ہوگئی تھی۔ مسائل بڑھے۔ غزل غالب و مومن کے ہاتھوں میں پہنچ کر زندگی کا جیتا جاگتا عکس نظر آنے لگی تھی۔ (19)

حوالے

1 محمد حسین آزاد، آب حیات، 2004، کتابی دنیا، دہلی، ص:10 2 ایضاً، ص: 342 3 محمد حسین آزاد، آب حیات، 2004، کتابی دنیا، دہلی، ص: 349 4 ایضاً، ص ص: 350-349 5 عبدالغفور نساخ، سخن شعرا، 1982، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ص:1 6 ایضاً، ص: 467 7 رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجم: مرزا محمد عسکری، 2000، ادارۂ کتاب الشفا، نئی دہلی، ص: 1 8 ایضاً، ص: 1 9 ایضاً، ص: 4 10 ایضاً، ص: 2 11 ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے 1857 تک)، 2009، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ص: 766 12 ایضاً، ص: 766 13 ظہیر احمد صدیقی، مومن: شخصیت اور فن، 1995، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ص: 63 14 ایضاً، ص: 65 15 محمد حسین آزاد، آب حیات، 2004، کتابی دنیا، دہلی، ص: 343 16 سید اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو، 1964، اردو کتاب گھر، دہلی، ص ص: 127-126 17 ایضاً، ص: 128 18 سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، 2009 (ساتواں ایڈیشن)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص: 125 19 ایضاً، ص: 137

■

ماخذ: مومن خاں مومن (حیات اور مطالعاتی ترجیحات): معید رشیدی، سنہ اشاعت: 2013، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ابرار احمد اجراوی

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی علامت
میلہ پھول والوں کی سیر

تین ہزار سال سے زیادہ قدیم شہر دہلی کی پیشانی پر ماضی کی عظمتوں کے نقوش کندہ ہیں۔ دہلی ایک شہر ہی نہیں، مشرقیت سے عبارت بین الاقوامی تہذیب وتمدن کا جلی عنوان بھی ہے۔ مغلیہ عہد کی یادگار عمارتیں قطب مینار، لال قلعہ، جامع مسجد، ہمایوں کا مقبرہ اور انگریزی عہد سے منسوب راشٹرپتی بھون، انڈیا گیٹ جیسے عالمی شہرت کے حامل مقامات کو اپنی گود میں لیے ہونے کی وجہ سے دہلی عالم میں انتخاب کہلاتی ہے۔ اور عالمی وراثت کے حامل شہروں کی فہرست میں اندراج کی چوکھٹ پر دستک دے چکی ہے۔ دستور اور آئین کی روشنی میں میسر حقوق کی بنا پر ہمارا ملک ہی جمہوری اور سیکولر اقدار کا علم بردار ہے، لیکن دہلی نے جمہوریت اور سیکولرازم کے اصول کی پاسداری اور اس کو فروغ دینے میں ملک کے دوسرے شہروں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ یہاں ہندو، مسلمان، سکھ ، پارسی، عیسائی، جین اور بودھ سبھی بھائیوں کی طرح بستے ہیں۔ پانڈوؤں اور مغلوں کے زمانے سے لے کر دہلی کی موجودہ تاریخ کے مدوجزر پر نظر ڈالیے، تو پتہ چلے گا کہ سارے فرقے نے اپنا خون جگر پلا کر اس شہر کو سیراب کیا ہے۔

جمنا کے دائیں کنارے آباد اس شہر کے مقام پر دوسرے ناموں سے تقریباً پندرہ شہر آباد ہو چکے ہیں۔ یہاں کئی سلطنتیں قائم ہوئیں، رعب وجلال والے مختلف بادشاہوں نے اس پر حکومت کی، فاتحانہ جذبوں اور جنگی خواہشات کی تکمیل میں اس شہر کا تقدس اور وقار بار بار پامال ہوا، محمد شاہ اور نادر شاہی جنرل احمد شاہ نے ہی صرف اس شہر کو تاخت وتاراج نہیں کیا، بلکہ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں نے بھی اس کی عزت وآبرو سے کھلواڑ کیا۔ دہلی اجڑتی اور بستی رہی، مگر دہلی کی تہذیب، اس کی اقدار اور وضع داری، اور اس کے عالمی تمدن پر کبھی موت طاری نہیں ہوئی۔ جو دہلی آتا وہ دہلی کے فن وثقافت اور اس کی گلیوں اور حویلیوں پر اس قدر فریفتہ ہوتا کہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا، ابراہیم ذوق نے اسی لیے تو کہا تھا:

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

دہلی ہمیشہ سے مختلف قوموں، متنوع نسلوں اور کئی مذہبی اکائیوں کا گہوارہ رہی ہے۔ قرون وسطیٰ کے حکمرانوں اور مغلوں نے تہذیبی مماثلت اور قومی یک جہتی سے عبارت دہلی کی اس شاندار تہذیب کو نہ صرف بڑھاوا دیا، بلکہ فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے نقش ونگار میں گراں قدر اضافہ بھی کیا۔ مذہبی رواداری، بقائے باہم، قومی یک جہتی، تہذیبی یکسانیت اور ایک دوسرے کے رنج وغم میں شرکت اس شہر کی تاریخ رہی ہے۔ شاہان ہند نے نہ صرف مشترکہ تہذیب وثقافت کی جم کر حوصلہ افزائی کی، بلکہ مذہبی حدود کو توڑتے ہوئے، غیر مسلم عورتوں سے شادی کر کے انھیں اپنے محل سرا میں مناسب جگہ دی۔ انھوں نے ہندو اور مسلم کے درمیان تفریق اور امتیاز کو کبھی روا نہیں رکھا۔ مسلم بادشاہ جس طرح عید، محرم اور دوسرے درباری تہواروں میں شریک ہوتے تھے، اسی طرح غیر مسلموں کے تہوار ہولی اور دیوالی میں بھی شرکت کو اپنا قومی اور وطنی فریضہ تصور کرتے تھے۔ تاکہ کسی قوم کے اندر تعصب اور مذہبی بنیاد پر تفریق کی شکار نہ ہو۔ اور ملک امن وسلامتی کے ساتھ ترقی اور خوش حالی کی راہ پر گامزن رہے۔

دہلی کے چنندہ تہواروں میں سے ایک تہوار پھول والوں کی سیر یا سیر گل فروشاں بھی ہے، جو مابعد آزادی، اپنے آغاز ثانی سے لے کر آج تک مسلسل دہلی میں حکومتی سطح پر منایا جاتا ہے، اس کی افتتاحی اور اختتامی تقریب میں ہمارے قومی حکمراں اور افسران خندہ پیشانی کے ساتھ شریک ہوتے اور اس کا اہتمام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یوں تو دہلی میں حکومتی سطح پر بہت سے تہوار آج بھی جوش وخروش کے ساتھ منائے جاتے ہیں، جن میں مذہبی تہوار بھی ہیں اور غیر مذہبی بھی، لیکن پھول والوں کی سیر کو ان تمام تہواروں میں اپنی رنگا رنگی کی وجہ سے جو امتیاز اور مقام حاصل ہے، وہ دوسرے تہواروں کو حاصل نہیں۔ یہ ایسا سالانہ تہوار ہے، جس میں دہلی کی صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس میلے سے دہلی کی شناخت قائم ہے۔ غالب نے صحیح کہا تھا: ''مغل سلطنت کے دارالحکومت دلی شہر کی شناخت چار چیزوں سے تھی، جن میں سے ایک پھول والوں کی سیر بھی تھی۔''

پھول والوں کی سیر ایک تاریخی میلہ ہے، ایسا میلہ جس کے آغاز وابتدا کی پوری کہانی شاہی ادوار میں مرتب ہونے والی تاریخوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ محفوظ ہے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ متحدہ ہندستان کے مشہور بادشاہ اکبر شاہ ثانی (عہد حکومت: 1837-1806) کے چہیتے بیٹے مرزا جہاں گیر نے لال قلعے میں مقیم ایک انگریز ریزیڈنٹ سر آرکیبالڈسٹین Sir Archibaldseton کو کسی ناگوار خاطر بات پر طمانچہ رسید کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق شہزادے نے سرسٹین کو لولو کہہ کر چڑایا تھا۔ بہرحال انگریز افسر کو مرزا کی اس حرکت سے بہت رنج ہوا۔ اس وقت بادشاہ وقت انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے۔ لال قلعے کے تخت طاؤس پر متمکن تو اکبر شاہ ثانی تھے، مگر حکم کمپنی بہادر کا ہی چلتا تھا۔ انگریز نے اس ہتک آمیز واقعے کی پوری تفصیل کمپنی کو لکھ بھیجی، تنبیہ کے طور پر یہ سزا تجویز ہوئی کہ تربیت کے لیے شاہزادے مرزا جہاں گیر کو نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دیا جائے۔ جہاں گیر کی ماں نواب ممتاز محل کو اپنے لخت جگر کی جدائی کس طرح راس آتی۔ رو رو کر اور کلیجہ پیٹ کر ان کا برا حال ہو گیا، مگر کمپنی کے حکم کے سامنے بادشاہ کیا، کسی کو بھی چوں چرا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ مہارانی نے خدا کے حضور یہ منت مانی کہ جب ان کے نور نظر مرزا جہاں گیر کو الہ آباد سے رہائی ملے گی، تو وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائیں گی۔ خدا کے فضل وکرم سے مرزا جہاں گیر سٹین کے ہی حکم سے رہا ہو کر بسلامت قلعۂ معلیٰ لوٹ آئے۔ خوشی میں الہ آباد سے لے کر دہلی تک پورے راستے میں شاہی طرز پر ان کا زوردار استقبال کیا گیا اور خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ حسب منت

بیگم نے اپنی منت پوری کرنے کے لیے شاہی آن بان اور ڈھول تماشے کے ساتھ آستانۂ پاک پر چادر چڑھائی۔ اس مخصوص درباری تقریب میں شہر دہلی کے ہندو اور مسلمان دونوں نے شرکت کی، مہرولی میں کئی دنوں تک میلہ لگا رہا۔ کیا ہندو اور کیا مسلم، سبھی ایک دوسرے کی بغل میں ہاتھ ڈالے، منہ میں پان کی گلوری ڈالے مٹر گشتی کرتے پھرتے تھے۔ بیگم اور بادشاہ وقت کو پھولوں پر مشتمل چادر چڑھانے کی یہ تقریب اور ہندو مسلمانوں کا مشترکہ میلہ بڑا پسند آیا اور دربار میں یہ تجویز پاس ہوئی کہ یہ میلہ ہر سال بھادوں کے مہینے میں لگایا جائے۔ مہیشور دیال صاحب نے اس میلے کے تاریخی پس منظر پر اس طرح روشنی ڈالی ہے: ''بادشاہ کو یہ میلہ اتنا پسند آیا کہ انھوں نے یہ تجویز کی کہ ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے اور مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں اور ہندو جوگ مایا جی کے مندر پر، مگر دونوں ہی جگہوں پر ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوں۔'' (عالم میں انتخاب- دلی، ص: 492، اردو اکادمی دہلی، 2009) یہاں یہ بات دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ راجا یدھسٹر کے عہد کے تعمیر شدہ جوگ مایا جی کے مندر کی از سر نو تعمیر بھی اکبر شاہ ثانی نے کرائی تھی۔

اس طرح پھول والوں کے اس میلے کا آغاز ہوا، جس کو مورخین سیر گل فروشاں کے نام سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر (عہد حکومت: 1837-1858) نے ہندو اور مسلمان کے مابین مودت ومحبت اور قومی یک جہتی کے تصور کو فروغ دینے کے لیے اس تہوار میں اتنی دل چسپی کا مظاہرہ کیا اور اس میلے کو ترقی کی معراج پر پہنچا دیا۔ شاہان وقت اتنے انصاف پسند اور عدل پرور ہوتے تھے کہ وہ جوگ مایا مندر اور خواجہ کے مزار دونوں جگہ خود حاضر ہوتے تھے اور اگر کسی وجہ سے پھول والوں کے قافلے کے ساتھ پہلے دن جوگ مایا مندر میں حاضری ان کے لیے ممکن نہ رہتی تو وہ اگلے روز خواجہ کی درگاہ پر بھی نہیں جاتے تھے، تاکہ ہندو مسلم کسی فریق کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک بار مسلمان بہادر شاہ ظفر کے سامنے بضد ہوگئے کہ قطب صاحب کی درگاہ حضور کی قیام گاہ سے قریب ہے، ہمارے پنکھے کے جلوس کے ساتھ چند قدم چلے چلیں، تو انھوں نے کہا: ''کل ہندوؤں کے پنکھے کے ساتھ گیا ہوتا تو تمھارے پنکھے کے ساتھ ضرور چلتا۔ آتش بازی ہندو مسلمان دونوں کی طرف سے چھوٹے گی اس میں شریک ہوں گا۔''

(دلی جو ایک شہر تھا، ص: 169، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 2003)

مہینے بھر چلنے والے اس میلے کی بھرپور عکاسی مہیشور دیال کے ان جملوں سے ہوجاتی ہے۔ لکھتے ہیں: ''مہرولی میں مہینوں پہلے سے ٹھہرنے کے بندوبست کیے ہوتے، مکان، کوٹھے، کوٹھریاں، باغ باغیچے سب آباد ہوجاتے۔ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ مہرولی کے بازار کی کایا پلٹ جاتی۔ دکانیں خوب سجتیں۔ دکانوں کے اوپر کوٹھے بھی بڑے قرینے سے سجائے جاتے تھے۔ جھاڑ فانوس، ہانڈیاں لٹکائی جاتی تھیں۔ یار لوگ نہایت نفیس کپڑے پہنے جوہی کے کنٹھے اور موتیا کے ہار گلے میں ڈالے، عطر کے پھوئے کان میں اڑسے، پان چبائے، حقے کا دم لگاتے۔ سیر کا لطف اٹھاتے گھومتے پھرتے۔ بھیڑ اتنی ہوتی کہ کھوے سے کھوا چھلنے لگتا اور گزرنا مشکل ہو جاتا۔'' (عالم میں انتخاب- دلی، ص: 495)

شاہی دور ختم ہوگیا لیکن جوگ مایا مندر اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھانے کی یہ تقریب آج بھی زندہ ہے۔

1857 کی شکست و ریخت اور خون خرابے نے دہلی کی دوسری روایتوں اور ان کے تاریخی حسن و جمال کو متاثر کیا ہی، انگریزوں کی سماج دشمن پالیسی اور ہندو مسلم کے درمیان شرانگیزی کی مہم سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کا نمونہ میلہ پھول والوں کی سیر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ بہادر شاہ ظفر کے رنگون جلا وطن کردیے جانے کے بعد یہ میلہ ضرور جاری رہا، مگر بادشاہ کی سرپرستی اور ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے جو رونق، چہل پہل، شان وشوکت، اخوت و بھائی چارے اور اتحاد و یک جہتی کی جو مسرت بخش فضا قائم رہتی تھی، وہ سب ماضی کی تاریخ کا حصہ بن گئی۔ اس میلے کا وہ زور وشور باقی نہ رہا جس کے لیے یہ دہلی کے ہندو مسلم، بوڑھے، جوان، بچوں، عورتوں اور شاہ وگدا میں مشہور تھا۔ مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد اگلے ساٹھ ستر سال کے عرصے نے اس روایت کو اتنا کمزور کردیا کہ ہندستان چھوڑو تحریک کے نتیجے میں اس کے باضابطہ بند کرنے کا اعلان کردیا گیا۔ لیکن جب برطانوی سامراج کے خلاف ہماری مشترکہ کوششوں سے وطن عزیز ہندستان کو انگریزوں کے ناپاک سایے سے نجات مل گئی، تو نہ صرف دہلی نے کھلی اور صاف فضا میں دوبارہ امن وسکون کی انگڑائی لی، بلکہ ہندو مسلم دوستی کے پرانے اور تاریخی رشتوں کو بحال کرنے کی فکر بھی سرکاری پیمانے پر تیز ہوگئی۔ ملک ضرور دولخت ہوگیا تھا، لیکن ہندستانیوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت، خیر سگالی پر مبنی جذبات اور قلبی یگانگت کا جو فطری جذبہ تھا، وہ ابھی مرا نہیں تھا۔ چنانچہ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس میلے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے 1862 میں اس کو دوبارہ شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی تاریخ میں بھی تبدیلی کردی گئی، اب برسات کے بجائے اس کے انعقاد کے لیے ماہ اکتوبر کا انتخاب کیا گیا۔ اسے تاریخی اتفاق ہی کہا جائے گا کہ یہی سال آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا سواں یوم وفات بھی تھا۔

اس قدیم تہوار کے از سر نو احیا کے حوالے سے انجمن سیر گل فروشاں سوسائٹی نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ بادشاہ، حشم و خدم اور شہزادے شہزادیوں کا تصور تو قصۂ پارینہ بن گیا ہے، اور اگرچہ مغلیہ دور جیسی برادرانہ فضا پر مبنی طلسماتی کیفیت کی بحالی ممکن نہیں رہی ہے، لیکن دہلی حکومت اور موجودہ انتظامیہ کی کوششوں کو نہ سراہنا بڑی ناانصافی ہوگی، کیوں کہ مغلیہ دور کے بادشاہ جس طرح شاہی دھوم دھام کے ساتھ منھ اندھیرے مہرولی پہنچ کر اس تاریخی تقریب کا اہتمام کیا کرتے تھے، دہلی حکومت نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے ان روشن روایتی نقوش کی تابندگی اور درخشندگی میں اضافہ کرنے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑی ہے۔ یہ تہوار ہماری مشترکہ تہذیبی وراثت کی یادگار ہے، آج بھی اس تہوار کے موقع پر جہاں مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ پر پھولوں کی چادر چڑھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، وہیں قریب میں ہی واقع جوگ مایا مندر میں بھی پھولوں کا پنکھا پیش کیا جاتا ہے۔ مشترکہ ثقافت اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے حوالے سے پھول والوں کی سیر کا یہ میلہ دوسروں کے لیے بھی مشعل راہ اور امن کا پیغامبر ثابت ہوا، دوسری ریاستیں بھی اس تہوار کے لیے روایتی پنکھا بھیج کر ہندو مسلم اتحاد کی اس علامت کو زندہ رکھنے میں اپنا بھرپور تعاون دے رہی ہیں۔ یہی نہیں، قومی یکجہتی کے موضوع پر مختلف ریاستیں اس میلے میں اپنی جھانکیاں بھی بھیجتی رہی ہیں جن میں سب سے اچھی جھانکی پر انعام دینے کی شروعات کی گئی تھی۔ مغل بادشاہ دہلی میں نہیں رہے اس لیے میلے کی روایتی شروعات کے لیے سب سے پہلے دہلی کے لفٹیننٹ گورنر کی رہائش گاہ پر شہنائی بجا کر انھیں روایتی پنکھا پیش کیا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی اطلاعاتی انقلاب کی صدی ہے، ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ: ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے توسط سے مشترکہ تہذیب و ثقافت کے ترجمان اس میلے کے، بھائی چارے پر مبنی پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا جاسکتا ہے۔

□

ABRAR AHMAD
Room No 21, Lohit Hostel,JNU, New Delhi -67

مصنف: سدرشن
مترجم: سرفراز جاوید

(ہندی کہانی)

ایتھنس کا ستیارتھی

یہ اس گزرے ہوئے عہد کی کہانی ہے، جب یونان عیش پرستی اور تہذیب کی انتہا پر تھا اور دنیا کی سب سے اچھی انسانی نسل یونان میں پیدا ہوتی تھی۔ رات کا وقت تھا، شعروفن کے کمال میں یکتا کبھی نہ بھلائے جانے والے ایتھنس شہر پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی، بے حسی تھی۔ سارے بازار خالی تھے، گلی کوچے سنسان تھے اور یہ خوبصورت آباد شہر اندھیرے میں دور سے اس طرح نظر آتا تھا جیسے کسی جنگل میں دھندلی سی تصویر کا پڑاؤ ہو۔

پورا شہر نیند میں پوری طرح غرق تھا۔ اس کے حکمراں اور عیش پرست بیٹے اپنی اپنی چارپائیوں پر بے سدھ پڑے تھے۔ مجرا خانے خالی ہو چکے تھے، عیش خانوں کے چراغ غل کر دیے گئے تھے، چوکیداروں کی آنکھوں کی پلکیں نیند کے بار بار جھٹکوں سے جھکی جاتی تھیں، لیکن ایک نوجوان کی آنکھیں نیند کے سکون اور سکون کی نیند سے آزاد تھیں۔

یہ دیوکلیش نام کا ایک طالب علم تھا، جس کی روح سچ کے دیدار کی متلاشی تھی۔ وہ ایک دولتمند شخص کا بیٹا تھا، اس کی دولت اس کے لیے ہر طرح کے شوق و آرام کا سامان خرید سکتی تھی۔ وہ انتہائی حسین وجمیل اور دلکش تھا۔ مادر یونان کی دوشیزائیں اس کے عشق میں دیوانی ہو رہی تھیں۔ وہ بہت زیادہ متفکر تھا اس کے ہلکے پھلکے تفکرات بھی اسکول کے اساتذہ کی رسائی سے باہر تھے، مگر اسے بھی اس پر لٹا دینے کے لیے آمادہ تھا۔ وہ اس مشن میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے پر عزم تھا۔ فانی جہاں کی فانی خوشیاں اس کے لیے بے معنی چیزیں تھیں۔ جوانی اور خوبصورتی کی زندہ تصویروں میں اس کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کسی طرح سچ کو اس کی اصل شکل میں براہ راست دیکھ لے۔ وہ سچ کو بے پردہ اور ننگا دیکھنا چاہتا تھا۔ ایسا نہیں جیسا وہ دکھائی دیتا ہے، بلکہ ایسا جیسا وہ حقیقت میں ہے۔ وہ اپنی اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔

دیوکلیش رات دن مطالعہ کرتا تھا۔

پڑھتا تھا اور سوچتا تھا۔ سوچتا تھا اور پڑھتا تھا، مگر اس کے ذاتی مطالعہ اور غور وفکر سے اس کے دل کی تشنگی سیراب نہ ہوتی تھی، بڑھتی جاتی تھی۔ یہ سچ کا مریض علاج سے مزید بیمار ہو جاتا تھا۔

اسکول کے آنگن میں ایک وسیع اونچا چبوترہ تھا، جس پر نا معلوم کب سے علم و دانش کی شہزادی سنگ مرمر کا لباس زیب تن کیے کھڑی تھی۔ دیوکلیش پتھر کی اس شہزادی کی مورتی کے برف مانند قدموں کے قریب آکر گھنٹوں بیٹھا رہتا اور اس عالم کے سرّ وبھید کے غور وفکر میں غرق رہتا۔ یہاں تک کہ اس کے دوستوں اور ہم جماعتوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کے دماغ میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اس کی اس تشویشناک حالت کو دیکھتے اور کڑھتے تھے۔

اس رات بھی دیوکلیش دیوی کے قدموں کے قریب بیٹھا تھا اور آہ وبکا کر رہا تھا، مہربانی کر! اے علم وعرفان کی سب سے بڑی دیوی، عنایت کر! میرے من کی مراد عطا کر۔ میں کئی برسوں سے تیری پوجا کر رہا ہوں، میں نے کئی روز صرف تیری یاد میں گزار دیے ہیں۔ میری دعا کے الفاظ سن اور انہیں قبول کر۔

دیوکلیش یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا اور دیوی کے پر جلال چہرے کی جانب دیکھنے لگا، مگر وہ اسی طرح خاموش تھی۔ اتنے میں چاند آسمان میں نمودار ہوا۔ اس کی خوش رنگ اور ٹھنڈی شعاؤں میں شہزادی کی مورتی اور دلکش دکھائی دینے لگی۔

اب دیوکلیش پھر دیوی کے قدموں میں بیٹھا تھا اور بچوں کی طرح رو رو کر دعا کر رہا تھا، تصور کیجیے وہ سنگ مرمر کی تصویر نہ تھی، اس دنیا کی زندہ عورت تھی، جو سنتی بھی ہے، جواب بھی دیتی ہے۔ عقلمند دیوکلیش نے پاگل پن کے جوش میں کہا آج فیصلے کی رات ہے۔ اے علم وعرفان کی دیوی! تو نے میرے اشتیاق کے سوز کو بھڑکایا ہے، تو ہی اسے سچ کے سرد پانی سے ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ سچ کہاں ہے؟ سدا بہار، لازوال حق۔ وہ سچ جس پر دانشور حضرات مناظرہ کرتے ہیں، جس پر علما غور وفکر کرتے ہیں، جسے لوگ یکسوئی میں تلاش کرتے ہیں، مندروں میں ڈھونڈتے ہیں، جس کے لیے دَر دَر بھٹکتے ہیں۔ میں وہ حق وہ سچ دیکھنے کا آرزومند ہوں، نہیں تو میں چاند کی اجلی چاندنی میں تیرے قدموں کی قسم کھا کر کہتا ہوں، کہ اپنی بے کار زندگی کو یہیں، اسی جگہ پر ختم کر دوں گا۔ مجھے سچ سے خالی زندگی کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ کہہ کر دیوکلیش نے اپنی چادر کے اندر سے ایک کٹار نکالی اور خودکشی کرنے کو تیار ہو گیا۔

یکا یک پتھر کی مورتی میں جان پیدا ہو گئی۔ اس نے دیوکلیش کے ہاتھ سے کٹار چھین لی، اسے آنگن کے ایک اندھیرے کونے میں پھینک دیا اور کہا. دیوکلیش۔

دیوکلیش کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا اور آرزو، خوشی اور شک کی نگاہ سے دیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ کیا یہ سچ ہے؟

ہاں، یہ سچ ہے دیوی کے ہونٹ سچ مچ ہل رہے تھے۔ دیوکلیش! دیوکلیش۔ دیوکلیش دیوی کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔

دیوکلیش موت کا راستہ اندھیرا ہے۔ تو میرا پجاری، میری آنکھوں کے سامنے اس راستہ پر نہیں جا سکتا۔ یہ

میرے لیے برداشت سے باہر ہے کہ میرے سامنے کوئی خودکشی کر لے۔ بول کیا مانگتا ہے؟ میں تیری ہر مراد پوری کرنے کو تیار ہوں۔

دیوکلیش کا دل حیرت انگیز خوشی میں دھڑک رہا تھا۔ اس کے منھ سے الفاظ نہ نکلتے تھے۔ وہ دیوی کے قدموں کے قریب بیٹھ گیا اور عقیدت سے بولا۔ مقدس دیوی! میں سچ کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ برہنہ، بے پردا، خالی سچ اور کچھ نہیں، صرف سچ۔

تو سچ کو جاننا چاہتا ہے؟ دیوی کے ہونٹوں سے آواز آئی۔ تو آپ سچ ہے۔ یہ آنگن بھی سچ ہے۔ میں بھی سچ ہوں۔ آنکھیں کھول، سچ دنیا کے کونے کونے میں موجود ہے۔

دیوکلیش۔ مگر اس پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سچ پوشیدہ ہے۔

دیوی۔ چشم بصیرت ان پردوں کے اندر کا منظر بھی دیکھ سکتی ہے۔

دیوکلیش۔ مقدس ماں! میں سچ کو بصیرت سے نہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں سوچ کر نہیں دیکھنا چاہتا، دیکھ کر سوچنا چاہتا ہوں۔

دیوی نے اپنا پتھر کا سفید، سرد ہاتھ دیوکلیش کے کندھے پر رکھ دیا اور شیریں لہجے میں بولی۔ بے پردہ، برہنہ سچ آج تک دنیا کے کسی بیٹے نے نہیں دیکھا، نہ دیوتاؤں نے کسی انسان کو یہ طاقت بخشی ہے۔ تو اناج کا کیڑا ہے، تیری آنکھوں میں یہ منظر دیکھنے کی قوت کہاں؟ میرا مشورہ ہے کہ تو یہ خیال چھوڑ دے اور اپنے لیے اور کوئی چیز مانگ، ابھی، اسی جگہ عطا کرونگی۔

دیوکلیش یونان کی سب سے بڑی دیوی! میں صرف برہنہ سچ دیکھنا چاہتا ہوں۔

دیوی ۔مگر اس کی قیمت۔

دیوکلیش۔ جو کچھ تو مانگے۔

دیوی۔ خزانہ، دولت، جمال، عزت سب تجھ سے چھوٹ جائیں گے۔ تجھے اپنی دنیا کو چاند اور سورج کی روشنی سے بھی آزاد کرنا ہوگا۔ شاید تجھے اس مشن میں اپنی زندگی کی قربانی دینی پڑے۔ بول! کیا اب بھی تو حق کی برہنہ شکل دیکھنا چاہتا ہے؟

دیوکلیش۔ مجھے سب کچھ منظور ہے۔

دیوی نے سر جھکا لیا۔

دیوکلیش۔ خدا کی کائنات میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے میں نہ چھوڑ سکوں۔

دیوی نے سر اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔ بہت اچھا! تو سچ کو دیکھ سکتا ہے، تجھے سچ دکھا دیا جائے گا، سچ کی حقیقی، برہنہ شکل تیرے سامنے ہوگی، صرف ایک بار نہیں آہستہ آہستہ چل! آج سچ کا ایک پردہ اٹھا، باقی ایک سال کے بعد!

یہ کہتے کہتے دیوی نے اپنی سفید پتھر کی چادر اتار کر چبوترہ پر رکھ دی اور دیوکلیش کو گود میں اٹھا لیا اور

دیکھتے ہی دیکھتے دیوی کے دونوں کاندھوں میں پریوں کے سے پر نکل آئے۔ دیوی نے پر کھولے، اور ہوا میں اڑنے لگی۔ پہلے شہر، مندروں کے کلش، پہاڑ، پھر چاند تارے، بادل سب نیچے رہ گئے۔ دیوی دیوکلیش کو لیے آسمان میں اڑی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیوکلیش کو بادلوں کے ایک پہاڑ پر کھڑا کر دیا۔ دیوکلیش نے دیکھا، زمین اس کے پاؤں تلے بہت دور، بہت نیچے ایک چھوٹے سے تارے کی مانند ٹمٹما رہی ہے، اور وہ تھی دنیا، جس کو وہ اتنا بڑا سمجھ رہا تھا، مگر دیوکلیش کا دھیان اس طرف نہ تھا۔ اس نے اپنے پاس سایہ میں چھپی ہوئی ایک دھندلی سی چیز دیکھی، اور دیوی سے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟

دیوی۔ یہی سچ ہے۔ یہ چھپ کر یہاں رہتا ہے، یہیں سے تیری اور بے شمار دنیاؤں کو نور بھیجتا ہے۔ اسی کی دھندلی روشنی میں بیٹھ کر سیانے لوگ دنیا کی پہیلیوں کو حل کرتے ہیں، اور استاذ اپنے شاگردوں کو حیات وزیست کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہی روشنی کائنات کا سورج ہے، یہی نور انسانی کردار کا نمونہ۔ تو کہے گا، یہ تو زیادہ منور نہیں، لیکن دیوکلیش! تیرے شہر کے قریب جو ندی بہتی ہے، اگر اس کی ریت کا ایک ایک ذرہ سورج بن جائے، تب بھی اس میں اتنی روشنی نہ ہوگی، جتنی اس پہاڑ کے سایہ میں ہے، مگر وہ پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ چل، آگے بڑھ اور اس کا ایک پردہ پھاڑ دے۔

دیوکلیش نے ایک پردہ پھاڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایسا معلوم ہوا جیسے جہاں میں ایک نئے طرح کا نور پھیل گیا ہو۔ سچ کا سایہ اب پہلے سے زیادہ صاف اور چمکدار تھا۔ دیوی دیوکلیش کو پھر ایتھنس میں اڑا لائی اور اپنی سنگ سنگ مرمر کی چادر اوڑھ کر پھر اسی چبوترہ پر اسی طرح خاموش کھڑی ہو گئی۔

اب دیوکلیش کی نظر میں سونے اور چاندی کی قیمت نہ تھی۔ وہ لوگوں کو دولت کے پیچھے بھاگتے دیکھتا، اسے تعجب ہوتا تھا۔ وہ چاندی کو سفید لوہا اور سونے کو پیلا لوہا کہتا تھا اور ان کو حاصل کرنے کے لیے اپنا وقت ضائع نہ کرتا تھا۔ اسے اپنے پڑھنے کا جنون تھا، دن رات پڑھتا رہتا تھا۔ اس کے باپ نے اس کی صوفیانہ طبیعت کو دیکھ کر کہہ دیا، کہ اس کو میری جائداد میں سے کچھ نہ ملے گا، مگر دیوکلیش کو اس کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ اس کے دوست احباب کہتے۔ دیوکلیش! یہ عمر، جوانی گرم خون کی ہے۔ سفید بال اور جھکی ہوئی کمر کا زمانہ شروع ہونے سے پہلے کچھ جمع کر لے۔ نہیں تو بعد میں پشیمان ہوگا۔

دیوکلیش ان کی طرف تعجب کی نظر سے دیکھتا اور کہتا۔ تم کیا کہہ رہے ہو، میں کچھ نہیں سمجھتا۔

ایتھنس کے ایک بہت دولت مند شخص کی کنواری بیٹی اب بھی دیوکلیش کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کی دیوانی تھی۔ وہ دیوکلیش کی اس حالت کو دیکھتی اور کڑھتی تھی۔

دیوکلیش کے کھانے پینے کا بندوبست بھی وہی کرتی تھی، ورنہ وہ بھوکا پیاسا مر جاتا۔

اسی سال کے تین سو پینسٹھ دن پورے ہو گئے۔ رات کا وقت تھا، ایتھنس پر پھر خاموش گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دیوکلیش نے پھر دیوی کے قدموں پر سر جھکایا۔ دیوی پھر اسے بادلوں کے پہاڑ پر لے گئی اور دیوکلیش نے سچ کا دوسرا پردہ پھاڑ دیا۔ اس طرح سچ کا نور اور بھی صاف ہو گیا۔ دیوکلیش نے اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں کو وہ علمی بصیرت مل گئی، جو جوانی اور نزاکت کے لال لہو کے پیچھے چھپے ہوئے بڑھاپے کی ایک ایک جھری کو دیکھ سکتی ہے۔ پھر وہ اپنی بناوٹ اور لاعلمی کی دنیا میں واپس چلا آیا۔ دیوی پھر سنگ مرمر کا مجسمہ بن کر کھڑی ہو گئی۔

ایک روز اس کے ایک دوست نے کہا۔ دیوکلیش آج یونان کی ساری کنواری لڑکیاں ایتھنس میں جمع ہیں اور آج یونان کی سب سے خوبصورت دوشیزہ کو خوبصورتی کا انعام دیا جائے گا۔ کیا تو بھی چلے گا؟

دیوکلیش نے مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ سچ وہاں نہیں ہے۔

دوسرے دن ایک استاذ نے کہا۔ آج یونان کے سارے لوگ اسکول میں جمع ہیں۔ کیا تم ان سے ملاقات کرو گے؟

دیوکلیش نے ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔ سچ وہاں بھی نہیں ہے۔

تیسرے دن ایک پیر نے کہا۔ آج چاند دیوی کے بڑے مندر میں دیوتاؤں کی پوجا ہوگی۔ کیا تم بھی آؤ گے؟

دیوکلیش نے لمبی آہ بھری اور کہا۔ سچ وہاں بھی نہیں ہے۔

اور اس ستیارتھی یعنی طالب حق نے اپنی جوانی ہی میں سبھی طرح کے لالچ پر فتح حاصل کر لی۔ اب وہ کامل پیر تھا، مگر وہ ایتھنس کے کسی میلے میں نظر نہ آتا تھا، اس کی آواز کسی مجلس میں سنائی نہ دیتی تھی۔

ستیارتھی سال بھر یکسوئی سے مطالعے میں غرق رہتا اور اس کے بعد بادلوں کے پہاڑ پر جا کر سچ کا ایک پردہ پھاڑ آتا تھا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ اس کا علم روز بہ روز بڑھتا گیا، مگر اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں، کمر جھک گئی تھی، سر کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ اس نے سچ کی تلاش میں اپنی جوانی بڑھاپے کی نذر کر دی تھی، مگر اس کو اس کا دکھ نہ تھا، کیونکہ وہ جوانی اور بڑھاپے، دونوں کی معرفت حاصل کر چکا تھا۔

اور لوگ یہ تسلیم کرنے لگے تھے، دیوکلیش نے اپنے لیے اپنی کوٹھری کو قبر گاہ بنا لیا ہے۔

آخر وہ محبوب رات آ گئی، جس کے انتظار میں دیوکلیش کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک سال، ایک ایک صدی سے طویل معلوم ہوتا تھا۔

آج سچ کے نقاب سے آخری پردہ اٹھے گا۔ آج وہ سچ کو برہنہ بے پردہ دیکھے گا، جسے دنیا کے کسی فانی بیٹے نے آج تک نہیں دیکھا۔ آج اس کی زندگی کی سب سے بڑی مراد پوری ہو جائے گی۔

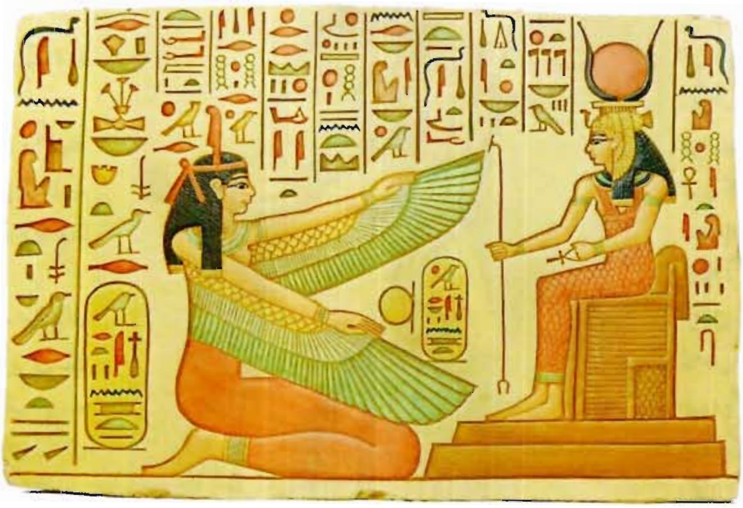

آدھی رات کو اسے علم و عرفان کی دیوی نے آخری بار گود میں اٹھایا، اور بادلوں کے پہاڑ پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔

دیوکلیش نے سچ کی طرف مشتاق ہو کر دیکھا۔

دیوی نے کہا۔ دیوکلیش! دیکھ، اس کا نور کیسا صاف اور تیز ہے۔ آج تک تو نے اس کے جتنے پردے اتارے ہیں، وہ اس کے پردے نہ تھے، تیرے دماغ کے پردے تھے! سچ کا ایک ہی پردہ ہے، آگے بڑھ اور اسے اتار دے، لیکن اگر تو چاہے، تو اب بھی لوٹ جا۔ میں تجھے ساتوں سمندروں کے موتی اور ساری دنیا کا سارا سونا دینے کو تیار ہوں، تیری گئی ہوئی صحت واپس مل سکتی ہے، تیری اجڑی ہوئی زندگی واپس کی جا سکتی ہے۔ مجھ سے بول، تیرے سر کے سفید بالوں کو چھو کر پھر سے کالا کروں گی۔ دیوکلیش اب بھی وقت ہے! اپنی قسم چھوڑ دے!

مگر بہادر ستیارتھی نے دیوی کا کہنا نہ مانا، اور آگے بڑھا۔ اس کا کلیجا دھڑک رہا تھا، اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اس کا سر چکرا رہا تھا، مگر وہ پھر بھی آگے بڑھا۔ اس نے اپنی روح اور جسم کی طاقت کو ہاتھوں میں جمع کیا اور انہیں پھیلا کر سچ کا آخری پردہ پھاڑ دیا۔

او خدا!

چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا تھا، ایسا مہیب اندھیرا جیسا اس سے پہلے دیوکلیش نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس نے چلّا کر کہا۔ دیوی ماتا! یہ کیا ہو گیا؟ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا، وہ جو پردے کے پیچھے تھا، کہاں چلا گیا۔

دیوی نے پردے کے پیچھے سے کہا۔ دیوکلیش! دیوکلیش!!

دیوکلیش نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ دیوی! مجھے بتا، وہ کہاں ہے؟ میں کہاں ہوں، تو کہاں ہے؟

دیوی نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اس کے کندھے پر رکھا، اور جواب دیا۔ دیوکلیش تیری آنکھیں برہنہ سچ براہ راست دیکھنے کی تاب نہ لا کر پھوٹ گئیں۔ اب دنیا کی ایسی کوئی طاقت نہیں، جو انہیں ٹھیک کر سکے۔ میں نے تجھ سے کہا تھا، اُس سچ کا پیچھا کرنا چھوڑ دے، مگر تو نہ مانا، اور اب تو نے دیکھ لیا کہ جب انسان سچ کو برہنہ دیکھنا چاہتا ہے، تو کیا دیکھتا ہے۔

سچ پردوں کے اندر ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جب اس کا پردہ اتار لیا جاتا ہے، تو انسان وہ دیکھتا ہے، جو کبھی نہیں دیکھ سکتا۔

دیوکلیش بادلوں کے پہاڑوں پر منھ کے بل گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ہزاروں سال گزر چکے ہیں، مگر ایتھنس کے ستیارتھی کی تلاش اب بھی جاری ہے۔ اگر کوئی آدمی بادلوں کے پہاڑ کی سنسان گھاٹیوں میں جا سکے، تو اسے دیوکلیش کے رونے کی آواز اب بھی اسی طرح سنائی دے گی۔

■

Sarfaraz Javed, Dept of Urdu, Delhi University, Delhi - 110007

تبصرہ و تعارف

ہماری غذا

مصنف: شکیل احمد

صفحات: 164 قیمت: /50 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مبصر: محمد طاہر صدیقی، این B/139 ابوالفضل انکلیو

جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

غذا انسانی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے بلکہ انسان کی صحت، قوت اور نشو و نما کا انحصار اس کی غذا پر ہے۔ یہ انسانوں کو مختلف بیماریوں سے حفاظت کرنے میں معین و مددگار ہوتی ہے۔ انسان کا جسم ایک کارخانے کے مانند ہے۔ جس میں مختلف مشینیں ہمہ وقت اپنے اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ جسم کے کارخانے میں مشینوں کا کام مختلف ہوتے ہوئے بھی ان میں باہمی ربط پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشین کے کسی ایک پرزے کے خراب ہونے سے پورے کارخانے پر اثر پڑتا ہے۔

جسمانی کارخانے کی مشینوں کی کارکردگی کے لیے ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایندھن مختلف حصوں کو مختلف شکلوں میں پہنچایا جاتا ہے۔ اگر ناقص اور خراب ایندھن دیا جائے تو وہ کارخانے میں پہنچ کر مشینوں کے قیمتی پرزوں کو خراب کردے گا اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ کوئی پرزہ یا مشین خراب ہوجائے تو نتیجے میں پورا کارخانہ ہی بند ہوجائے۔

بعینہ یہی کیفیت انسانی جسم کی ہے۔ اس میں مختلف نظام ہیں مثلاً ہاضمی نظام جو کئی اعضا اور مرحلوں پر مشتمل ہے۔ خاص اعضا میں منہ، معدہ، آنت، لبلبہ، جگر وغیرہ ہیں۔ مرحلوں میں رطوبات ہضم، انزائم وغیرہ کے کام، غذا کا انجذاب اور استمالہ وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح تنفسی نظام جس کے اہم اعضا ناک، پھیپھڑے وغیرہ ہیں۔ دورانی نظام جس میں دل، ورید اور شریان وغیرہ شامل ہیں۔ عصبی نظام جو دماغ، اعصاب اور حسی اعضا پر مشتمل ہے۔ اخراجی نظام کے خاص اعضا گردے ہیں۔ درون افرازی نظام جس میں بے قنات غدود شامل ہیں۔ جو ہارمون پیدا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جلدی نظام، کالبدی نظام، عضلاتی نظام اور تولیدی نظام وغیرہ بھی اہم ہیں۔

جسم میں ایندھن کا کام وہ چیز کرتی ہے جو ہم بطور غذا کے لیتے ہیں۔ اگر غذا ٹھیک اور مناسب مقدار میں ملتی ہے تو جسم کے تمام اعضا صحیح کام کرتے ہیں۔ غذا کے خراب، کم یا نہ ملنے پر جسم کے اعضا رفتہ رفتہ کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ جس سے بیماریاں آگھیرتی ہیں۔ اگر مناسب غذا اور علاج سے ان کا تدارک نہ کیا جائے تو انسان آخر کار موت کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لیے غذا انسان کی بنیادی اور سب سے اہم ضرورت ہے۔ زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ انسان کی تمام تر کوششوں اور کاموں میں اس کو خاص دخل ہے۔ کسی فرد یا ملک کے مسائل میں غذا کا مسئلہ اولین اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

دنیا میں مختلف قسم کی غذائیں دستیاب ہیں۔ ان کی خصوصیت اور فائدے الگ الگ ہیں۔ آج کے دور میں سائنسی تحقیقات کی بدولت غذا کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم ہوگئی ہیں۔ ہم ان سے استفادہ کرکے غذاؤں کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ غذا کے انتخاب میں لاپروائی برتنے اور متوازن غذا نہ استعمال کرنے کے نتیجے میں لوگ سوء تغذیہ اور نقص تغذیہ کا شکار ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاشی حالات، سماجی بندشیں کچھ اس طرح کی ہوتی ہیں کہ صحیح غذا انسان کو نہیں مل پاتی ہے۔

ایک اور بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ صرف غذا حاصل کر کے ہی ہم نہ تو اچھی صحت اور امراض سے نجات حاصل کرسکتے ہیں اور نہ اس طرح اپنے آپ کو خوش رکھ سکتے ہیں بلکہ اس کے لیے اپنی زندگی میں کچھ پابندیاں، کچھ حفظان صحت کے اصول پر عمل اور اطبا و حکما کے مفید مشوروں پر عمل کرنا پڑے گا۔ غذا سے ہم فائدہ اسی وقت اٹھا سکتے ہیں جبکہ وہ صحیح طریقے سے ہضم ہوکر جسم میں استعمال ہو۔ اس کے لیے بھوک کا ہونا ضروری ہے۔ جسمانی محنت نہ کرنے اور کاہل پڑے رہنے سے نہ تو غذا صحیح طریقے سے ہضم ہوگی اور نہ بھوک لگے گی۔ بغیر بھوک کے کھانا یا بھوک سے زیادہ کھانا بیماری کو دعوت دینا ہے۔ اسی طرح زیادہ محنت اور کم غذا سے بھی انحطاط شروع ہوجاتا ہے۔ بہتر ہے کہ اعتدال برقرار رکھا جائے۔

غذا کے موضوع پر دیگر زبانوں میں بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر ابھی بہت کم کتابیں دستیاب ہیں۔ اس لیے اردو زبان میں ایک ایسی کتاب جو اس سلسلے میں مفید معلومات فراہم کرسکے وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس بارے میں یہ کتاب اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ جس میں غذا سے متعلق تکنیکی معلومات کو عام فہم اور دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے تاکہ ایک عام قاری بھی اسے آسانی سے سمجھ سکے اور استفادہ کرسکے۔

شکیل صاحب کی یہ کتاب 'ہماری غذا' ہر لحاظ سے اردو قارئین کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔ اس سے ہر عمر کے لوگ مستفید ہوسکتے ہیں مختصر یہ کہ آج کے سائنسی دور میں اس کی بڑی اہمیت ہوگی اور اس کا خاص و عام لوگ بڑی دلچسپی اور معلومات کے تئیں مطالعہ کریں گے۔

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت

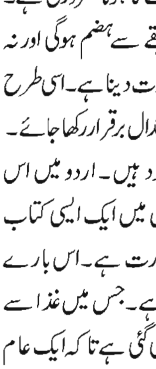

مرتب: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات: 493، قیمت: 166

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مبصر: امتیاز وحید

F-158، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

انسانی ضروریات اور زندگی کی کثافتوں سے نجات پانے اور پرسکون لمحوں کی تلاش سفر کا محرک ہے، اس سیاق میں سفر انسانی جبلت میں شامل ایک ناگزیر عمل ہے، جس سے ہر بشر فطری طور پر گزرتا رہتا ہے، سفر کی انھی ناگزیریت نے اس کے سائنٹفک مطالعے کی راہ ہموار کی اور اب یہ باقاعدہ اصناف ادب کا حصہ ہے۔ سفر دقتوں، صعوبتوں اور زحمتوں کے ساتھ خوش کن لمحات، علم و آگہی، دور بینی اور جہاں بینی کی دولت بھی عطا کرتا ہے، سفر کو انھی سیاق میں وسیلۂ ظفر گردانا گیا ہے، ماضی کے بالمقابل جدید دنیا کی سہولتوں کی بدولت سفر نے نئی کروٹ لی ہے، زمین سے چاند کا سفر، خلاؤں کی سیر اور اتھاہ گہرے سمندر کی تہہ میں فرصت کے لمحات اب انسانی دسترس سے باہر نہیں۔ عصری منظر نامہ میں

سفر اب حقیقی معنوں میں بین ثقافتی نمائندہ بن گیا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کی زیرنظر کتاب سفرناموں میں لکھے گئے ہندوستان اور اس کی تہذیبی بوقلمونی کو موضوع بناتی ہے، بنیادی طور پر یہ کتاب ان مقالات کا مجموعہ ہے جو مارچ 2012 میں 'اردو سفرناموں میں ہندستانی تہذیب وثقافت' کے موضوع کے تحت پڑھے گئے۔ اس میں کل 41 مقالے شامل ہیں جنھیں چار مختلف ذیلی عناوین کے تحت رکھا گیا ہے۔ یہ مضامین ہندوستان اور اس کی مختلف ریاستوں، شہر، قصبہ یا علاقے کی تاریخ، تہذیب، عام زندگی کی بود و باش، پیشہ وتجارت، علمی و ادبی سرگرمیاں، فکر و تحقیق، کاشت، میوہ جات، ہندوصنمیات اور ہندستانی زندگی کے دیگر متعلقہ گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

'ہندوستانی تہذیب وثقافت' کے زمرے میں شامل پہلا مضمون سفرنامہ کے ادبی سروکار سے بحث کرتا ہے جس میں تاریخی حوالے سے ہجرت رسول کے سیاق میں تاریخ اسلام میں سفر کو انسانی اور اخلاقی تصور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون سفرنامے کے صنفی ابعاد پر روشنی ڈالتا ہے اور تفصیل سے سفرنامہ کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے 'سفر کرنے' کو سفرنامہ نگاری سے مشروط کرتا ہے۔ اس حصے کے بیشتر مضامین میں ابن بطوطہ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے کہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ہندوستان کو کن خصوصیات کا حامل بتایا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں اس کے بیانیہ کی کیا خصوصیت ہے یا یہ کہ ابن بطوطہ نے ہندوستان کے پھل اور مختلف میووں کا کس طرح ذکر کیا ہے، 'کتاب الہند' کے حوالے سے ہندو صنمیات، ہندوالٰہیات اور ہندو اساطیری تصورات پر البیرونی کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے جب کہ اس زمرے کے بعض مضامین سفرناموں میں ثقافتی اور تمدنی پہلو کے لیے مختص ہیں۔

'دہلی اور ہندوستانی ریاستیں' عنوان کے تحت سات مضامین میں دہلی، دکن، بنگال، وادیِ کشمیر، لداخ اور پونے سے رانچی کے حوالے سے موضوع کے مختلف جہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ روزنامچہ کی صورت میں قلم بند مولانا حکیم عبدالحی کی قدیم ترین روداد سفر جو بعد میں 'دہلی اور اس کے اطراف' کے نام سے شائع ہوئی ہے، پر ایک مبسوط جائزہ شامل ہے۔ اس زمرے میں شامل مضامین متذکرہ خطوں کی تہذیب، تاریخ اور عام سماجی زندگی کی حرارت سے عبارت ہے۔

'ہندوستان غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں' یہ حصہ ان تاثرات پر مبنی ہے جو ہندوستان کی سیر و سیاحت پر آئے غیر ملکی سیلانیوں نے تحریری شکل میں لکھی ہیں۔ ان میں عرب، برطانیہ اور پاکستان خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عرب سیاحوں کی نظر میں عہد وسطیٰ کا شہر دہلی کی مرکزی حیثیت پہ قابل قدر گفتگو کی گئی ہے۔ اس حصے میں کولونیل دور کی برطانوی خواتین سیاح کی نظروں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کے تئیں جو کچھ دیکھا، برتا اور پایا ساتھ ہی استعماری ہند کے سفرناموں میں بازار کلچر، صائب تبریزی اور علی حزیں کی فارسی شاعری میں ہندوستانی تمدن اور بیرونی سیلانیوں کے سفرناموں میں جنت نشاں خطۂ کشمیر کے تذکرہ پر بحث شامل ہے۔

آخری حصہ سفرناموں کے جائزے پر مشتمل ہے، جس میں دس سفرناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جناب کوثر نیازی کا سفرنامہ 'نقشِ رہ گزر' ہندوستان میں ان کے دو اسفار کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس میں سفرنامہ نگار کے دلی جذبات وکیفیات کے ساتھ تصوف، تاریخ اور ادب وسیاست کے بعض اہم گوشے زیر بحث آئے ہیں۔ 1952 میں سفر امریکہ اور یورپی ممالک کے سفر پر مشتمل ممتاز ترقی پسند نقاد پروفیسر احتشام حسین کا سفرنامہ 'ساحل اور سمندر' کا تہذیبی مطالعہ کیا گیا ہے، یہ ڈائری کی ہیئت میں لکھا گیا سفرنامہ ہے، معروف ترکی اسکالر کے سفر ہند کی روداد پر مشتمل 'درونِ ہند' کو اس کے مشمولات کے پیش نظر ہندوستانی تہذیب وثقافت کا آئینہ بتایا گیا ہے اس کے علاوہ رضا علی عابدی کا مقبول زمانہ 'جرنیلی سڑک'، شہزاد منظر کا سفرنامہ 'تین شہروں کی کہانی'، انتظار حسین کی 'جستجو کیا ہے؟'، سید سلیمان ندوی کا 'جنوبی ہند'، دوسیوتھیونو کا 'سفرنامہ دکن'، حسن رضوی کا 'دیکھا ہندوستان' اور قمر عباس جعفری کا سفرنامہ 'رپورٹر کی ڈائری' کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس پر مستزاد سفرنامہ کے اغراض ومقاصد، علمی اور فکری بازیافت اور اس کی تمدنی اور ادبی معنویت پر مشتمل ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا پر مغز مقدمہ ہے جو ہندوستانی تہذیب وثقافت پر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بجا طور پر سفر کو 'آدھا علم' کا منبع قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ''سفر کے مشاہدوں نے میری نگاہ کو وسعت دی۔ جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں رہتے ہیں۔'' اس حوالے سے توقع ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی مرتب کردہ اس کتابی پیش کش کو علمی حلقے میں قدر کی نگاہ سے ضرور دیکھا جائے گا۔

بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ

مترجم: صلو چودھری (صلاح الدین چودھری)
قیمت: ندارد، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: ملینیم اڈیسی 67 شیکسپیئر انی کلکتہ
مبصر: عطاء الرحمٰن قاسمی، N-80 C ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

بھگوت گیتا معروف مذہبی کتاب ہے۔ جو ہندوؤں کے آستھا وعقیدے کے مطابق شری کرشن کی تعلیمات واپدیشوں پر مبنی ہے۔ جنھوں نے کروکشیتر کی زمین (جو کورووں اور پانڈووں کے درمیان واقع ہوئی تھی) ایک استاذ وگرو کی حیثیت سے ارجن کو دیے تھے، اور ارجن نے اس کا پورا پالن کیا تھا اور یہی بھگوت گیتا کی اصل روح اور فلسفہ حق و باطل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دورانِ معرکہ ارجن، شری کرشن سے استفسار کرتے تھے اور شری کرشن اپنے گیان وعرفان سے انھیں نوازتے تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ باوجود اس کے مہابھارت میں کوروؤں کی عددی اکثریت تھی اور اقتدار بھی ان کے ہاتھوں میں تھا اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ بھی ان کے گرد جمع تھا لیکن فتح وکامرانی پانڈووں کے حصے میں آئی جس کے روحانی سربراہ وروح رواں شری کرشن تھے۔ اور ارجن ان کے وفادار بھگت اور شریک معرکہ کارزار تھے۔

بھگوت گیتا کے متعدد فارسی واردو تراجم ہوئے ہیں۔ دور اکبری کے مشہور شاعر اور اکبر کے مصاحب فیضی نے بھی اکبر بادشاہ کے حکم سے ہندو مسلم کے اتحاد اور قومی یکجہتی کے فروغ کے جذبے سے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا جس کے بارے میں علامہ اقبال کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے جس کی بنا پر خود علامہ اقبال نے بھگوت گیتا کے ترجمہ کرنے کا عزم کیا تھا، جیسا کہ علامہ نے خود مہاراجہ ہرکشن پرشاد کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''اگر وقت نے اجازت دی تو میں نے گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نے فیضی کے ذریعے کیا ہوا گیتا کا فارسی ترجمہ دیکھا ہوگا۔ کوئی شخص ان کی تحریر کی عظمت سے انکار نہیں کرسکتا لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے گیتا کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے متن اور طرزِ نگارش کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ فیضی گیتا کی روح کو سمجھ نہیں پائے۔''

دنیائے اردو زبان و ادب میں سب سے پہلا اردو ترجمہ سترہویں صدی میں عبدالمتین نامی بزرگ کے قلم سے معرض وجود میں آیا تھا لیکن یہ ترجمہ منثور تھا یا منظوم تھا۔ اس کا علم مجھے نہیں ہو پایا ہے۔ اس کے بعد بھی برابر بھگوت گیتا کے تراجم کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ خواجہ محمد دل نے بھی اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد خلیفہ عبدالحکیم کا کیا ہوا ترجمہ اصحاب علم ومعرفت کے سامنے آیا۔ جناب شان الحق حقی کے کیے ہوئے ترجمے کا بھی سراغ ملتا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ مولانا آزاد کے سکریٹری محمد اجمل خاں نے بھی اس کا ترجمہ کیا تھا۔

اس کے بعد حسن الدین احمد نے بھی اس کا ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا لیکن یہ تمام تراجم زبان و بیان اور تعبیرات وتشریحات کے اعتبار سے تاریخ زبان وثقافت کے حصے بن چکے ہیں۔

ماضی میں نہیں بلکہ حال قریب میں بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ ارباب علم و دانش کے سامنے آیا ہے، جس کے فاضل مرتب ومحشی جناب صلاح الدین چودھری معروف بہ صلو چودھری ہیں۔ حالاں کہ وہ دوسرے میدان کے شہسوار ہیں، جنھوں نے اپنے پیش رو ترجمہ نگاروں کے برعکس بھگوت گیتا کا ترجمہ ایسا عام فہم سادہ وسلیس اور شستہ وشگفتہ کیا ہے جس سے بھگوت گیتا کے مطالب ومفاہیم سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کسی مذہبی کتاب کا ترجمہ اور وہ بھی منظوم ترجمہ کوئی آسان کام نہیں خاصا مشکل کام ہے۔ کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی و بے توجہی سے بڑے سنگین مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن چودھری صاحب نے ان تمام تر نزاکتوں اور مذہبی حساسیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بھگوت گیتا کا نہایت عمدہ منظوم ترجمہ کیا ہے اور ان اپدیشوں اور تعلیمات کی اصل روح تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ کریں اور چودھری صاحب کے اسلوب بیان اور طرز ادا کی داد دیں:

وہ قطرہ سمندر ہی کہلائے گا
سمندر میں شامل جو ہوجائے گا
سب آشائیں ہوجائیں گم سینے میں
تو حاصل اسے ہو خوشی جینے میں

چودھری صاحب بھگوت گیتا میں ایک دوسری جگہ ترجمہ وترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں اور سبھوں کے دلوں کو موہ لیتے ہیں:

کسی روپ کا بھی بچاری وہ ہو
اگر اپنے کرموں سے بھاری وہ ہو
تو ایسا بچاری بھٹکتا نہیں
کسی دوار پر سر پٹکتا نہیں

صلاح الدین چودھری جہاں ایک اچھے شاعر ہیں، وہاں ایک اچھے محقق اور حاشیہ نویس بھی ہیں۔ انھوں نے بڑے تحقیقی وقیمتی حواشی وتعلیقات قلم بند کیے ہیں، جن سے ان اشعار کی تفہیم وتعبیر میں بڑی مدد ملتی ہے۔ آخر میں سنسکرت کے الفاظ اور ان کے معانی بیان کیے گئے ہیں اور بھگوت گیتا میں جو اسما واماکن آئے ہیں ان کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ غرضیکہ ایک تحقیقی کتاب ہے جو زبان وبیان اور اسلوب ادا کے اعتبار سے لاجواب منظوم کتاب ہے۔

مجھے یقین ہے بھگوت گیتا کا یہ منظوم ترجمہ علمی و مذہبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور گیتا شناسی کا ذریعہ بنے گا۔

آخر میں میں چودھری صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کرکے ہندو مسلم بھائی چارگی کی پرانی فضا قائم کرنے اور قومی یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے کی جانب ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ موصوف ہم سبھوں کے شکریے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

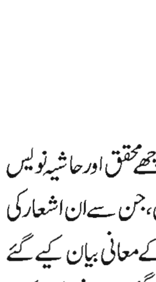

کلیات- فضا ابن فیضی

ترتیب وتدوین: محمد جابر زماں
صفحات: 912، قیمت: 400 روپے
ناشر: مکتبہ نعیمیہ، صدر بازار، مئوناتھ بھنجن، یوپی
مبصر: ثوبان سعید، خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی، لکھنؤ

موجودہ دور میں کتابوں کی طباعت واشاعت کے کام میں کافی حد تک سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ کمپیوٹر نے جہاں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں آسانیاں پیدا کی ہیں، وہیں پریس کے نظام میں بھی بہتری اور معیاری تبدیلیاں سامنے آئی ہیں۔ گزشتہ برس مکتبہ نعیمیہ، مئوناتھ بھنجن نے فضا ابن فیضی کا کلیات شائع کیا ہے، جس کی ترتیب وتدوین کا کام محمد جابر زماں نے انجام دیا ہے۔ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر یہ کلیات بہترین کتابوں کی فہرست میں شامل کیے جانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ فضا کا یہ کلیات صرف غزلوں کے سرمایے پر مشتمل ہے، اور اس میں جن مجموعوں کو شامل کیا گیا ہے، ان کے نام ہیں: سفینۂ زرگل، دریچۂ سیم سمن، پسِ دیوارِ حرف اور سبزۂ معنیٔ بیگانہ۔ اس کے علاوہ بھی فضا صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے جو بعد کی جلدوں میں شامل ہوگا جو غالباً ترتیب کے مرحلے میں ہیں۔ کلیات کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تدوین کے بیش تر مبادیات اور اصولوں سے مرتّب بہ خوبی واقف ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ داخلی طور سے کتاب کے بہت سارے مقامات اس کی غمازی کرتے ہیں، تدوین کے دوران بعض بہت سخت اور الجھاو والے مقامات پر مرتّب نے دیدہ ریزی اور قوتِ فیصلہ کا ثبوت فراہم کیا ہے، اس لیے یہ تسلیم کیا ہی نہیں جاسکتا کہ مرتب تدوین کے جدید اصولوں سے واقف نہیں۔ اس کے باوجود کتاب میں بہت سارے ایسے مقامات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جہاں عجلت پسندی اور مجلسی اور پنچایتی طور سے کام کرنے کی روش نے اپنا رنگ دکھایا ہے، اور یہ سارا خلفشار پیدا کیا ہوا ہے ٹائپنگ اور پروف ریڈنگ کا، اس میں مرتّب کی کم احتیاطی کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ اتنی محنت سے کیے گئے کام کو تدوین کے اعلا معیار پر فروکش نہ ہونے دینے میں مرتّب کو بھی اپنی ذمے داری لینی ہوگی۔ اس تبصرے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ترتیبِ متن کے مباحث کے علاوہ باقی کلیات کی تدوین اور اشاعت میں مرتّب اپنی ذمے داریوں کو محسوس کریں اور ناروا عجلت پسندی کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں، جو آج کل ہماری زندگی کا جزوِ لاینفک ہے، کیوں کہ تدوین کو عجلت پسندی اور ہزار شیوگی راس نہیں آتی۔ تدوین میں املا اور روشِ کتابت کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ کلیات میں دوچار سے بھی زیادہ ایسے مقامات ہیں جہاں مرتّب نے املائی یک رنگی کے اصول کی پابندی کو اپنا شعار نہیں بنایا۔ یہ بات تسلیم کرنے کا جی نہیں چاہتا کہ مرتّب کو املا کے ان مبادیات کا علم نہیں ہوگا، کیوں کہ بہت سارے مقامات پر انھوں نے اس کی پابندی اور رعایت کو لازم قرار دیا ہے۔ میری نظر میں سارا مسئلہ یہ ہے کہ اصل متن اور اشاعت کے درمیان مرتّب کے علاوہ بعض دیگر افراد (مثلاً ٹائپسٹ اور پروف ریڈر) کو بھی اپنے ہنر اور کمالات دکھانے کا موقع مل جاتا ہے، ان کا قلم اور ذہن بھی درمیان میں حائل ہوجاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو شاید املائی نیرنگی اور ہزار شیوگی کی یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔ اسی طرح اعراب نگاری اور توقیف نگاری کا اہتمام تو کیا گیا ہے لیکن بعض مقامات پر نظر چوک گئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں نظر رکتی ہے۔ اس کے اسباب مختلف ہیں، کہیں پروف کی غلطی ہے، کہیں وزنِ شعر مجروح ہوا ہے، کہیں کچھ حروف اور لفظ چھوٹ گئے ہیں، [ص: 163، 236، 299، 323، 348، 675، 677، 815] کلیات میں مزید ایک تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ پہلی بار جب یہ مجموعے شائع ہوئے تھے تو جہاں تک میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے، ان میں مختلف اربابِ قلم کی تقریظیں اور کلمات شامل تھے، مرتّب نے اُن کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی انھیں کتاب میں شائع کیا۔ اس سلسلے میں مناسب بات یہ ہوتی کہ مرتّب ایک ضمیمے کے طور پر ہی سہی، ان تحریروں کو شاملِ اشاعت کردیتے یا اپنی صواب دید کے مطابق اس کی کوئی اور صورت نکالتے کہ وہ تحریریں بھی فضا کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت قارئین کی رہنمائی کرسکتیں۔ ان تمام معمولی فروگذاشتوں کے باوجود فضا صاحب کے کلیات کا یہ

پہلا حصہ اپنی اہمیت اور افادیت میں مسلّم ہے۔ 'خود نوشت' کے عنوان سے فضا صاحب کے حالات و کوائف کے تعلق سے مختلف تحریروں کو مرتّب نے جس طرز سے سجایا ہے، وہ حسنِ انتخاب اور حسنِ ترتیب کا بہترین اور مثالی نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ فضا کی غزلوں کے متن کا موازنہ مختلف مجلّات اور میگزینوں سے حاصل کر کے صحیح متن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ ایک صبر آزما اور تھکا دینے والا کام ہوتا ہے، لیکن مرتّب نے دیدہ ریزی اور جاں فشانی سے اس کام کو انجام تک پہنچایا ہے۔ موجودہ دور میں کتابوں کی افادیت میں اشاریہ سازی اور دیگر متعلقات اہم کردار ادا کرتے ہیں، اس ذمے داری کو بھی مرتّب نے کمالِ ہوشیاری سے نبھایا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر یہ کتاب آپ کے بک شیلف میں ہے تو لوگ آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیے بنا نہیں رہ سکیں گے۔

آج کی کہانیاں

ترتیب و انتخاب: گوپی چند نارنگ
صفحات: 689، قیمت: 320 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
مبصر: وسیم بیگم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ

زیرِ تبصرہ کتاب 'آج کی کہانیاں' پروفیسر گوپی چند نارنگ کا انتخاب ہے۔ مرتب کا شمار عصری دور کے اعلیٰ پائے کے ادیب، محقق، نقاد، اور ماہر لسانیات میں ہوتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی کہانیوں کی ترتیب اور انتخاب کر کے انھوں نے تمام افسانہ نگاروں کو ایسی سمت دینے کی کوشش کی ہے جس پر چل کر وہ اپنے لیے نئی راہیں ہموار کر سکیں۔

اس کتاب میں کل باون کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے آغاز میں جو بھی بہترین کہانیاں سامنے آئیں ان کو اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ مرتب کی کہانی کے فن پر گہری نظر ہے۔ اسی لیے انھوں نے تمام کہانیوں کو بڑے سلیقے سے ترتیب بھی دیا اور اس سے زیادہ قرینے سے ان کا انتخاب بھی کیا۔ ان افسانہ نگاروں میں کسی بھی اچھے افسانہ نگار کو چھوڑا نہیں گیا ہے۔ سب کہانیاں اپنی جگہ اہم ہیں اور زندگی کے نشیب و فراز کو پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جیلانی بانو کا 'پرایا گھر' ایک اچھا افسانہ ہے اس میں کہانی کا ہیرو اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے اور گھر میں اس کو جو نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں اس سے ہر انسان کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔ ہر انسان آج کل پیسے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

''آج بھی اس نے آتے ہی مجھے حکم دیا۔

جلدی تیار ہو جایئے۔ آج 7 تاریخ ہے۔ پنشن لانے میرے ساتھ چلنا ہے... اس لیے اکثر 7 تاریخ کو مجھے لوگ اِدھر سے اُدھر گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ نمو کہتی ہے میں اس کا ہوں اس لیے وہ مجھے پنشن لانے اپنے ساتھ لے جائے گی۔ امتیاز (بیٹا) کہتا ہے مجھ پر صرف اسی کا حق ہے اس لیے اپنے ساتھ مجھے وہ لے کر جائے گا۔ (ص 179)

سلام بن رزاق کی کہانی 'انجام کار' بھی زندگی کی سچائی کو پیش کرتی ہے۔ اس میں مصنف نے نچلے طبقے کی عکاسی موثر انداز میں کی ہے، اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح یہ طبقہ جانور سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور جو غیر قانونی کام اس علاقے میں ہو رہے ہیں، پولیس خاموشی سے ان مجرموں کا ساتھ دے رہی ہے۔ اسی لیے ان گناہ گاروں کی ہمت اور طاقت اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ کوئی بھی جرم کرنے سے نہیں ڈرتے۔ کیونکہ پولیس کو وہ ہفتہ دیتے ہیں اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ پولیس خاموش تماشائی بنی رہے گی اور وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور یہ ہماری پولیس انتظامیہ کی ایسی سچائی ہے کہ اس سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔

ساجد رشید کا افسانہ 'راکھ' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے بزرگوں کو اپنے اپنے مذہب کے تئیں خاصا کٹر دکھایا ہے۔ لیکن دونوں فرقوں کی نوجوان نسل میں یہ خاصیت موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مذہب کی عزت کرتے ہیں، قدر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو روحانی تسکین پہنچانے کی خاطر اپنے جذبات و احساسات کا گلا گھونٹ دیتے ہیں یہ ایک ایسی مثبت سوچ ہے جس کی ہندوستان جیسے مختلف مذاہب کے حامل ملک کو بہت ضرورت ہے۔

دیباچے میں پروفیسر نارنگ نے افسانے سے متعلق چند اشارے کیے ہیں۔ ''یہ انتخاب آزادی کے بعد سے اب تک کے افسانوی سفر کو محیط ہے۔ اردو فکشن کی عمر داستانوں، حکایتوں کے بشمول شاعری کے مقابلے میں زیادہ نہیں، یہی کوئی دو سو، ڈھائی سو برس۔ اس میں افسانہ کی عمر اور بھی کم ہے یعنی فقط سو سوا سو برس۔ لیکن اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ جس طرح شاعری میں باوصف دوسری اصناف کے غزل کو مرکزیت حاصل ہے، اسی طرح نثر میں افسانہ ہماری سب سے توانا صنف ہے...''

تمام افسانہ نگاروں کی کہانیاں جو اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ سب اچھی اور معیاری کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔ کتاب کافی ضخیم ہے جس کی وجہ سے کتابت کی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ جو اس کتاب کے مرتب ہیں، مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی کاوشوں سے یہ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوئی۔ خاص طور پر ڈاکٹر شمس اقبال کی ذاتی دلچسپی بھی اس میں شامل رہی۔ تبھی افسانوں پر مبنی یہ کتاب منظرِ عام پر آ سکی۔

پین ڈرائیو

شاعر: احمد علوی
صفحات: 304، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2012
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز۔ نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی، صدر شعبۂ اردو اور فارسی، ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، ساگر، ایم پی

اردو میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی مستقل روایت سلسلہ در سلسلہ جعفر زٹلی، سودا، انشا، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، احمق پھپھوندوی اور حافظ ولایت اللہ حافظ سے آگے بڑھتے ہوئے دلاور فگار، شوکت تھانوی، ضمیر جعفری، رضا نقوی واہی، سلیمان خطیب، ساغر خیامی، ناظر خیامی اور احمد علوی وغیرہ تک پہنچتی ہے۔

احمد علوی کا شمار نئی نسل کے معروف و مقبول طنزیہ و مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے، ان کے اولین طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے مجموعے 'طمانچے' کے بعد یہ دوسرا ضخیم شعری انتخاب 'پین ڈرائیو' 2012 میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس کتاب کا نام 'پین ڈرائیو' کتاب میں شامل ان کی ایک مشہور نظم کے عنوان پر مبنی ہے، اس کی معنویت کے متعلق وہ خود رقم طراز ہیں:

''پین ڈرائیو میں ہی پہلے کتاب تیار ہوتی ہے بعد میں اسے کاغذ پر طبع کیا جاتا ہے۔ پین ڈرائیو کے مختلف معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ پین ڈرائیو کو اردو میں پین ڈرائیو ہی کہیں گے کیونکہ اس کا ترجمہ چلتا ہوا قلم تو نہیں ہو سکتا۔'' (اقبالیہ بیان، پین ڈرائیو، ص 8)

اس کتاب میں پہلے شعری مجموعے 'طمانچے' میں موجود کلام کے علاوہ کتاب کے آخری حصے میں بعنوان 'احمد علوی کا سنجیدہ رنگ'، 'سفر' سے کچھ غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

احمد علوی کی شاعری تقریباً پچیس سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ 'پین ڈرائیو'

میں احمد علوی کی شاعری کا ذخیرہ طویل و مختصر نظمیں، قطعات، تضمینات، ہزلیات اور پیروڈیوں پر مشتمل ہے۔ مختلف موضوعات کے تحت بعض ایسی نظمیں بھی اس میں موجود ہیں جو طنزیہ ومزاحیہ نہیں کہی جاسکتیں، یہ سنجیدہ بیانیہ نظمیں ہیں۔ مثلاً جگجیت سنگھ، قیمتی کتاب، ٹھاکرے اور جناح، درباری مسلمان، وردان وغیرہ۔ اسی نوعیت کی بعض مختصر نظمیں اور قطعات بھی ہیں۔

احمد علوی کو پیروڈی نگاری میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ اس کتاب میں مختلف فلمی نغموں اور غیر فلمی غزلوں اور نظموں کی پیروڈیاں شامل ہیں۔ ان کی بعض پیروڈیوں کا شمار اردو کی قابل ذکر پیروڈیوں میں کیا جاسکتا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت متعدد طنزیہ ومزاحیہ مختصر نظمیں اور قطعات اس شعری انتخاب کو زعفران زار بنا دیتے ہیں:

جسے سالے سسر اور سالیوں سے پیا رہوتا ہے
اسی شوہر کا اس دنیا میں بیڑا پار ہوتا ہے
کہا بیوی نے یہ مجھ سے مٹا دے اپنی ہستی کو
''کہ دانا خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے۔''

ہوس کے شہر میں ہم ہوکے شرمسار چلے
لحاظ وشرم کے سب پیرہن اتار چلے
جو چھوڑا چھوٹی نے ہم کو تو پکڑا موٹی نے
''جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے''

احمد علوی اردو کی طنزیہ مزاحیہ شاعری میں سماجی وسیاسی اور معاشرتی وتمدنی ناہمواریوں کو موضوع سخن بناتے ہیں اور طنز ومزاح کے شوخ پیرائے میں سب کچھ برملا کہہ دیتے ہیں۔

1 سیاست سے نہ رکھ امید کوئی — یہ بد عنوانیوں میں ایسی گم ہے
رکھو بارہ برس نلکی میں چاہے — نہ ہو سیدھی یہ وہ کتے کی دم ہے
2 ساٹھ سالوں سے یہی کھیل ہے دونوں جانب — دونوں جانب یہی کھجلی ہے کھجاتے رہیے
ہنداور پاک کے رشتوں کی حقیقت ہے یہی — دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے
3 خدمت خلق خدا سے پیٹ بھرتا ہی نہیں — آپ بھی اس مسئلے پر غور فرمائیں گے کیا
خوامخواہ اخبار والے کرتے ہیں بدنام انھیں — منتری رشوت نہیں لیں گے تو پھر کھائیں گے کیا

اردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں انگریزی الفاظ کے بکثرت استعمال کی ابتدا اکبر الہ آبادی سے ہوئی۔ احمد علوی کی شاعری میں بھی انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ ان کی شاعری اور اسلوب شاعری پر ایک حد تک اکبرالہ آبادی کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً:

بیوی سے کہیں بہتر ٹی وی ہے دوستو — دو دومنٹ میں لیتی ہے اک مہ جبیں بریک
بیوی کی ہے زبان سپر فاسٹ ایکسپریس — بیوی کی گفتگو میں تو آتا نہیں بریک

نظرت ظہیر نے ان کی شاعری کے متعلق بالکل صحیح رائے قائم کی ہے کہ:

''... بے ساختگی WIT ان کے یہاں خوب ہے، جو دلاور فگار جیسے شعرا کا طرۂ امتیاز تھی''۔ (WIT کا شاعر احمد علوی، پین ڈرائیو، ص 9)

احمد علوی کی شاعری میں طنز ومزاح کی یہی بے ساختگی اور برجستگی قاری وسامع کو اس طرح گدگداتی ہے کہ بے ساختہ ہنسی پھوٹ پڑتی ہے۔ اپنی متنوع خصوصیات کے پیش نظر یہ کتاب اردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے مجموعوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور عوام وخواص میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی یقینی ہے۔

بر محل اشعار اور ان کے ماخذ (جلد اوّل)

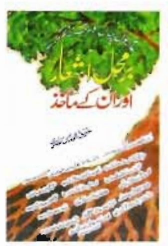

محقق ومؤلف: خلیق الزماں نصرت
صفحات: 399، قیمت: 300 روپیہ سنہ اشاعت: فروری 2012
ناشر: رضوی کتاب گھر، 425۔ اردو مارکیٹ، جامع مسجد، دہلی 6
مبصر: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، شعبۂ اردو
ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ

خلیق الزماں نصرت اردو دنیا میں ایک افسانہ نگار، شاعر، تذکرہ نویس، نقاد اور محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ کامرس اور بینک کی ملازمت سے وابستگی کے باوجود ذوق ادب سے معمور ہو کر اپنی تخلیقی اور تحقیقی وتنقیدی جودت کا چراغ جلائے رکھا اور اپنی متعدد علمی و ادبی کاوشوں ('آخری گھڑے کا پانی' شعرائے بھیونڈی'، 'شعوری رجحانات'، 'مشہور اشعار/ گمنام شاعر' وغیرہ) سے اردو ادب کو متوّر کیا۔

اردو کے ایسے ہزاروں آوارہ گرد اشعار کے خالقین کی تلاش وجستجو ہوتی رہی ہے۔ قاضی عبدالودود، عطا کاکوی، مالک رام، خلیق الزماں نصرت اور دوسرے کئی لوگ اس مہم میں سرگرداں رہے ہیں۔ ان لوگوں نے، ان آوارہ گرد اشعار کے اصل خالقین، جن کی تخلیقات خلط ملط ہو کر دوسروں کے نام سے منسوب ہوگئی تھیں، کا بڑی عرق ریزی سے پتہ لگایا اور اپنی تحقیقات سے حقیقی شاعروں کے نام اور ماخذات کو آشکار کیا۔ خلیق الزماں نصرت نے اس سلسلے میں وسیع کینوس پر تحقیقی کام کیا ہے اور ہزاروں ایسے اشعار جو آج ہمارے ادب و معاشرے کا حصّہ بن گئے ہیں، کے گم شدہ خالقین کی تلاش وجستجو میں مختلف کتابوں، قلمی نسخوں، دواوین اور کلیات کو کھنگال کر انھیں ڈھونڈھ نکالنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے۔ زیر نظر کتاب اس کی بین مثال ہے۔

'بر محل اشعار اور ان کے ماخذ' 12 ابواب اور 399 صفحات پر محیط ہے۔ باب اوّل طویل اور وقیع ہے۔ یہ باب 166 شعرا کے تعارف، ان کے 1325 بر محل اشعار اور 185 صفحات پر مشتمل ہے جس میں ولی دکنی سے لے کر منظوم ندیم بالا پوری تک کے کلام درج ہیں۔ اسے کتاب کا سب سے اہم حصّہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ زیر نظر کتاب نصرت کی برسوں کی ریاضت کا ثمرہ ہے۔ آوارہ گرد اشعار کے گم شدہ خالقین کی تلاش وتحقیق اور ان کی بابت معلومات و ماخذات کی فراہمی میں انھیں کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایک بے حد مشہور شعر ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اس شعر کے متعلق خلیق الزماں نصرت کا بیان ہے کہ:

''بچپن سے پڑھتے اور سنتے آرہے ہیں کہ یہ شعر رام پرساد بسمل کا ہے... حکومت ہند نے آثار قدیمہ میں بھی رام پرساد بسمل کے نام سے یہ شعر محفوظ کر دیا ہے۔ میں جب سن شعور کو پہنچا تو تنقید کی بڑی بڑی کتابوں میں بھی مذکورہ شعر رام پرساد بسمل کے نام سے منسوب پایا۔ تقریباً 20-15 سال قبل ایک مضمون پٹنہ کے رسالہ 'زبان وادب' میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مضمون نگار نے اس شعر کو بسمل عظیم آبادی کے نام سے منسوب کیا تھا۔ میں 2006 میں اپنی تحقیق 'اردو کے برمحل مصرعے/اشعار کے ماخذ' کے لیے خدا بخش لائبریری گیا تو اس شعر کی تصدیق کے لیے میں نے بسمل عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام 'حکایت ہستی' اکاؤنٹ نمبر 17931 دیکھا۔ اس مجموعے کو بہار اردو اکیڈمی نے 1982 میں شائع کیا تھا، جس کی پہلی غزل ہی 'سرفروشی کی تمنا' ہے۔ اس شعر پر شاد عظیم آبادی نے اصلاح دی ہے۔

باب دوم بعنوان 'حقیقت حال' میں مصنف نے محنت، جستجو، لگن اور ناقدانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے اپنی تحقیق کو مزید وسعت دی ہے اور بعض برمحل اشعار کی تخلیق کی تاریخ پیش کر کے ارباب ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے۔

در باب 'تعارف' دل آویز شعر کی اہمیت و افادیت اور اس کے برمحل استعمال کی قدر و قیمت کو مؤثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور اس امر کا اظہار بھی ہے کہ یہ کن کن مواقع پر کس کس انداز میں بروئے کار لائے جاتے رہے ہیں۔ مصنف نے اپنے تجربات کو جس دلچسپ اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے، وہ یقیناً لائق تحسین ہے۔

اگلے ابواب میں 'انتساب شعر' اور 'قرات شعر' کی خامیوں سے بحث کرتے ہوئے اس راہ میں مروج کوتاہیوں کو نشان زد کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کی دیانتداری کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے بعض اشعار کے حوالے سے 'فرہنگ آصفیہ' کے مرتب کو بھی نہیں بخشا ہے اور ان سے ہوئی لغزشوں کا بے باکانہ اظہار کرتے ہوئے بعض اشعار کے اصل خالق کے نام کی نشاندہی کر دی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے وسیع مطالعے کی بنیاد پر ان مصرعوں، مصرعے کے ٹکڑوں کو بھی تفصیل سے پیش کیا ہے، جن کی مقبولیت کے پیش نظر قلمکاروں اور فن کاروں نے اپنی تصنیفات وتخلیقات کے عنوانات قائم کیے اور اپنے فلمی مکالموں میں برت کر ان کی اثر خیزی کو دوبالا کیا۔

اس کتاب میں ایک دلچسپ باب 'حقیقت منتظر' کے زیر عنوان ہے جس میں مصنف نے تقریباً دو سو ایسے اشعار یکجا کر دیے ہیں جو بہت مقبول و معروف تو ہیں لیکن ان کے خالقین کے متعلق آج تک کوئی معلومات نہیں حاصل ہو سکی ہیں۔ انھوں نے یہاں قارئین سے یہ گزارش بھی کی ہے کہ ''ان میں سے کسی شعر کے خالق کا نام آپ جانتے ہوں تو مجھے مطلع کریں، نوازش ہوگی''۔ اس سے ان کے ذوق وشوق اور بنیادی معلومات و ماخذ تک پہنچنے کی تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے۔

اشاریہ ردیف وار بہ حروف تہجی تیار کیا گیا ہے جس کے توسط سے قاری کم سے کم وقت میں اپنے مطلوبہ شعر تک پہنچ سکتا ہے۔ مصنف کا طرز تحریر عالمانہ مگر سہل، رواں اور دلکش ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ مثال کے طور پر صفحہ نمبر 336 پر رقم ہے کہ ''کہتا ہوں سچ کہ......'' شمشاد مظفرپوری کے انشائیوں کے مجموعے کا نام ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعۂ انشائیہ کے مصنف تمنا مظفرپوری ہیں جو ابھی حال ہی میں انتقال فرما گئے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک وقیع تحقیقی کتاب ہے، جس میں تحقیق کے تمام لوازمات کو بطریق احسن برتا گیا ہے لہٰذا امید واثق ہے کہ اہل علم و ارباب ذوق کے مابین اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

تشنگی

شاعرہ: مینوبخشی
صفحات 136، قیمت 200 روپے، قیمت: 2012
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی
مبصر: ڈاکٹر غافل انصاری اسلام باغ شیخ سرائے سیتاپور

مینوبخشی کا شعری مجموعہ اُردو میں ان کی پہلی شعری کاوش ہے جس میں انھوں نے واردات قلبیہ کے منظر عام پر لانے کے لیے 76 غزلیات، 24 قطعات اور 7 منظومات کے توسط سے اپنی تشنگی کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

بجھ نہ پائی مری روح کی تشنگی — جھوم کر غم کی بارش برستی رہی
تھا تصور میں تیرا ہی جلوہ مگر — رات بھر دید کو میں ترستی رہی

موصوفہ نے اپنی کتاب انتساب ملکۂ موسیقی محترمہ بیگم اختر کے نام کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ بیگم صاحبہ سے انھیں شاعری اور موسیقی کی تحریک ملی۔ بیگم اختر اور مینوبخشی دونوں ہی نے صنف غزل سے رابطہ اور رشتہ استوار کیا اس عقیدت کو شاعرہ نے تحریک سے منسوب کیا ہے۔ یہ کوئی قابل اعتراض بھی نہیں۔

مینوبخشی کی غزلیں حسن وعشق سے مربوط اور مشروط ہیں موضوعات کی تنگ دامانی میں سمیٹے رکھنے کے باوجود انھوں نے سب کہہ ڈالا جیسا کچھ اوروں سے نہ بن پڑا۔ مجموعہ کلام میں شامل الفاظ اور ان کے لوکوکیٹس میں حسن وعشق، غم الم، محبت نور، گل روشنی، وصال، جلوہ سنگ، درد رہنما، بہار، شاداب، دوست، پیار، جمال، مہک، صنم، تڑپ اور اسلامیاتی اصطلاحوں سے ماخوذ نماز، ادا، قضا، تفسیر، عقبیٰ، تقدیر، گناہ، حرم، رب حضور، سجدہ دعا، وذکر خدا اور کرامت جیسے صدہا الفاظ سے غزل کا دامن مالا مال ہے۔ ان پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ مینوبخشی کی غزلیہ شاعری نشاط انگیز ہے طربیہ ہے، المیہ نہیں ہے یاسیات سے غزل کو بچا کر رکھا گیا ہے۔ جہاں کہیں حزن و یاس سے وہ روبرو ہوئی بھی تو بس ہوا کے جھونکے کی طرح، اِدھر آیا، اُدھر گیا۔

غزل کے لب و لہجے میں شاعرہ نے اپنی شناخت کچھ اس طرح پیش کی ہے:

ہے عشق نام میرا دل ہے مقام میرا
اس کے سوا جہاں میں میرا پتہ نہیں ہے
میں کھلی سی اک کتاب ہوں مجھے جو بھی چاہے پڑھا کرے
کوئی رمز ہوں کوئی بھید ہوں تو کوئی راز کی بات ہوں

الفاظ کی طرح فقروں کی سطح پر بھی شاعرہ نے ندرت کا مظاہرہ کیا ہے۔

چراغ درد، پلکوں کی منڈیر، شکن بے بسی، معصوم سوال مجبور جواب، عظمت دیوانگی، حسن حیات، سنگم دشام جیسے درجنوں فقرے بساط غزل میں پروئے ہوئے ہیں جن سے معنوی سطح پر بلاغت جھلکتی ہے۔ بخشی جی کے مستعمل فقرے بے ادائی کے مزے کا شعر میں استعمال دیکھیے:

تمھاری بے ادائی کے مزے آنے لگے مجھ کو
جو میرے دشمن جاں تھے وہ سمجھانے لگے مجھ کو

ابھی تک شعرا اپنے کلام میں 'بے وفائی' باندھتے آئے ہیں۔ مینوبخشی نے اپنے تصرف سے اسے بے ادائی میں تبدیل کر دیا۔

بخشی کے کلام میں معتبر ومستند شعرائے غزل کی چھاپ ان کے شعروں میں صاف نظر آتی ہے۔ میر تقی میر کے رنگ میں:

اے ہوا شور نہ کر تو ذرا آہستہ چل — کتنی مشکل سے اسے نیند ابھی آئی

غالب کے رنگ میں:

ہے کینوس بھی روبرو اور موقلم بھی ہے — جنبش بھی تیرے ہاتھ میں آنکھوں میں دم بھی ہے

ظفر کا رنگ دیکھیے:

دو دن کی زندگی جو میرے نام ہوگئی — اے عشق وہ بھی موردِ الزام ہوگئی
چار ہی دن ہیں زندگی کے مگر — خواب کیا کیا ہمیں دکھاتے ہیں

مینوبخشی کے کلام میں مشاہیر شعرائے غزل سے استفادہ کے ثبوت جمع کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح عقائد میں کبھی وہ موحد کی حیثیت سے اپنی شناخت بناتی ہیں۔ کبھی ویدانتی بن کر سامنے آتی ہیں، کبھی خود کو تقدیر کے حوالے کر دیتی ہیں، کبھی ساجن میں خدا کا تصور پیش کر کے وہ صوفیت کی نمائندگی کرنے لگتی ہیں۔ غزل کے اسلوب نے انھیں

زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ کررکھا ہے۔

ندرتِ تلمیح میں مینوبخشی نے عالمی شہرت یافتہ مصور مقبول فدا حسن کو شعر کے قالب میں ڈھال کر جس انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔

مینوبخشی کے کلام میں مادرِ علمی جے این یو کا سیکولر کردار بھی منعکس نظر آتا ہے۔ جہاں اتحاد ہے محبت ہے یگانگت ہے حدود کے اندر رہتے ہوئے مذہبی امور وارکان کی ادائیگی کی پوری آزادی ہے۔

حق گوئی وبے باکی

مصنف: رؤف خیر

صفحات: 184: قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سلمان عبدالصمد

N106، فرسٹ فلو، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگرنئی دہلی 25

'حق گوئی وبے باکی' دکنی افق کو شاعری کے قوس وقزح سے سجانے والے خوش فکر بلکہ 'استاذ' شاعر ونقاد رؤف خیر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں یوں تو کل 30 مضامین ہیں، ابتدائی دو مضامین میں سے ایک کو پیش لفظ کہا جاسکتا ہے، جسے 'حرف خیر' کے نام سے موسوم کرتے ہوئے صاحب کتاب نے خود لکھا اور دوسرا ''سرچشمۂ دانش وسخن: رؤف خیر'' ہے، جس میں خالد یوسف (جو آکسفورڈ میں مقیم تھے، ان کی سانس کی ڈور 9 اکتوبر 2009 کو ٹوٹ گئی) نے رؤف خیر کے افکار وخیالات اور شعری وتنقیدی نظریات سے بحث کی ہے، یہ ایک مقدمہ کی طرح ہے۔

ہیئت شعر اور اصناف سخن سے متعلق رؤف خیر کے کئی چونکا دینے والے تجربات بھی ہیں، یک مصرعی نظموں کے تو وہ موجد ہیں، زیر نظر کتاب کے علاوہ ان کی دیگر نو کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہیں، جن پر وہ قارئین اور ارباب ذوق وفن سے داد وتحسین کے گلدستے حاصل کرچکے ہیں۔ 'اقرا، ایلاف، شہداب اور سخنِ ملتوی' شعری مجموعے ہیں۔ 'قنطار، دکن کے رتن اور ارباب فن، حیدرآباد کی خانقاہیں' ترجمہ وتحقیق اور تذکرہ وکوائف کی کتابیں ہیں۔ 'خط خیر، بچشم خیر اور حق گوئی وبے باکی' تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

ان کے دیگر تنقیدی مجموعے سے قطع نظر پیش نظر مجموعے میں تنقید کے نام پر شامل ہونے والے بیشتر مضامین میں تنقید کے عناصر سرے سے ہیں ہی نہیں، یعنی یہ مجموعہ تنقیدی نہیں، بلکہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ مثلاً 'ضرورت رشتہ، ... بلی حج کو چلی، رؤف خیز وزیر اعظم کا مہمان، مزارِ بے مردہ، کند ہم جنس باہم جنس، استغفر اللہ، فدائے حسین: ایم ایف حسین اور مولانا ابوالکلام آزاد' وغیرہ ایسے مضامین ہیں، جنھیں تنقید کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا ہے، البتہ ان میں طنز ومزاح کا عنصر غالب ہے، حالات حاضرہ پر تبصرہ وتجزیہ ہے اور رودادِ سفر بھی۔

یہ مضامین اپنے موضوعات کے لحاظ سے انتہائی معلومات افزا ہیں، ان میں حالات کی بھرپور عکاسی ہے، ہم جنس پرستی کے متعلق جن امور کی نشان دہی کی گئی، وہ واقعی توجہ طلب ہیں، اسی طرح حج اور ضرورت رشتہ کے پیش منظر میں ہونے والی طنزیہ گفتگو بھی سماج سے ہم آہنگ ہے۔ رؤف خیر کی پوپ کہانیاں بھی انتہائی دلچسپ ہوتی ہیں، مگر جس انداز سے انھوں نے اپنی پوپ کہانیاں ایک دوسرے مضمون میں شامل کی ہیں، اس کا کوئی جواز نہیں۔

جن مضامین کو تنقیدی زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے، ان میں بھی مصنف نے تنقیدی پس منظر کے ساتھ دلچسپ گفتگو کی ہے، ساتھ ہی ساتھ زبان وبیان کے ان اصول وقواعد کی طرف بھی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے، جن پر اچھے لکھنے والے بھی غور وفکر نہیں کرتے ہیں، البتہ ان کے تنقیدی مضامین پڑھنے کے بعد وضاحت نہیں ہوپاتی ہے کہ وہ کس تنقیدی مکتبہ فکر کے علمبردار ہیں۔ ان کے مضامین میں مواد ہوتے ضرور ہیں، مگر وہ ایک ہی موضوع/ عنوان میں ضمناً بہت کچھ سمونے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے بعض اوقات اصل موضوع کی چمک ماند پڑنے لگتی ہے۔ ملاوجہی نے جس طرح 'سب رس' میں بہت کچھ انڈیلنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح رؤف خیر بھی ایک ہی مضمون میں بہت کچھ جمع کرنے کی سعی کرتے ہیں، اسی بنیاد پر مضمون کی طوالت کھلنے لگتی ہے، مثلاً 'قرۃ العین حیدر اور پروین شاکر کے بیچ رنجش' یہ مضمون کوئی ساڑھے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، مگر اس کی تمہید کے لیے چار صفحات سیاہ کیے گئے۔

زبان وبیان یا لفظوں کے انتخاب کے تناظر میں اس کتاب نے بہت مایوس کیا ہے، یوں تو مصنف موصوف نے اپنے پہلے ہی مضمون 'اچھی نثر کی خصوصیات' میں شستہ، شگفتہ اور رواں نثر کی خصوصیات پر خامہ فرسائی کی ہے، یہاں تک کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے جملے کو نشان زد کرکے رواں بنانے کا طریقہ بتایا ہے، مگر ان کی کتاب میں بیشتر مقام پر زبان کی شگفتگی کا احساس تک نہیں ہوتا ہے، بعض مقامات پر تو لفظوں کے انتخاب میں ڈھلمل یقینی نظر آتی ہے۔ مثلاً 'قرۃ العین حیدر اور پروین شاکر کے بیچ رنجش' میں جو واقعہ پیش کیا گیا ہے، اس سے کہیں بھی رنجش کا احساس نہیں ہوتا ہے، اسی لیے لفظی اعتبار سے یہ عنوان درست نہیں ہے، اسے کچھ یوں ''....کے بیچ تکرار... یا...کی غلط فہمی'' ہونا چاہیے تھا۔

اسی طرح کئی جملے بھی محل نظر ہیں:

''...اس میں شک نہیں بعض شعر بھی فصاحت وبلاغت کے شاہکار ہوتے ہیں''۔ (صفحہ: 17)

''اردو ادب میں علامہ اقبال سے زیادہ پڑھا لکھا شاعر نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا، اس طرح قرۃ العین حیدر سے بڑی ادیبہ نہ ہوئی ہے نہ ہوگی۔'' (صفحہ: 27)

خلاصہ یہ ہے کہ پیش نظر مجموعے میں تنقیدی مضامین کم اور مختلف موضوعات پر زیادہ ہیں، البتہ بیشتر مضامین، جو تنقیدی نہیں ہیں، ان میں حالات حاضرہ پر بہترین تجزیہ اور طنز ہے، کسی نہ کسی پہلو سے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہے، صاحب کتاب کے اسلوب پر احساس برتری اور تعلی کا رنگ واضح نظر آتا ہے، جو کہ ایک تنقید نگار کے لیے مناسب نہیں، پروف کی غلطیاں خال خال ہیں، مگر ضخامت کے اعتبار سے اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

اردو نصاب اور مدارس
ایک مشاہداتی اور تجرباتی مطالعہ

مصنف: توقیر راہی

صفحات: 244، قیمت: 399 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: براؤن پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: وارث مظہری، B-63، تیسری منزل، شاہین، باغ، نئی دہلی

مدارس مسلمانوں کی دینی وتہذیبی تاریخ کا ایک اہم عنوان رہے ہیں۔ سرمایۂ دین کی حفاظت اور اس کی علمی میراث کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے میں ان مدارس نے گراں بہا کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں

ہیں، یہ مدارس ہی ہیں جنھوں نے اسلامی شناخت کو تحلیل نہیں ہونے دیا اور اسی کے ساتھ، کم ازکم بنیادی خواندگی کی حد تک، مسلم معاشرے میں تعلیم کے پھیلاؤ میں غیر معمولی حصہ نبھایا۔ ان مدارس کا ایک پہلو اردو زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ موضوع اہمیت اور دل چسپی کا حامل ہے کہ ان مدارس میں شامل اردو زبان وادب کے نصاب کی نوعیت وہیئت کیا ہے؟ وہ کس حد تک اپنے مقصد کو بروئے کار لانے میں معاون اور اس اعتبار سے اطمینان بخش ہیں؟ یہ پہلو اس لیے واضح ہونا ضروری ہے تاکہ مدارس کے اردو کے ساتھ ربط وتعلق کا صحیح خاکہ سامنے آسکے۔

ڈاکٹر توقیر راہی کی زیر تبصرہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مصنف نے مدارس سے تعلق رکھنے والے اس اہم پہلو کو اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بنا کر داد تحقیق دی ہے۔ کتاب کے کل چار ابواب ہیں: (1) ہندوستان میں مدارس کا تعلیمی نظام : عام خصوصیات (2) اردو نصاب اور ملحقہ وامدادی مدارس (3) اردو نصاب اور غیر ملحقہ مدارس (4) مدارس میں اردو طریقہ تدریس۔ ان کے علاوہ مقدمہ اور نتیجہ بحث ہے۔ پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ اسلامی تاریخ میں مدارس کے آغاز وارتقا اور ان کے کردار کو مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف کے بقول ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی ابتدا قطب الدین ایبک سے ہوتی ہے (حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ نظام تعلیم کی ابتدا سندھ میں محمد بن قاسم کے عہد سلطنت میں ہوئی۔ ہاں اس کا باضابطہ سلسلہ عہد سلطنت سے قائم ہوا جو بعد کے ادوار میں باقی رہا۔) مصنف نے عہد سلطنت سے دیوبند وندوہ کے قیام تک کی ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا عہد بہ عہد اختصار کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ دوسرے باب میں اصل موضوع کی تمہید کے طور پر نصاب کے مقاصد اور اصولی تصورات پر فاضلانہ گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں آزاد مدارس میں اردو کے نصاب پر گفتگو سے پہلے ہندوستان کے مختلف عہد میں مدارس کے نصاب کی ساخت اور ارتقا کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس تعلق سے خاص طور پر درس نظامی کے پس منظر اور اس کے خد وخال سے مختصر لیکن ضروری حد تک بحث کی گئی ہے ۔ باب چہارم میں مدارس میں اردو کے طریقہ تدریس کے ضمن میں تدریس کے اصول ونظریات بھی زیر بحث آئے ہیں۔

کتاب کا اصل جوہر میدانی مطالعات وتجربات پر مشتمل ہے۔ جو اس کے مرکزی موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ مصنف نے مختلف مکاتب فکر کے نمائندہ مدارس میں شامل اردو کے نصابات کے گہرے اور تحقیقی جائزے اور اردو زبان وادب کی تدریس کے عملی مشاہدے سے حاصل ہونے والے نتائج کو بے کم وکاست پیش کر دیا ہے۔ اپنے تنقیدی تجزیے میں انہوں نے اردو کی تدریس کے مختلف کمزور پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ: مدارس ملحقہ ہوں یا غیر ملحقہ سب میں عموماً روایتی یعنی کتاب مرکوز طریقہ تدریس جاری ہے۔ جب کہ آج کل طفل مرکوز کورس کی وکالت کی جاری ہے۔ (ص، 207) بیشتر مدارس میں گرامر سکھانے کے لیے ''امدادی سامان'' کا فقدان ہے ۔ نثر کی تدریس میں اساتذہ عموماً عبارت کا مفہوم خود ہی بیان کر دینے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ اعلا درجات میں یہ کام طلبہ سے لینا چاہیے تاکہ ان کی فہم وتفہیم کی صلاحیت پروان چڑھ سکے۔ (ص، 178) نظم کی تدریس میں شعر کے جمالیاتی پہلوؤں سے طلبہ کو لطف اندوز ہونے اور طلبہ کے اندر ادبی حسن شناسی کے جوہر کو نکھارنے پر مطلق زور نہیں دیا جاتا۔ (ص، 185) وغیرہ۔ مصنف نے اپنی تنقیدی آرا کے حق میں مضبوط دلائل اور مثالیں پیش کی ہیں۔

بہرحال یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد اور دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ قارئین کے سامنے اس کتاب کے مشمولات سے مدارس میں اردو کی صورت حال کا حقیقی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بعض جگہ کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ وابستہ وابسطہ (ص، 204) متہم مہتمم (ص 24) ؟؟ ہوگیا ہے۔ شعر میں رہ راست کو راہ راست لکھے جانے سے شعر بے وزن ہوگیا ہے (ص، 29) ص، 28 پر سرمد کے شعر کا دوسرا مصرعہ بالکل ہی غلط لکھا گیا ہے۔ اصل مصرعہ اس طرح ہے: دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم۔ تاہم مجموعی طور پر یہ کتاب قابل مطالعہ ہے اور اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے قیمتی مواد پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کا خاطر خواہ استقبال کیا جائے گا۔ کتاب طباعت و کتابت کے لحاظ سے دیدہ زیب اور معیاری ہے لیکن قیمت بہرحال زیادہ ہے۔ قارئین اردو کی جیب کے لیے اس کا متحمل ہونا آسان نہیں ہے۔

آواز کا پیرہن

شاعر: کندن سنگھ کندن اراولی

مرتب: ڈاکٹر لوک ویر، ایم ڈی (1) HCMS

صفحات: 200، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت:

ناشر: مکل پرکاشن 1485/7 گوڑگاؤں (ہریانہ)

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

کندن لال کندن کا تعلق ریاست ہریانہ کے موضع کھالینہ ضلع مہیندر گڑھ (ریواڑی) سے تھا۔ موصوف انگریزی، ہندی، اردو، سنسکرت اور فارسی زبانیں جاننے کے علاوہ علم عروض سے بھی باخبر تھے۔ محکمہ السنہ پنجاب کی جانب سے انھیں ان کے قلمی نسخہ 'گل ریز' پر پہلا انعام بھی ملا تھا۔ لیکن یہ مجموعہ ان کی زندگی میں زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکا۔

پیش نظر مجموعہ کلام میں کندن کا پورا کلام موجود ہے۔ جسے ان کے صاحب زادے ڈاکٹر لوک ویر نے منظر عام پر لانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہاں اردو شاعری کی چار اصناف سخن یعنی نظم، غزل، رباعی اور گیت پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ جن میں غزلوں کا حصہ کافی زیادہ ہے۔ اس کے بعد نظم اور رباعیاں ہیں۔ گیت کی تعداد صرف تین ہے اس کے علاوہ گیارہ نظموں کا ترجمہ 'کرل' کے نام سے شامل ہے۔

اس مجموعہ کلام میں شامل نظموں کا حصہ کتاب کے آغاز میں ہے۔ جہاں 'تعارف' کے عنوان سے شامل نظم میں شاعر نے تعلی کے اشعار شامل کیے ہیں۔

اگر ہیں گردش ایام سے شام و سحر پیدا
تو یہ بھی ہے کہ ہوتا ہے کوئی شوریدہ سر پیدا
میں خود کو جاننے کے بعد انا الحق جب بھی کہتا ہوں
برابر کا خدا بن کر خدا کے پاس رہتا ہوں

اپنے ملک وقوم سے ہمدردی کا جذبہ رکھنا ایک مستحسن قدم ہے۔ شاعر تمام شہیدان آزادی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے:

رنگ آخر لے ہی آیا خونِ ارباب وفا
ہے یہ آزادی فقط مرہونِ ارباب وفا
تم شہیدوں کو نہ بیگانہ سمجھ لینا کبھی
اک حقیقت کو نہ افسانہ سمجھ لینا کبھی

وادیِ کشمیر کی سیاحت سے واپسی کے بعد شاعر اپنی دلی کیفیت یوں بیان کرتا ہے:

میں اور اس کے سوا جان من کہوں بھی کیا
کہ بدنصیب ہوں، منزل سے جارہا ہوں میں

صبر ورضا کی تلقین بھی ایک سنجیدہ انسان کا شیوہ ہے لیکن جب شاعر بے گناہ اور حق گو افراد کو صلیب و دار پر چڑھنے کا مشاہدہ کرتا ہے تو یہ لکھنے پر مجبور ہے:

یہ دنیائے ستم قائم سہی، دائم نہیں ہوگی
مگر اپنے کیے پر یہ کبھی نادم نہیں ہوگی
یہ انسانوں کی بستی ہے مگر سکہ ہے شیطاں کا
ذرا سا بھی نہیں ہے جس کے دل میں درد انساں کا

شاعر کی گرفت صنف غزل پر کافی ہے جس میں عصر حاضر کی ترجمانی بخوبی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو چند اشعار:

ہر بشر ہاتھ میں پتھر ہی لیے ملتا ہے	تیری الفت کا جنوں اتنا ہمہ گیر ہے کیا
سموچے شہر کی نیندیں اُڑا گئی افواہ	اندھیری رات میں سورج نکلنے والا تھا
سننے والا ہو جہاں کوئی، وہاں روتے ہیں	فائدہ خاک نہیں دشت میں چلانے کا
اسے رکھا ہے کٹھ پتلی بنا کر	یہ کیسے دور میں افسر بنا ہے

مجموعے میں شامل رباعیوں کی تعداد 24 ہے یہ زیادہ تر ہندی الفاظ وخیالات پر مبنی ہے:

آکاش کو دھرتی سے ملا دیتی ہے	بیکنٹھ کی بنیاد ہلا دیتی ہے
اپنی سی پہ آتی ہے تو یہ ساوتری	مرجائے جو پریتم تو جلا دیتی ہے

کندن کے کلام میں عصر حاضر کی ترجمانی بخوبی کی گئی ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو یہاں علاقائیت اور ہندی الفاظ کا استعمال متعدد بار کیا گیا ہے۔ غرض کہ شعر وادب سے لگاؤ رکھنے والے کے لیے یہ ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔

نیا دور (مجاز نمبر)

ایڈیٹر: وضاحت حسین رضوی
جلد: 67، شمارہ: 706، ستمبر اکتوبر 2012
صفحات: 292، قیمت: 50 روپے
ناشر: انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اتر پردیش لکھنؤ
مبصر: عبدالحی

نیا دور سرکاری رسالہ ہوتے ہوئے بھی سرکاری قید وبند سے آزاد رہا ہے اور اس نے آغاز سے ہی اپنا معیار برقرار رکھا ہے۔ اس رسالے میں شروع سے ہی ادبی ذوق وشوق سے متعلق مضامین، شعری تخلیقات اور متفرق موضوعات پر مبنی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایک علمی اور ادبی رسالے کے لیے یہ سب سے اہم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آغاز سے ہی اپنا الگ مقام بنائے اور ادبی معرکوں اور غیرضروری بحثوں سے اجتناب کرتے ہوئے ادب کی سچی خدمت کرے۔

آزادی کے بعد ادبی صحافت میں رسالہ نیا دور کا اپنا مقام رہا ہے۔ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کے ذریعے نیا دور کی ادارتی ذمے داریاں قبول کرنے کے بعد نیا دور نے اور زیادہ ترقی کی۔ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی خود بھی خالصتاً ادب کے طالب علم ہیں اور انھوں نے تحقیق وتنقید میں بھی اپنا منفرد مقام بنایا ہے اور ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ انھوں نے نیا دور کو ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک دستاویز کی شکل دے دی ہے اور اردو کی سچی خدمت کا بیڑہ اٹھاتے ہوئے، مولانا محمد علی جوہر نمبر، علی جواد زیدی نمبر، ڈائمنڈ جوبلی نمبر، انقلاب 1857 نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، شکیل بدایونی نمبر، میر تقی میر نمبر، عرفان صدیقی نمبر، صحافت نمبر، منٹو نمبر، ایسے اہم اور تاریخ ساز نمبر شائع کیے جو ان کی ادارتی کارگزاریوں کا ثبوت ہیں۔ موجودہ شمارہ مجاز نمبر بھی ایک بے حد اہم نمبر ہے۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے جیسا کہ شمارے میں اعلان شائع ہوا ہے، اب وضاحت حسین رضوی خمار بارہ بنکوی نمبر کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔

نیا دور کا موجودہ اسرار الحق مجاز نمبر بھی نیا دور کی ادبی روایات کا پاسدار ہے جو مجاز کے صد سالہ یوم پیدائش پر شائع کیا گیا ہے۔ موٹے گلوسی پیپر پر شائع ہوا 296 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ اپنے صوری ومعنوی حسن سے قاری کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ مجاز نمبر آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ شاعری شخصیت اور یادیں، ہم پر ہے ختم شام غریباں لکھنؤ، فکر ونظر اور فن، نظموں کے آئینے میں، مجاز فہمی اور ترقی پسندی، غزلوں کے آئینے میں، کچھ زاویے اور انتخاب کلام کے حصوں پر مشتمل یہ رسالہ مجاز کی شاعری، فن اور شخصیت کو سمجھنے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔ رسالے کا خصوصی شمارہ ترتیب دینا کتنا جوکھم اور محنت طلب کام ہے یہ ایک رسالے کا مدیر ہی سمجھ سکتا ہے۔ قلمکاروں، ادیبوں کو کئی کئی دفعہ مضامین کے لیے درخواست کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر مضمون حاصل ہوتا ہے۔ شمارے میں وارث کرمانی، عابد سہیل، وارث علوی، عتیق اللہ، علی احمد فاطمی، ڈاکٹر اعجاز حسین، قاضی عبد الستار، حسن عباس فطرت، اقبال مجید، زبیر رضوی، شارب ردولوی، قاضی افضال حسین جیسے اہم ناقدین، محققین اور ادبا کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ مدیر نے رسالے کو مجاز کی شاعری اور فن پر مکمل انسائیکلوپیڈیا کی شکل دے دی ہے۔ جہاں رسالے میں انتخاب کلام ہے وہیں مجاز ایک نظر میں کے عنوان سے مجاز کا سوانحی خاکہ بھی شامل ہے۔ ایک بات یہاں قابل ذکر ہے کہ وضاحت حسین رضوی نے اداریہ اپنی بات میں مجاز کی ولادت 1912 لکھی ہے جبکہ سوانحی خاکے میں تاریخ ولادت 19 اکتوبر 1911 ہے جو صحیح ہے۔ اداریے میں شاید ٹائپنگ کی غلطی سے 1912 ہوگیا ہو۔ مجاز کے عکس تحریر اور ان کی کچھ یادگار تصاویر نے رسالے کی خوبصورتی میں بیش بہا اضافہ کردیا ہے۔

مجاز کی شاعری پر مدیر اپنی بات میں لکھتے ہیں:

''مجاز کی شاعری اس اعتبار سے تاریخ ساز ہے کہ اس وقت فضا میں جو گرم نعرے گونج رہے تھے ان نعروں کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ کچھ بدلنے کی خواہش آزادی کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کی تمنا اور تڑپ ان کی شاعری میں ملتی ہے اور کچھ ہوتا نہ ہوتا ان کا علی گڑھ کا ترانہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ بہر حال ہندوستان کی تعلیمی فضا میں '' یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا''۔

یوں تو شمارے میں سبھی مضامین اہم ہیں لیکن حقانی القاسمی کا مضمون شراب شبستاں اور شاعر مجاز، بیگ احساس کا مضمون آہنگ کی مابعد جدیدیت قرأت، عتیق اللہ کا مضمون برافروختہ نسل کا نمائندہ مجاز، صالحہ زریں کا مضمون مجاز کی نظموں میں تانیثی حسیت، مہ ناز فاطمہ کا مجاز کی شاعری میں ظرافت وغیرہ مضمون کافی اہمیت کے حامل ہیں اور مجاز کی شاعری اور شخصیت پر نئے زاویے سے روشنی ڈالتے ہیں۔ ''مجاز مشاہیر ادیب کی نگاہ میں'' کے عنوان سے بھی ایک مضمون شامل ہے جس میں فیض، جاں نثار اختر، عصمت، جوش، جگر، کرشن چندر، فراق، سید احتشام حسین، آل احمد سرور وغیرہ کے مجاز کی شاعری اور فن پر مختصر تبصرے شامل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ رسالہ مجاز شناسی کی ایک کامیاب کوشش ہے اور ادارہ نیا دور قابل مبارکباد ہے جو ایک کے بعد ایک یادگار خصوصی نمبرات شائع کرتا آرہا ہے۔

■

”ایسے کسی پرچار کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو مذہبوں سے نفرت پیدا کرتا ہو“

(ینگ انڈیا 29.5.1924، صفحہ 180)

مہاتما گاندھی

(2 اکتوبر 1869 - 30 جنوری 1948)

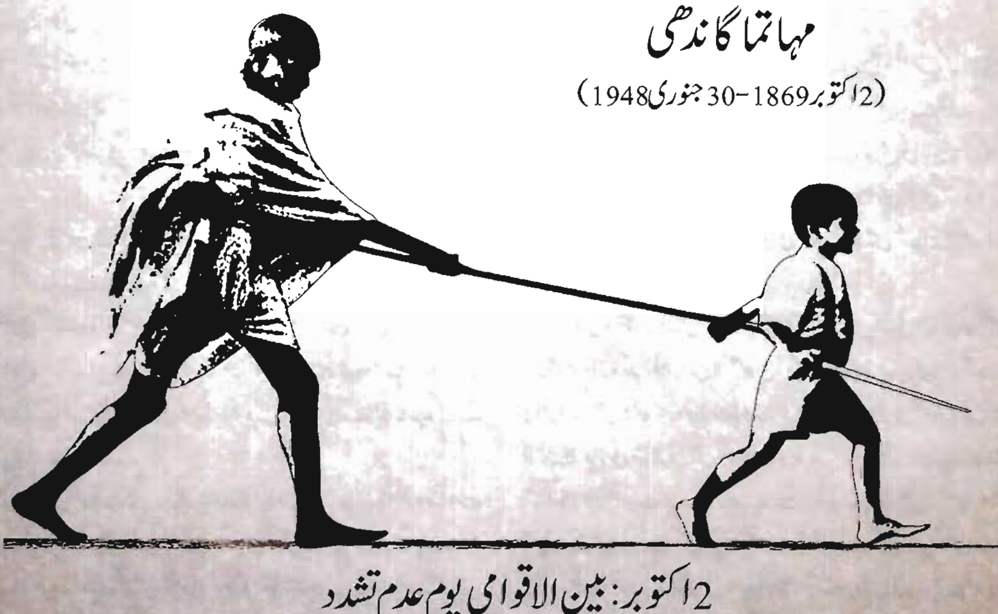

2 اکتوبر: بین الاقوامی یوم عدم تشدد

وزارت اطلاعات ونشریات

حکومت ہند

DAVP 22202/13/0062/1314

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

کیرالا میں اردو کتابوں کی چلتی پھرتی نمائش

کالی کٹ: پہلی بار سرزمین کیرالا میں فروغ اردو کے تئیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت پانچ روزہ ریاست گیر سطح پر موبائل وین اردو کتب میلے کا

انعقاد عمل میں آیا۔ اردو کتب نمائش کی آمد پر محبان اردو جامعہ مرکز کی آواز پر سیلاب کی طرح امنڈ پڑے۔ کتاب میلہ کولنڈی، دارالہدی چماڈ، شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی شعبہ اردو، مالا پورم گورنمنٹ کالج کے بعد کالی کٹ کے مرکز کارنتھور ہائر سکنڈری اسکول آیا۔ جامعہ مرکز کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اس اقدام کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ کارنتھور مرکز ہائر سکنڈری اسکول میں اردو کتب نمائش میلہ کا افتتاح مقامی ایم ایل اے پی ٹی اے رحیم نے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ اردو زبان کے فروغ میں ریاست کیرالا میں جامعہ مرکز نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کاوش کا ثمرہ ڈاکٹر عبدالحکیم ازہری اور شیخ الجامعہ ہیں جنھوں نے ریاستی سطح پر دینی مدارس ومکاتب، اسکولز کالجز میں شامل نصاب کرایا۔ اس موقعے پر کیرالا اردو پرچار سمیتی کے صدر کے ٹی عبدالرشید بحیثیت صدر موجود تھے۔ قابل ذکر اسما مرکز ہائر سکنڈری اسکول ہیڈ ماسٹر وی پی عبدالقادر، کیرالا اردو ٹیچر ایسوسی ایشن خزانچی ایم کن محی الدین کٹی، کے یوٹی اے کالی کٹ ضلع صدر پی کے صدر ماسٹر پی کے سی محمد، سابق ایجوکیشن آفیسر اے علی، سی اے بجو، رشید پونشیری، شمیر ثقافی (مرکز ریسپشن منیجر) عبیداللہ ثقافی، انجینئر یوسف ہیں۔ اس موقعے پر این سی پی یو ایل کو آرڈینیٹر صدیق کے ہاتھوں طلباؤں میں کتب تقسیم کی گئیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 ستمبر 2013

امریکہ کے 9 شہروں میں مشاعروں کا انعقاد

پیٹس برگ (پریس ریلیز) علی گڑھ المنائی یو ایس اے کے ڈاکٹر عبداللہ اور اردو مرکز کی بانی نیر جہاں کی کوششوں سے امریکہ کے 9 شہروں میں 13 ستمبر سے 5 اکتوبر 2013 تک مشاعروں کا انعقاد کیا گیا، جس میں ہندوستان کے ممتاز شاعر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئر مین پروفیسر وسیم بریلوی اور پاکستان کے معروف شاعر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی، شاعرہ ڈاکٹر نکہت افتخار اور شاعر زاہد فخری کے علاوہ شمالی امریکہ کے مشاہیر شعرا میں ڈاکٹر صبیحہ صبا، فرحت شہزاد، ڈاکٹر عبداللہ، مجید اختر، ظفر عباس، دنیش جوشی، گلاب کھنڈیلوال، رخشندہ نوید وغیرہ نے شرکت کی۔ ان مشاعروں میں غزلوں اور گیتوں کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ چھ مشاعروں کی صدارت پروفیسر وسیم بریلوی

(دائیں سے) ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈاکٹر عبداللہ

نے اور تین مشاعروں کی صدارت ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے کی۔ برمنگھم، اٹلانٹا، جیکسن ول، سالٹ الیک سٹی، لاس اینجلس، کلیولئیڈ، واشنگٹن، پیٹس برگ اور نیو یارک کے یہ مشاعرے سامعین کی کثیر تعداد میں شمولیت، معیاری کلام کی والہانہ پذیرائی اور اعلیٰ ادبی قدروں کی پاسداری کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ پروفیسر وسیم بریلوی اور پیرزادہ قاسم نے اپنی خوبصورت شاعری سے ذہن ودل کو منور کیا۔ پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ بین الاقوامی سطح پر اردو کی ترویج واشاعت میں مشاعروں کا اہم کردار اردو کی کوئی عصری تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔ مشاعرے ہماری مشترکہ تہذیب کی وسعت اور گہرائی کا پتہ دیتے ہیں۔ پیرزادہ قاسم نے کہا کہ یہ مشاعرے اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں کہ ان مشاعروں کے ذریعے ہندوستان اور پاکستان کے تہذیبی اور ثقافتی رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ نیو یارک کے سرسید ڈے عالمی مشاعرے میں مشہور فلمی نغمہ نگار گلزار کو ان کی اعلیٰ ادبی وثقافتی خدمات کے اعتراف میں ہندوستان کی ڈپٹی کونسل جنرل ڈاکٹر دویانی کے ہاتھوں گلزار کی عدم موجودگی میں دیا گیا۔ معروف فلمی ہستی فاروق شیخ نے اس موقعے پر اپنے فکر انگیز کلیدی خطبے سے لوگوں کو متاثر کیا۔ ان مشاعروں سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے ہندوستان میں غریب اور نادار بچوں کی تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اکتوبر 2013 سے ماخوذ

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

کمپیوٹر کورس کے طلبا کی تعداد میں اضافہ

نئی دهلی: ایک ایسے وقت میں جب ہندوستان کی علاقائی زبانوں کو انگریزی زبان نے سمٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اردو زبان کو جدید ٹکنالوجی سے زندگی نو اور توانائی مل رہی ہے۔ نوجوان نسل نہ صرف اردو زبان سیکھ رہی ہے بلکہ مستقبل کے خواب بھی بن رہی ہے۔ جی ہاں اگر اوکھلا کے الامین انسٹی ٹیوٹ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف ہو کر سامنے آجائے گی۔ قومی اردو کونسل کے ذریعے

چلائے جانے والے کمپیوٹر ڈپلوما کورس کے موجودہ جولائی بیچ میں 40 کے بجائے 110 طلبا و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ آج فرسٹ موڈیول کے امتحان میں ان میں سے 98 طلبا و طالبات نے شرکت کی جس سے صاف ہے کہ قومی اردو کونسل کا جدید ٹکنالوجی سے ہمکنار کرنے والا کورس نہ صرف مقبولیت کی منازل طے کر رہا ہے بلکہ نوجوان نسل کو اردو زبان کی سوغات بھی پیش کر رہا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک سالہ کمپیوٹر ڈپلوما کورس خود کو منوا رہا ہے۔ اس کورس میں انفارمیشن ٹکنالوجی، پرسنالٹی ڈیولپمنٹ، ونڈو، پاور پوائنٹ، ایکسل، ورڈ اور ٹیلی کو پڑھایا جاتا ہے۔ امتحان دے کر آرہے طلبا سے جب ان کی اردو اور کورس سے دلچسپی کے بارے میں معلوم کیا گیا تو شاہین باغ کی ثنا احمد کا کہنا تھا کہ وہ ٹرانسلیشن کے میدان میں کام کرتی ہیں جس کا کورس انھوں نے ڈپلوما ان ٹرانسلیشن کر رکھا ہے۔ وہ اردو اور انگریزی میڈیم والے اس کورس کو اس لیے کر رہی ہیں تا کہ ان کو دوسرے امیدواروں پر نوکری میں ترجیح ملے جب کہ اوکھلا دہار کے محمد عرفان کا کہنا تھا کہ انھوں نے بارہویں کلاس پاس کی ہے اور نوکری کرنا چاہتے ہیں ان کے دوستوں نے ان کو یہ کورس کرنے کا مشورہ دیا۔ الامین سے وابستہ نوین راج بھاٹیا نے بتایا کہ دراصل سرکاری نوکریوں میں این سی پی یو ایل کے کورس کو مانے جانے اور ایک سال میں تمام اہم سافٹ ویئر سکھائے جانے کی وجہ سے طلبا کو کورس سے دلچسپی ہے جب کہ اردو میں ہونے کی وجہ سے مدارس اور اردو جاننے والے افراد کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 ستمبر 2013

معاشرے کی بیداری میں اردو میڈیا کا رول

نئی دھلی: بستی حضرت نظام الدین کے غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'تعمیر ملت فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام ایک قومی سیمینار بعنوان 'معاشرے کی بیداری میں اردو میڈیا کا رول' کا انعقاد کیا گیا جس میں دانشوروں نے اردو صحافت کو عوامی زندگی کا عکاس اور وقت کا نباض بتاتے ہوئے کہا

شافع قدوائی خطاب کرتے ہوئے، جب کہ اسٹیج پر مرزا ذکی بیگ، مولا بخش اسیر، اسد مرزا، مولانا ابوالکلام شمسی، مشرف عالم ذوقی و دیگر

کہ اردو صحافت نے انسانیت، اخلاق و مروت اور عام انسانوں کے دکھ درد کو سامنے لاکر معاشرے میں بیداری کا اہم ثبوت فراہم کیا ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں اس کی مثالیں بہت زیادہ مل جائیں گی۔ پروگرام کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ماس کمیونی کیشن کے چیئرمین پروفیسر شافع قدوائی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض محفوظ عالم ندوی اور مولانا مرزا ذکی بیگ نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ اس موقعے پر روزنامہ انقلاب نارتھ کے ایڈیٹر شکیل حسن شمسی نے صحافت کی قدروں اور صحافتی ذمے داریوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت نے عوامی بیداری کے لیے ہمیشہ نئی مہم کا آغاز کیا ہے۔ اس موقعے پر برٹش جائزہ کے ایڈیٹر مسٹر اسد مرزا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام میں اردو صحافت کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی مختلف شاخوں پر مقالات بھی پیش کیے گئے۔ پروگرام میں مولانا ابوالکلام شمسی، پٹنہ، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، ڈاکٹر فریاد آزر، ڈاکٹر ایم اے باقی، ڈاکٹر سجاد اختر، اسد مرزا، تحسین منور، بسمل عارفی، ڈاکٹر امتیاز فریدی، ڈاکٹر راغب اختر، ڈاکٹر افتخار الزماں، ڈاکٹر شکیل حبیبی، خاور حسن، حبیب سیفی اور محفوظ عالم نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے متعلق مختلف موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ صحافت کے بغیر آج زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے پاس بھی جو بھی معلومات ہوتی ہیں وہ سب صحافت کے ذریعے ہی پہنچتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میڈیا معاشرے میں اس حد تک داخل ہوچکا ہے کہ اب معاشرے کا سمت سفر طے کرنے میں بھی اہم رول ادا کر رہا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2013

'اردو زبان اور صوفیائے کرام' پر سیمینار

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے سوشل پرائڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام 'اردو زبان کی ابتدا و ارتقا میں صوفیا کا حصہ' کے عنوان سے نہرو گیسٹ ہاؤس

سیمینار کے دوران مولانا عبداللہ طارق، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر غلام یحییٰ انجم، سید شاہد مہدی، صحافی سید منصور آغا اور سہیل انجم

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کے افتتاح سے قبل مہمانِ خصوصی سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی کے ہاتھوں غوث سیوانی کی تحریر کردہ کتاب 'جدید دنیا کے مسائل اور تصوف' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ نظامت کے فرائض غوث سیوانی نے انجام دیے۔ سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ سید شاہد مہدی نے کہا کہ تصوف کی جو اہمیت پہلے تھی وہی اہمیت آج بھی ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا میں صوفیائے کرام نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے کہا کہ صوفیائے کرام ہمیشہ مقامی زبان ہی میں لوگوں سے مخاطب ہوتے تھے۔ معروف صحافی سید منصور آغا نے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ صوفیائے کرام جہاں بھی گئے انھوں نے وہاں کی مقامی زبان سیکھی اور پھر مقامی زبان ہی کے ذریعے عوام میں اسلام کی تبلیغ کی۔ معروف صحافی سہیل انجم نے کہا کہ اردو زبان کی ابتدا و ارتقا میں صوفیائے کرام کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ امتیاز وحید نے کہا کہ انگریزوں کے ذریعے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کا مقصد اردو زبان کی ترویج و ترقی نہیں تھی بلکہ انگریز ملازمین کو مقامی زبان سے روشناس کرانا تھا تا کہ اس کے ذریعہ وہ ہندوستان پر آسانی سے جابرانہ طور سے حکومت کرسکیں۔ قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ صوفیائے کرام نے اردو زبان کے آغاز وارتقا میں بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ صحافی ظفر احمد نے بھی مقالہ پیش کیا۔ آخر میں سوشل پرائڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر کمال احمد نے مہمانانِ کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر صحافیوں کے علاوہ کثیر تعداد میں دیگر افراد بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 ستمبر 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

اردو فونٹ پر مشتمل موبائل کا آغاز

نئی دھلی: ہندوستان میں زائد از پندرہ کروڑ اردو بولنے والے افراد کی ضرورت کے پیش نظر اپنی مصنوعات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے نوکیا انڈیا نے اردو فونٹ پر مشتمل پہلی بار موبائل فون کو لانچ کیا ہے۔ اس ڈوئل سم نوکیا موبائل ماڈل نمبر 114 کی قیمت 2579 روپے۔ موبائل میں اردو، ہندی اور انگلش زبان کے ساتھ 9 زبانیں منتخب کی جاسکتی ہیں۔ اس ڈیوائس میں 2 جی نیٹ ورک، 3ء0 میگا پکسل کیمرہ، ایف ایم ریڈیو اور ویڈیو کی خدمات بھی مہیا کرائی گئی ہیں۔ اردو فونٹ موبائل کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر برائے مواصلات و انفارمیشن ٹکنالوجی مسٹر کپل سبل نے نوکیا کے اس اقدام کو قابل ستائش بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اردو فونٹ پر مشتمل ہندوستان میں ایسے موبائل پہلی بار بازار میں آئے ہیں۔ ہم نے نوکیا والوں سے 6,7 مہینے قبل ہی کہا تھا کہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد 15 کروڑ سے زائد ہے اور اتنی بڑی آبادی کی زبان میں موبائل ٹکنالوجی کو منتقل نہیں کیا گیا تو ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ نوکیا انڈیا کے مینیجنگ ڈائرکٹر پی بالا جی نے موبائل میں اردو فونٹ نہ ہونے پر ایک خلا کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اب تک ہم اتنی بڑی آبادی کو سہولت فراہم کرانے سے محروم رہے۔ اب ہم نے یہ مقصد بھی پورا کرلیا ہے۔ اس خاص موقعے پر مشہور فلم ساز مظفر علی بھی موجود تھے۔ قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کی طرف سے 3 اگست کو ذاکر حسین کالج میں اردو ٹولز اور کی فونٹ کا اجرا عمل میں آچکا ہے۔

مرکزی وزیر کپل سبل معروف فلم ساز مظفر علی اور نوکیا کے مینیجنگ ڈائرکٹر پی بالا جی کے ہمراہ اردو فونٹ پر مشتمل نوکیا موبائل کو لانچ کرتے ہوئے

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 13 ستمبر 2013

قومی:

ڈجیٹل عہد میں ذرائع معلومات کا نظم

نئی دھلی: سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، شعبہ آیوش، وزارت صحت وخاندانی بہبود، حکومت ہند اور سوسائٹی فار انفارمیشن ریسرچ اینڈ اسٹڈیز، نئی دہلی نے مشترکہ طور پر 'ڈجیٹل عہد میں ذرائع معلومات کا نظم' کے موضوع پر ایک قومی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ یہ کانفرنس 21 ستمبر 2013 کو سی سی آر یو ایم کے ہیڈ کوارٹر واقع جنکپوری، نئی دہلی کے آیوش سبھا گار میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح مہمان خصوصی پروفیسر رئیس الرحمٰن، ایڈوائزر (یونانی) حکومت ہند، شعبہ آیوش، وزارت صحت وخاندانی بہبود نے کیا۔ پروفیسر رحمٰن نے اپنے خطاب میں کہا کہ وہ وقت گیا جب ایٹمی ہتھیار زیادہ طاقتور سمجھے جاتے تھے۔ آج کے دور میں معلومات ہی سب سے طاقتور ہتھیار ہیں۔ اس لیے معلومات کا بہتر نظم بہت اہم ہے

اور اس کے لیے ہمیں ہر دستیاب ٹکنالوجی سے مدد لینی چاہیے۔ پروفیسر سید شاکر جمیل، ڈائریکٹر جنرل نے اپنے صدارتی کلمات میں طب یونانی کے مخطوطات کے ڈیجیٹائزیشن کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ طب یونانی کی معلومات ملک کی مختلف لابریریوں میں قلمی نسخوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ہمیں ان قلمی معلومات کو محفوظ اور عام کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام صرف ڈجیٹائزیشن کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے 'ڈاکٹر اے ایم صدیقی، ڈائریکٹر سوسائٹی فار انفامیشن اینڈ ریسرچ اسڈیز نے کہا کہ لائبریری اور انفارمیشن سائنس کی دنیا میں ڈجیٹائزیشن کی ایک خاص اہمیت ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں لائبریریوں کے ڈجیٹائزیشن کا کام ہو چکا ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ ترقی پذیر ممالک بھی اس سمت میں کام کررہے ہیں۔ اس سے قبل محمد اظہر خاں، اسسٹنٹ لائبریری اینڈ انفارمیشن آفیسر، سی سی آر یو ایم، نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے تمام شرکا اور مندوبین کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی اور صدر کانفرنس کے ہاتھوں 57 چنندہ مقالات پر مشتمل کانفرنس پروسیڈنگس کا اجرا کیا گیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر سید احمد خاں، نئی دہلی 23 ستمبر 2013

قانون کی لغت منظر عام پر

ممبئی: ملک کی عدلیہ میں استعمال ہونے والی بمبئی 15 ستمبر قانونی زبانوں کا اردو ترجمہ 'قانون لغت' اب منظر عام پر آچکی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے۔ جس میں عدالتوں میں استعمال ہونے والی قانونی اصطلاحات کا اردو ترجمہ اور اس کی تشریح پیش کی گئی ہے جس کی رو سے اردو داں طبقے کو اپنے حقوق اور ان کے استعمال کے طریقوں کو اپنی زبان میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ لغت کو سپریم کورٹ کے نامور وکیل محمد ارشاد حنیف نے اپنی سات برسوں سے زائد محنت سے تیار کی ہے جس میں 52000 قانونی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ سیکڑوں لاطینی محاوروں کا بھی اردو ترجمہ پیش کیا گیا۔ ایڈوکیٹ حنیف ملک کے پہلے مسلم وکیل ہیں جنھوں نے قانون کی مشکل کتابوں کا اردو اور ہندی میں ترجمہ بھی کیا تھا جس میں انڈین پینل کوڈ، انڈین ایوڈینس ایکٹ جیسی بنیادی اور اہم کتابوں کے تراجم شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 ستمبر 2013

مولانا آزاد اور اردو پر سات روزہ سیمینار

علی گڑھ: جامعہ اردو علی گڑھ کے زیرِ اہتمام 'مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو زبان کا فروغ' موضوع پر

منعقدہ سات روزہ عالمی سیمینار اور قومی ورکشاپ کا افتتاح جامعہ اردو کیمپس میں جامعہ کی مشاورتی کونسل کے چیئرمین پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کیا۔ یہ سیمینار مرکزی وزارت برائے فروغِ انسانی وسائل کی قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان اور وزارت برائے اقلیتی امور کی مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے تعاون سے منعقد کیا گیا ہے۔ اپنے افتتاحی خطبے میں پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ یہ ہندوستان کی خوش نصیبی ہے کہ اس ملک کو آزادی کے پروانوں کی شکل میں گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، جواہر لال نہرو، اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی ہستیاں نصیب ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد اردو زبان کے فروغ میں جو قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں وہ اردو زبان کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں درج کی جائیں گی۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے ڈائرکٹر جسیم محمد نے مرکزی وزارت برائے اقلیتی امور کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس وزارت نے مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے توسط سے جو اسکیمیں وضع کی ہیں توقع ہے کہ ملک میں ان سے آزاد شناسی کی راہ ہموار ہوگی۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے او ایس ڈی فرحت علی خاں نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ گزشتہ 74 سال سے اردو زبان کے فروغ کے لیے سرگرمِ عمل ہے اور ان تمام ہستیوں کی خدمات سے عوام کو روشناس کرانا جامعہ کے فرائض میں شامل ہے جنھوں نے اپنی زندگی اردو زبان کے فروغ کے لیے وقف کردی تھی اور ان میں سب سے قابلِ احترام نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ جامعہ اردو بورڈ آف گورن کے رکن ڈاکٹر خلیل چودھری نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جامعہ اردو علی گڑھ کو مساوی درجہ دلانے کے لیے حکومت کے ذمہ داران سے جاری بات چیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ جامعہ اردو کے اکاؤنٹ آفیسر عبدالماجد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا جب کہ نظامت کے فرائض جسیم محمد نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 24 ستمبر 2013

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو ریفریشر کورس

(1)

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکادمک اسٹاف کالج میں 11 ستمبر کو 16 ویں اردو ریفریشر کورس کا افتتاح غالب انسٹی ٹیوٹ کے وائس چیئرمین اور ترقی پسند تحریک کے معروف ادیب و دانشور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اردو ریفریشر کورس کے کوآرڈی نیٹر اور جامعہ ملیہ کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر احمد محفوظ نے اردو ریفریشر کورس کا تعاف پیش کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی۔ اس جلسے کی نظامت ڈاکٹر عذرا خورشید نے کی جب کہ ڈاکٹر انیس الرحمٰن نے اظہار تشکر کیا۔ اس 16 واں اردو ریفریشر کورس کا موضوع 'اردو نثر: فورٹ ولیم کالج سے علی گڑھ تحریک تک (اہم نشانات)' رکھا گیا تھا۔ اس کورس میں دہلی کے علاوہ اتر پردیش، مغربی بنگال، مہاراشٹر، کرناٹک، جموں وکشمیر، بہار، جھارکھنڈ وغیرہ سے اردو کے اساتذہ نے شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ہر زبان کا ایک مرکز ہوتا ہے اور وہ زبان اسی مرکز سے پہچانی جاتی ہے اور مرکز کی طرف لوٹنا اور اس سے وابستگی بہت ضروری ہے۔ پروفیسر محمد مجتبیٰ خان، ڈاکٹر احمد محفوظ، پروفیسر وہاج الدین علوی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سولہویں ریفریشر کورس کی اختتامی تقریب میں سرکردہ شخصیات

(2)

نئی دھلی: آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے سوچنا بند کردیا اور ہم پہلے سے چلی آرہی باتوں پر یقین کرنے لگے۔ سوال قائم کرنے کی جرأت ہمارے اندر سے مفقود ہوتی جارہی ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں پورا نظام تعلیم تخلیقی علم کے بجائے محض ترسیل علم کا آلہ کار بن گیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف نقاد، محقق، شاعر اور فکشن نگار شمس الرحمٰن فاروقی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے 16 ویں ریفریشر کورس کے اختتامی جلسے میں کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے اس ریفریشر کورس میں شامل اردو اساتذہ کو یہ تلقین بھی کی کہ زبان کے رائج رسم الخط، الفاظ اور روزمرہ میں کوئی عیب نکالنے کا رویہ ترک کردیں، اس لیے کہ رسم الخط اس زبان کے بولنے والوں کی ملکیت ہے اس پر کسی کو سوال کرنے کا حق نہیں۔ اختتامی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے جامعہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے ریفریشر کورس کو اپنے موضوع، ماہرین، شرکا اور نظم وضبط کے اعتبار سے ایک کامیاب پروگرام قرار دیا اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر اور عملہ کو مبارک باد پیش کی۔ ریفریشر کورس کے اختتامی جلسہ کا آغاز اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد مجتبیٰ خان کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ ریفریشر کورس کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر احمد محفوظ نے 21 روزہ پروگرام کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کورس کا موضوع '19 ویں صدی کی اردو نثر' تھا۔ چنانچہ اس حوالے سے فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور علی گڑھ تحریک کی نثری خدمات کا بھرپور احاطہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس عہد کی اہم تصانیف اور اہم نثر نگاروں کا جائزہ لیا گیا۔ پروگرام میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمس الرحمان فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر علی احمد فاطمی، ظفر احمد صدیقی، قمرالہدیٰ فریدی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر معین الدین جینابڑے، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر خالد جاوید، اور پروفیسر سہیل احمد فاروقی نے اظہارِ خیال کیا۔ کورس کے شرکا میں ڈاکٹر شاہینہ تبسم اور امیر حمزہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اس کورس کو اپنی زندگی کا یادگار اور خوش گوار لمحہ قرار دیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عذرا خورشید نے کی۔ بعد ازاں شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاتھو کورس کے شرکا کو اسناد اور تحائف میں کتابیں پیش کی گئیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 12 ستمبر د 4 اکتوبر 2013

رابندر ناتھ ٹیگور اور ہندوستانی ادبی تناظر

نئی دھلی: موجودہ دور کے حالات میں رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے اور انھیں سمجھنے وسمجھانے کی اشد ضرورت ہے۔ ٹیگور کے افکار ونظریات انسان دوستی اور کشادہ ذہنی کا سبق دیتے ہیں۔ اس عہد کے عذاب اور اضطراب سے ٹیگور کے افکار ونظریات ہی بچا سکتے ہیں۔ ٹیگور نے ہمیشہ شدت پسندی کی مخالفت کی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کا ٹیگور پروجیکٹ جامعہ کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس سے ٹیگور کو اتنے بڑے اور منظّم ڈھنگ سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر خواجہ محمد شاہد نے جامعہ میں 'رابندر ناتھ ٹیگور اور ہندوستانی ادبی تناظر' کے موضوع پر منعقد کیے گئے سہ روزہ قومی سیمینار کے اختتامی اجلاس میں کیا۔ اس سیمینار کا انعقاد وزارت ثقافت، حکومت ہند کے اشتراک سے کیا گیا تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سیمینار کے دوران (دائیں سے) پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر خواجہ محمد شاہد، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہپر رسول اور مائک پر شمیم طارق

اس موقعے پر پروفیسر خواجہ محمد شاہد نے مزید کہا کہ ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کو ٹیگور سینٹر میں تبدیل کرنے اور مستقل سینٹر بنائے جانے کی ضرورت ہے۔ اختتامی اجلاس میں شمیم طارق نے کہا کہ گزشتہ 2 برسوں سے جامعہ میں ٹیگور کے حوالے سے تحقیق وترجمے کا جو کام ہو رہا ہے۔ جامعہ کی اس خدمت کو ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقعے پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ اس پروجیکٹ نے اردو والوں کو ٹیگور کو پڑھنے کے لیے مہمیز کیا۔ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ یہ سیمینار بصیرت سے بھرا ہوا تھا۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ رابندر ناتھ ٹیگور عظیم شاعر، ادیب، فکشن نویس کے ساتھ ساتھ انسان دوست بھی تھے۔ اس موقعے پر شعبہ کے ریسرچ اسکالر شاہ نواز فیاض نے بھی اظہار خیال کیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت جامعہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی اور مقالات کی اہمیت اور انفرادیت پر روشنی ڈالی۔ ٹیگور پروجیکٹ کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ ٹیگور ایک انسان تھے اور ان کی تخلیقات کو اسی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اختتامی اجلاس کی نظامت پروفیسر شہپر رسول نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 اکتوبر 2013

مقبرۂ ہمایوں کی تزئین کاری

نئی دھلی: 16 ویں صدی میں بنائے گئے مغل بادشاہ ہمایوں کے تاریخی مقبرہ کے تحفظ کے لیے آغا خاں ٹرسٹ فار کلچرل نے جو کام انجام دیا اسے بھی تاریخ ساز

کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ٹرسٹ نے 7 سال کی محنت کے بعد ہمایوں کے مقبرہ کا تحفظ کر اسی دور کی یاد تازہ کردی ہے۔ ٹرسٹ نے یہ کام دورابا جی ٹاٹا ٹرسٹ کے تعاون سے کیا ہے۔ 7 برس قبل اس عمارت کی جو حالت تھی اسے دیکھ کر یہی کہا جاسکتا تھا کہ ہماری تاریخی یادگاریں اب اپنے آخری دور سے گزر رہی ہیں۔ مگر تاریخی یادگار کو پھر سے تازہ کرنے کے لیے آغا خاں ٹرسٹ نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے جو کام کیا اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کام کے لیے ٹرسٹ کا پورا نیٹ ورک رات دن کام کر رہا ہے۔ مقبرہ کے اردگرد کا کام تو پورا ہو چکا ہے مگر باہر کی تزئین کاری ابھی جاری ہے۔ مقبرہ کی تزئین کاری مکمل ہونے کے بعد گزشتہ روز وزیراعظم نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ آغا خاں ٹرسٹ فار کلچرل کے پروجیکٹ ڈائرکٹر رتیش نندا نے بتایا کہ اب تک ہم نے مقبرہ میں 2 لاکھ 5 ہزار اسکوائر فٹ چونا لگایا جس کی وجہ سے نہ صرف عمارت مضبوط ہوئی، بلکہ دیکھنے میں بھی خوبصورت نظر آتی ہے۔ ہماری کوشش یہی ہے کہ یہ تاریخی مقبرہ مغل دور کی یاد تازہ کردے۔ نندا نے بتایا کہ اس تزئین کاری سے سینکڑوں لوگوں کو روزگار ملا ہے۔ اس مقبرہ میں جو ٹائل لگائے گئے ہیں وہ بستی حضرت نظام الدین کے بچوں کے ذریعے تیار کیے ہوئے ہیں۔ ہم نے ازبکستان سے ایک ماہر کو بلایا جس نے بستی کے بچوں کو ٹائل بنانے کا ہنر سکھایا اور آج بستی کے کئی بچے اس کام میں لگ کر روزی روٹی کما رہے ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ ہمایوں کی پہلی بیوی حمیدہ بیگم کے حکم پر 70-1569 میں مقبرہ تعمیر کرایا گیا۔ اس کے معمار سید مبارک ابن مراق تھے جنھیں افغانستان کے ہیرات شہر سے خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ یہ عمارت تقریباً 8 سالوں میں بن کر تیار ہوئی تھی اور ہندوستان میں چار باغ فنکاری کا پہلا نمونہ تھی اور اسی نمونہ کی بنیاد پر تاج محل کا جنم ہوا تھا۔ 1993 میں یونیسکو نے اسے ورلڈ ہیریٹیج کا درجہ دیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 21 ستمبر 2013

دھلی:

حکومت اردو اخبارات کے مسائل حل کرے گی

نئی دھلی: وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے یقین دہائی کرائی ہے کہ حکومت اردو اخبارات کے مسائل کو حل کرنے کی ترجیحی طور پر کوشش کرے گی۔ یہاں اپنی رہائش گاہ پر اردو ایڈیٹرس کے ایک وفد کے ساتھ ملاقات میں انھوں نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی سب سے بڑی علامت ہے اور حکومت کی پالیسی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو فروغ دینے کی ہے۔ یہ وفد جدید مرکز کے ایڈیٹر حسام صدیقی کی قیادت میں ملا تھا جس میں شامل مدیران میں رہنمائے دکن حیدرآباد کے ایڈیٹر سید وقارالدین، اخبار مشرق کے ایڈیٹر محمد وسیم الحق، جدید خبر کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی، روزنامہ ہندوستان ممبئی کے ایڈیٹر سرفراز آرزو شامل تھے۔ اس موقعے پر اطلاعات ونشریات کے مرکزی وزیر منیش تیواری اور وزیراعظم کے میڈیا ایڈوائزر پنکج پچوری بھی موجود تھے۔ وفد کے رکن معصوم مرادآبادی نے بتایا کہ وزیراعظم کی توجہ اردو اخبارات کے ساتھ اشتہارات کے محاذ پر انصاف کی طرف بھی مبذول کرائی گئی۔ وزیراعظم نے وفد سے کہا کہ وہ بنیادی مسائل کے حل کے لیے مناسب اقدامات کریں گے۔

روزنامہ 'انوار قوم' کانپور، 19 ستمبر 2013

اقلیتوں کے مسائل اور ان کا حل

نئی دھلی: جس شہر میں امیر خسرو اور غالب جیسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئی ہوں وہاں اردو زبان ختم ہونے لگے یہ ہمیں قطعی منظور نہیں ہے۔ یہ بات آج وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کے زیر اہتمام انڈیا

انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کے سیمینار کے دوران اسٹیج پر وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت، صفدر ایچ خاں جسٹس سہیل اعجاز صدیقی، شکیل صدیقی اور امریش گوتم

اسلامک کلچرل سینٹر میں 'اقلیتوں کے مسائل اور ان کا حل' کے موضوع پر منعقد سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ اس موقعے پر قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی، دہلی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر امریش گوتم اور دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خاں نے بطور خاص شرکت کی۔ شیلا دیکشت نے اپنی تقریر میں مزید کہا کہ ہم نے پہلے اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا جس سے کہ اس کی ترقی کی راہ نکالی جاسکے۔ جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے کہا کہ وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے جس طرح سے دہلی کو سجایا اور سنوارا ہے اسی طرح سے ہماری ملت کو سنوار دیجیے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کے 35 ملکوں میں اردو بولی جاتی ہے اور یہ کسی مذہب کی زبان نہیں ہے مشترکہ تہذیب کی زبان ہے۔ اردو کو روزگار سے جوڑنا بہت ضروری ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، یکم اکتوبر 2013

عربی و فارسی کو سول سروسز امتحانات میں بحال کیا جائے

دھلی: عربی فارسی کو یو پی ایس سی سے اخراج کرنے کا معاملہ اب طول پکڑتا جارہا ہے۔ عربی اور فارسی ہمارے ملک کی کلاسیکل زبانیں ہیں اور ہماری تہذیب و ثقافت سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ ان زبانوں میں ملک کا عظیم علمی سرمایہ موجود ہے، آج بھی ملک کی اہم یونیورسٹیوں میں ان زبانوں کے شعبے قائم ہیں اور ہزاروں مدارس میں ان کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے، لیکن ان اہم زبانوں کے خلاف سازش کرتے ہوئے انھیں یو پی ایس سی کے سول سروسز کے امتحانات سے خارج کردیا ہے جو قابل مذمت اور افسوس ناک ہے۔ ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمعیۃ علمائے ہند صوبہ دہلی مولانا عبدالحنان قاسمی نے بی بلاک منڈ والی فاضل پور دہلی میں آل انڈیا رفاہ عام فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ میٹنگ میں کیا۔ اس میٹنگ میں دہلی کے اہم علما، ائمہ اور دانشوران نے خاصی تعداد میں شرکت کی اور یو پی ایس سی کے سول سروسز کے امتحانات میں اس کی بحالی کے لیے دستخطی مہم، کانفرنسوں وجلسوں کے انعقاد اور ارباب حل و عقل سے ملاقاتوں سمیت متعدد قراردادیں منظور کیں۔ اس موقعے پر آل انڈیا رفاہِ عام فاؤنڈیشن کے صدر قاری محمد فیضان جامعی نے کہا کہ عربی ایک ایسی زبان ہے جس سے ملک کے کروڑوں لوگ جڑے ہوئے ہیں۔ اس میٹنگ میں جن دیگر اہم شخصیات نے خطاب کیا ان میں مولانا اخلاق احمد اور مولانا نثار احمد حسینی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 ستمبر 2013

دہلی اردو اکادمی کا ڈراما فیسٹول

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی اور دہلی سرکار کے محکمہ آرٹس اینڈ کلچر ولینگویجز کے زیر اہتمام اردو اکادمی کے 25 ویں ڈرامہ فیسٹول کا منڈی ہاؤس کے سری رام سینٹر

میں افتتاح کیا گیا۔ اکادمی کے اس سلور جبلی ڈرامہ فیسٹول کو معروف فکشن نگار کرشن چندر سے منسوب کیا گیا تھا اور اس کا افتتاح ڈرامہ نگاری کی دنیا کے بھیشم پتامہ ریوتی سرن شرما نے کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ اس موقعے پر اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے اردو ڈرامہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ڈرامہ کا حال روشن ہے، مستقبل کے تابناک ہونے کی قوی امید ہے، لیکن اس کا ماضی بھی تابناک رہا ہے اور اس کا ثبوت ہے اردو ڈرامہ فیسٹول کی کامیاب سلور جبلی۔ انھوں نے کہا کہ ڈرامہ کے سلور جبلی سال کو کرشن چندر کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آنے والا سال کرشن چندر کی صدی کی سال ہوگا اور تمام اردو دنیا اس نابغہ فکشن رائٹر کو اپنے اپنے طور پر خراجِ عقیدت پیش کرے گی۔ انیس اعظمی کے بعد خیر مقدمی کلمات کے دوران پروفیسر اختر الواسع نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں کرشن چندر کے رول پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کرشن چندر اردو ادب میں لافانی کرداروں کو پیش کرنے والے نابغہ فکشن نویس تھے اور اردو زبان و ادب کی تاریخ کرشن چندر کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر واسع نے اس موقعے پر اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی کی کتاب 'پارسی تھیٹر اور آغا حشر کاشمیری' کو ڈرامہ نگاری کی تاریخ کی بنیادی کتاب قرار دیا اور وضاحت کی کہ یہ ڈرامہ فیسٹول انیس اعظمی اور اکادمی کے دیگر رفقا کی اَنتھک جدوجہد کا انعام ہے۔ مشہور ڈرامہ نویس ریوتی سرن شرما نے اپنے خطاب میں کہا کہ انھیں 16 سال کی عمر میں مشہور فکشن رائٹر انتظار حسین نے اردو فکشن پڑھنے کی جانب مائل کیا تھا اور انھوں نے کرشن چندر کی ایک کہانی پڑھنے کو دی تھی۔ ریوتی سرن شرما نے مزید کہا کہ کرشن چندر کی تحریر میں ہمیشہ فطرت کی عکاسی کی گئی ہے اور وہ خود بھی فطرت سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ افتتاحی تقریب کے بعد کرشن چندر کی کہانی 'پرماتما' پر ریوتی سرن شرما کے لکھے، ڈرامے کو تھری آرٹ گروپ نے مشہور ڈرامہ ڈائرکٹر اجے منچندا کی ہدایت میں نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 اکتوبر 2013

'دیوانِ امداد امام اثر' پر ایک مذاکرہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیر اہتمام اردو تنقید کے ایک اہم بنیاد گزار 'امداد امام اثر' کے دیوان پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اور نظامت رضا حیدر نے کی۔ امداد امام اثر کا یہ دیوان صدی ایڈیشن ہے، آخری مرتبہ

1913 میں اس دیوان کو ریاست رام پور کے والی نے شائع کیا تھا اور اب 2013 میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے اسے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے اپنی تقریر میں امداد امام اثر کی شاعری کے ان نکات کو بیان کیا جن کا تعلق غالب کے شعری متن کے استفادہ سے ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے دیباچے میں اٹھائے گئے بنیادی سوالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امداد امام اثر کی شاعری کو 190ویں صدی کے شعری منظرنامے کا ایک تہذیبی دستاویز قرار دیا۔ فرحت احساس نے 'امداد امام اثر' کو 19ویں صدی کی نوآبادیاتی مسلم معاشرے میں ایک بین العلومی ذہن قرار دیا۔ پروفیسر عتیق اللہ کا خیال ہے کہ امداد امام اثر کی شاعری کو کہ مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے اسی لیے خود اسی کے دائرۂ کار میں رکھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ مذاکرے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ 'دیوان امداد امام اثر' کی اشاعت سے 19ویں صدی کا ادبی منظرنامہ بعض اعتبار سے کچھ زیادہ روشن نظر آتا ہے اور شاعری وہی نہیں ہے جو ان کے دیگر معاصرین نے نئے حالات کے پیش نظر کی تھی۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تحقیق کی مشکلات اور اس کی باریکیوں اور پھر تنقید سے اس کا بامعنی رشتہ قائم کرنے کے مرحلے کو صبر آزما بتایا۔ یہ بات انھوں نے سرور الہدیٰ کے دیباچے کے تعلق سے کہی اور ساتھ ہی خوشی کا اظہار کیا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اسے شائع کر کے اپنی عزت افزائی کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 ستمبر 2013

فروغ اردو میں مدارس کا کردار

نئی دھلی: سازحرا ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام نند نگری منڈولی کے کمیونٹی سینٹر میں ایک سیمینار بعنوان 'فروغ اردو میں مدارس کا کردار' کا انعقاد کیا گیا، جس میں علمائے کرام اور دانشوروں نے فروغ اردو میں مدارس کے کردار پر روشنی ڈالی اور اردو کی بقا میں مدارس کے رول کو ناقابلِ فراموش بتاتے ہوئے کہا کہ مدارس نے اردو کو ہر سطح پر سہارا دیا ہے خواہ وہ اردو کا ابتدائی دور ہو یا موجودہ دور۔ نظامت مولانا واصف نفیس مظاہری نے کی۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قاری محمد فاروق جامعی صدر سازحرا ایجوکیشنل سوسائٹی نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔

پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر حج کمیٹی دہلی کے چیئرمین حاجی پرویز میاں بطور خاص موجود تھے۔ اس موقعے پر انھوں نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے معروف شاعر اور خطاط مولانا سید عبدالعزیز ظفر جنک پوری القاسمی نے کہا کہ اردو نے مدرسوں میں آنکھیں کھولی تھی اور آج جب اردو ہر جگہ سے نکلی جا رہی ہے، ایسے دور میں بھی مدارس اسلامیہ اردو کو اپنا تعلیمی میڈیم بنا کر اس کی بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ مدارس کے فروغ میں اردو کے کردار سے متعلق مقالات پیش کیے گئے۔ پروگرام میں علما و مشائخ اور دانشوروں کے ہاتھوں جامعہ عربیہ سراج العلوم کے دینی، تعلیمی اور دعوتی مجلّے بنام 'نوائے سراج العلوم' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 7 اکتوبر 2013

لدمیلا واسیلووا اور تحسین فراقی کو استقبالیہ

نئی دھلی: گزشتہ روز غالب اکادمی، نئی دہلی میں غیر ملکی مہمانوں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں روس کی مہمان ڈاکٹر لدمیلا واسیلووا اور پاکستان کے مہمان پروفیسر تحسین فراقی نے شرکت کی۔

اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر لدمیلا واسیلووا انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے لٹریچر ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہیں۔ اردو کے فروغ کے لیے روس میں سرگرم ہیں کئی کتابوں کا ترجمہ روسی سے اردو میں اور اردو سے روسی میں کیا۔ فیض اور حالی پر ان کا بہت اہم کام ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ پروفیسر تحسین فراقی مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائرکٹر ہیں خود کلاسیکی ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور علامہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ رہے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر لدمیلا واسیلووا نے روس میں اردو کی صورت حال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ روس میں اردو کی تاریخ سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ روس میں اردو کے فروغ میں نشیب و فراز آتے رہے ہیں۔ سوویت یونین کے دور میں اردو کو سب سے زیادہ فروغ ملا۔ لیکن اب نئے روس میں اردو کا فروغ پھر شروع ہوا۔ ماسکو اور پیٹرس برگ کی تین یونیورسٹیوں میں اردو بحیثیت غیر ملکی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ طلبا میں اردو تعلیم کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے آج کل دو طالبہ جامعہ اسلامیہ سے ایم اے اردو کر رہی ہیں۔ اردو ادب کا ترجمہ جتنا روسی زبان میں ہوا ہے کسی اور زبان میں نہیں ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر تحسین فراقی نے پاکستان میں اردو کی صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں اردو کا فروغ بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ اردو تعلیم کا بہتر بند و بست ہے پورے پاکستان میں اردو لکھنے پڑھنے بولنے والے موجود ہیں۔

انھوں نے مجلس ترقی ادب کے بارے میں بتایا کہ اس کی تشکیل 1950 میں ہوئی تھی۔ اس ادارے نے ایک لاکھ سے زیادہ صفحات کے تراجم غیر ملکی زبانوں سے اردو میں کرائے۔ عربی ادب کا بہت سا حصہ اردو میں منتقل کیا گیا۔ تراجم تہذیبوں کے مابین پل کا کام کرتے ہیں۔ علامہ اقبال پر وہاں خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی تمام باقیات کو محفوظ کیا جا رہا ہے جلد ہی علامہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ساری چیزیں سامنے آ جائیں گی۔ جلسے کی صدارت جناب شاہد علی خاں نے کی۔ اس موقعے پر دہلی اردو اکادمی کے اردو سرٹیفکیٹ کورس کے طلبا کو پروفیسر عبدالحق نے کتابیں تقسیم کیں۔ اس موقعے پر افضل منگلوری اور متین امروہوی نے اپنا کلام پیش کیا۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے ڈاکٹر عزیز احمد صدیقی نے مہمانوں اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 12 ستمبر 2013

شاہ ولی اللہ یادگاری خطبہ

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) میں 26 ستمبر کو پہلے 'شاہ ولی اللہ یادگاری خطبہ' کا انعقاد کیا گیا۔ جے این یو کے سینٹر آف عربک اینڈ افریقین اسٹڈیز کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے اس پروگرام کا موضوع

اردو وراثت میلہ

(1)

نئی دهلی: ملک وسماج کو جوڑنے میں اردو زبان کا انتہائی اہم رول رہا ہے۔ اردو زبان کسی ایک فرقے یا کسی مذہب کی زبان نہیں بلکہ پورے ملک کی زبان ہے اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب وتمدن کی جیتی جاگتی علامت ہے۔ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب کا نام ہے۔ اردو بھائی چارے، آپسی میل جول ومحبت کی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار کل ہند کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری وترجمان ڈاکٹر شکیل احمد نے 20 ستمبر کو اردو اکادمی دہلی کے تیسرے اردو وراثت میلے کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ بعد ازاں اردو ترانہ وقومی ترانہ پیش کیا گیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر شکیل احمد نے یہاں لگائے گئے کتابوں کے اسٹال کے افتتاح سے اس میلے کا باقاعدہ آغاز کیا اور اس اردو وراثت میلہ کے اہتمام پر اردو اکادمی، دہلی کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو یقیناً ہماری عظیم وراثت ہے۔ اردو وراثت میلہ کی افتتاحی تقریب کی صدارت

اسٹیج پر (بائیں سے) پریم شنکر جھا، سید محمد اشرف، محترمہ راشدہ حسین، سراج حسین، وزیر تعلیم پروفیسر کرن والیہ اور غزل گلوکارہ اندرانائک

اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے مہمان خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا مختصر تعارف پیش کیا اور اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ہونے والے اردو وراثت میلے کی اہمیت وضرورت بیان کی۔ دہلی سرکار کے شعبۂ آرٹس اینڈ کلچر کے تعاون سے منعقدہ اردو وراثت میلے میں پروفیسر واسع نے مزید کہا کہ اس میلے کا خواب دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے دیکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کی وزیر اعلیٰ دہلی کو ایک حسین ثقافتی وتہذیبی مرکز بنانے کے لیے پابند عہد ہیں اور اس سلسلے میں اردو اکادمی، دہلی مسلسل وزیر اعلیٰ کے خوابوں اور امنگوں میں رنگ بھرنے کا کام کر رہی ہے۔ اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے تمام مہمان وشرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا 4 روزہ 'اردو وراثت میلہ' لال قلعہ کے سبزہ زار پر منعقد ہونے والا اردو اکادمی، دہلی کے ان اہم پروگراموں میں سے ایک ہے جس کی تہذیبی معنویت مسلم ہے۔

(2)

نئی دهلی: مہذب، یافتہ وخوش حال ہندوستان کے لیے اردو وراثت میلہ جیسے پروگرام انتہائی اہم ہیں اور ان کی اسی اہمیت کو سمجھتے ہوئے دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے اردو وراثت میلے کا انعقاد کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس سے کہ دہلی و ہندوستان کی قدیم گنگا جمنی تہذیب، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، آپسی میل جول ومحبت اور تہذیب وتمدن کو فروغ حاصل ہو سکے۔ ان خیالات کا اظہار لال قلعہ کے سبزہ زار پر اردو اکادمی دہلی اور دہلی سرکار کے محکمہ آرٹس اینڈ کلچر کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے 'اردو وراثت میلہ' کی اختتامی تقریب میں دہلی کی وزیر تعلیم والسنہ اور آرٹس وکلچر پروفیسر کرن والیہ نے بطور مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر دیگر مہمانان میں ہندوستان ٹائمز کے سابق ایڈیٹر پریم شنکر جھا، اردو کے عالمی شہرت یافتہ برصغیر ہند کے معروف فکشن نگار سید محمد اشرف، حکومت ہند کے نیشنل اکادمی کسٹمس اینڈ سینٹرل ایکسائز کی ڈائرکٹر راشدہ حسین، حکومت ہند کی فوڈ پروسیسنگ انڈسٹریز کے سکریٹری سراج حسین بھی موجود تھے۔ انھوں نے بھی اس میلے کی اہمیت وضرورت کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح کے قومی پروگرام جس میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی وآپسی بھائی چارے کی خوشبو آئے منعقد کرائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ میلے کے دوران قوالی، صوفیانہ کلام، مشاعرہ اور شام غزل کا انعقاد کیا گیا۔ میلے کے آخری روز الفلاح اسکول کے بچوں نے رنگا رنگ پروگرام پیش کیے اور ممبئی کی مشہور گلوکارہ اندرانائک نے صوفیانہ کلام پیش کیا۔ اس سلسلے کا آخری پروگرام داستان گوئی بعنوان 'اختری' (بیگم اختر کو خراجِ عقیدت) میں معروف داستان گو دانش حسین اور مشہور ومقبول گلوکارہ ددیا شاہ نے معروف گلوکارہ بیگم اختر کی زندگی اور ان کے کارناموں پر فنکارانہ انداز میں روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے تمام شرکا کی تعریف کی اور کہا کہ اردو اکادمی، دہلی اور اس کے رفقا کی مدد سے اس طرح کا کامیاب پروگرام منعقد کرنا آسان نہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے اور دہلی کے عوام کا تعاون ہے کہ ہم ایک اور کامیاب پروگرام کے انعقاد میں کامیاب ہوئے۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے بھی تمام شامل افراد کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 ستمبر و 25 ستمبر 2013

'دینی اور سیاسی پس منظر میں بہار عرب کا عبرت آموز سبق' رکھا گیا تھا۔ پروگرام کی صدارت اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ کیرالہ کی کالی کٹ یونیورسٹی کے روضۃ العلوم عربک کالج کے سابق پرنسپل پی کے حسین نے کلیدی خطبہ پیش کیا، جب کہ استقبالیہ کلمات جے این یو کے سینٹر آف عربک اینڈ افریقین اسٹڈیز کے چیئرپرسن پروفیسر بشیر احمد نے پیش کیے۔ پروفیسر فیضان اللہ فاروقی نے تمام مہمانان کا تعارف پیش کیا، جب کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت جے این یو کے عربک سینٹر کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد قطب الدین نے کی۔ اس موقعے پر پی کے حسین نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس وقت بہار عرب کا آغاز کیا گیا تو سب نے اسے بہار ہی سمجھا تھا مگر آج یہ بہار کی بجائے خزاں ثابت ہو رہا ہے۔ انھوں نے لیبیا، تیونس، مصر، شام اور عربی ممالک میں ہونے والے انقلابات کے حوالے سے اس کے منفی ومثبت اثرات کا جائزہ پیش کیا اور زور دے کر کہا کہ ہمیں اسلامی پس منظر کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کسی بھی انقلاب میں جذبات کی بجائے عقلمندی اور ہوش مندی سے کام لینا چاہیے۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہندوستان کی علمی اور فکری تاریخ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ شاہ ولی اللہ کی حیات وشخصیت ان کی مذہبی، علمی، سماجی، سیاسی اور فکری خدمات اور کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے مزید کہا کہ وہ ہشت پہلو شخصیت تھے۔ انھوں نے علوم اسلامیہ کے ہر فن میں اپنے اجتہادی افکار پیش کیے۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں اساتذہ، طلبا وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 27 ستمبر 2013

اردو صحافت اور علمی وادبی مجلّات

نئی دهلی: رابطہ ادب اسلامی ہند کے زیر اہتمام ابوالفضل انکلیو میں 'اردو صحافت اور علمی وادبی مجلّات، اعلیٰ انسانی اقدار کے موثر ذرائع' کے عنوان سے ایک پروگرام کا انعقاد ہوا۔ پروگرام میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر شفیق احمد خان ندوی، نائب صدر رابطہ ادب اسلامی ہند نے کہا کہ صحافت اور میڈیا کو کسی بھی جمہوری ملک کا اہم ستون مانا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے اس کا سماج اور تعمیر میں موثر کردار رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو

زبان وادب نے ہمیشہ انسانی بھائی چارے اور میل ملاپ کے جذبے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اخبار و رسائل کے ذریعے اخلاقی اقدار، انسانی میل ملاپ، سکون بخش روحانیت اور خوف خدا وفکر آخرت کے جذبات سے آشنا کیا جائے۔ ڈاکٹر شعیب رضا خان منسلک اردو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ، نئی دہلی نے اردو صحافت کا اجمالی جائزہ کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھا اور دہلی سے شائع ہونے والے ادبی مجلّات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان رسائل کے زیادہ تر بانیان اور ایڈیٹران غیر مسلم تھے، جو اپنے مجلّات میں ہر طرح کے علمی، ادبی اور ثقافتی مقالات شائع کرتے تھے۔ ان کی خدمات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے بھائی چارہ واخلاقی اقدار کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ عہد حاضر میں ضرورت ہے کہ اسی انداز پر صحافت و مجلّات کے ذریعے سماج کی رہنمائی کی جائے۔ جلسے میں دہلی کی تینوں یونیورسٹیوں کے اساتذہ وطلبا کے علاوہ کافی تعداد میں اہل علم نے شرکت کی۔ آخر میں رابطہ ادب اسلامی کے ایڈوائزر ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی اور ڈاکٹر شاہ عبدالسلام فاروقی کی وفات پر اظہار تعزیت اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ غیاث الاسلام صدیقی نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 ستمبر 2013

عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کی میٹنگ

نئی دھلی: عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کی ایک میٹنگ زیر صدارت پروفیسر عبدالحق (پروفیسر ایمریٹس، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) مرکزی دفتر تنظیم ہذا نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر عبدالحق نے یو پی ایس سی سے عربی، فارسی ہٹائے جانے کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے از سر نو شامل کیے جانے کی سفارش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو آج نازک دور سے گزر رہی ہے۔ عربی، فارسی کے ہٹائے جانے سے اردو مزید کمزور ہوگی کیونکہ اردو کی بنیاد عربی اور فارسی زبانوں پر ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ڈاکٹر ستیہ دیو نے کہا کہ حکومت دہلی اردو کی بنیادی تعلیم کی سمت میں پیش رفت کرے اور مستقل اردو ٹیچرز مہیا کرائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دہلی حکومت کے سبھی سرکاری اسکولوں میں لازمی طور پر کم از کم ایک ارو ٹیچر کا تقرر کیا جائے۔ منتظمہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے اپنے بیان میں کہا کہ اردو پورے ملک میں یکساں مقبول ہے اس لیے اردو کا فروغ قومی یکجہتی کا فروغ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ صوبائی حکومتیں اردو کے تئیں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو کے فروغ کے لیے زمینی سطح پر منصوبہ بند کوشش کریں۔ اس موقعے پر عالمی یوم اردو استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، جس میں دہلی کے مختلف حصوں سے نمائندگان کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔

پریس ریلیز محمد عمران قنوجی، عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی، دہلی، 25 ستمبر 2013

غالب انسٹی ٹیوٹ کے نئے ڈائرکٹر کا انتخاب

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ادارے کے اہم ممبران نے اتفاق رائے سے نوجوان اسکالر ڈاکٹر رضا حیدر کو اُن کی محنت، صلاحیت اور لیاقت کو دیکھتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کا نیا ڈائرکٹر منتخب کیا ہے۔ دلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ڈاکٹر رضا حیدر نے غالب انسٹی ٹیوٹ جوائن کیا تھا، وہ ریسرچ آفیسر کے عہدے پر فائز تھے اور اب انھیں ترقی دے کر ڈائرکٹر کا اہم منصب سونپا گیا ہے۔ ڈاکٹر رضا حیدر کی مرتبہ کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم اکتوبر 2013

آندھرا پردیش:

اردو تعلیم وروزگار اسکیم کا افتتاح

حیدرآباد: انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدرآباد کے زیر اہتمام پرانے شہر کے محلہ جات فاروق نگر، فاطمہ نگر اور دیگر اطراف واکناف کی مسلم اور غریب بستیوں میں رہنے والی ناخواندہ گھریلو اسکیم کے تحت یکم ستمبر بروز اتوار 'تعلیم بالغان اور ٹیلرنگ ٹریننگ سنٹر کا افتتاح بدست محمد عبدالرحیم خاں سابق پرنسپل اردو آرٹس کالج و معتمد عمومی ریاستی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت محمد مسعود فضلی صدر شہر ترقی انجمن اردو عظیم تر حیدرآباد نے کی۔ ابتدا میں سید فضل الحق رضوی نے 'تعلیم اور روزگار اسکیم برائے خواتین' اسکیم کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ محمد عبدالرحیم خان مہمان خصوصی نے خواتین و طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ انجمن کی جانب سے شروع کردہ مذکورہ 'اسکیم سے بھرپور استفادہ کریں تاکہ زبان سے واقفیت کے ساتھ اپنی معاشی حالت میں سدھار پیدا کیا جاسکے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اگر ضرورت محسوس کی گئی تو نہ صرف اس سنٹر میں مزید بیاجس کا اضافہ کیا جائے گا بلکہ دیگر بستیوں میں بھی مزید ایسے مفت ضامن روزگار تعلیمی مراکز قائم کیے جائیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ ضرورت مند خواتین مختلف فنی تعلیم وتربیت حاصل کرکے اپنے طور پر روزگار حاصل کرسکیں۔ جلسہ کو دیگر مہمانوں کے علاوہ میر وقار الدین علی خان، عابد علی خاں، محمد منیر الدین، باقری تحسین اور ظہیر الدین بابر نے اردو زبان کی تعلیم سے مربوط اسکیم کے تحت شروع کی گئی مہم کو وقت کی اہم ضرورت اور اس کو معاشرہ کے سدھار کے لیے شگون نیک قرار دیتے ہوئے عہدیداران اور اراکین انجمن کو مبارک باد پیش کی۔ ابتدا میں مرکز کی انچارج سیدہ ترنم فاطمہ اور فرحانہ بیگم نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ یہ تقریب انسٹرکٹر رخسانہ بیگم کے شکریہ پر اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 8 ستمبر 2013

اترپردیش:

الہ آباد میں فراق پر جلسہ

الہ آباد: آکاش وانی اور اور' گوند بلبھ پنت سماجک وگیان' کے باہمی اشتراک سے این سی زیڈ سی سی سول لائنس میں 'یادگاری خطبہ اور شخصیتیں' کے عنوان سے دو روزہ سیمینار منعقد کیا گیا۔ دوسرے دن کا اجلاس خصوصی طور سے فراق گورکھ پوری کے نام منسوب رہا۔ اس موقعے پر صدارت پروفیسر امر سنگھ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ فراق گورکھ پوری بڑی خوبیوں کے مالک تھے وہ جتنے عظیم شاعر تھے اتنے ہی عظیم انسان بھی تھے۔ فراق گورکھ پوری زمیں دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ 1930 میں وہ الہ آباد یونیورسٹی میں آئے اور فزکس اور انگریزی کے مضامین پڑھاتے رہے۔ انھوں نے دوران درس و تدریس کئی ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ پروفیسر ستیش دیو کہتے تھے کہ آنے والے سو برسوں میں الہ آباد یونیورسٹی کا شعبہ انگریزی لوگ فراق کے نام سے جانیں گے۔ فراق گورکھ پوری نے شاعری کے ساتھ ساتھ بہت سے سماجی کام بھی کیے ہیں۔ انھوں نے آزادی کی متعدد انقلابی تحریکوں میں بھی حصہ لیا ہے جس کی وجہ سے وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ جیل بھی گئے ہیں وہ نہرو جی کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کو سب سے بہتر انسان مانتے تھے۔ اس کے علاوہ فراق گورکھ پوری نے شاعری میں اپنے سے بڑا شاعر کسی کو نہیں مانتے کبھی کبھی وہ جوش ملیح آبادی سے اپنے کلام درست کروا لیتے تھے۔ اس کے ساتھ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ فراق کی شخصیت چھوٹے سے دائرے میں سمیٹ پانا غیر ممکن

مولانا آزاد اور اردو زبان کا فروغ

علی گڑھ: راجیہ سبھا کے رکن اور ممتاز دانشور مسٹر محمد ادیب نے جامعہ اردو علی گڑھ میں 'مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو زبان کا فروغ' موضوع پر منعقدہ سات روزہ عالمی سیمینار اور قومی ورکشاپ کے اختتامی اجلاس سے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب میں کہا کہ مولانا آزاد نے زندگی کا بڑا حصہ جیل میں گزارا اور ان کا قصور محض اتنا تھا کہ وہ سچے ہندوستانی تھے اور اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی قربانی یہ ہے کہ اپنی جان سے زیادہ عزیز شریکِ حیات کے جنازہ میں وہ صرف اس وجہ سے شریک نہ ہو سکے کہ ملک کی آزادی کی خاطر وہ اس وقت جیل میں بند تھے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ مولانا آزاد کی خدمات سے نئی نسل کو روشناس کرانے کے لیے اس قسم کے پروگرام ہندوستان

'مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو زبان کا فروغ' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے ممبر پارلیمنٹ محمد ادیب

کے گوشہ گوشہ میں منعقد کیے جائیں۔ محمد ادیب نے کہا کہ مولانا آزاد کا خواب تھا کہ ہماری تہذیب اور ہماری زبان کو فروغ حاصل ہوا اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ اردو زبان کو روزگار سے جوڑ کر مولانا آزاد کے خواب کو تعبیر سے ہمکنار کیا جائے۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنے ایم پی فنڈ سے جامعہ اردو علی گڑھ کو عمارت کی تعمیر کے لیے بیس لاکھ روپیہ کا گراں قدر عطیہ دیے جانے کا اعلان کیا۔ پروگرام کے اعزازی مہمان ایم اے ایچ انٹر کالج غازی پور کے پرنسپل خالد امیر نے کہا کہ آج زبان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس کے رسم الخط کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اردو کی بقا کے لیے بڑے پیمانے پر مہم چلانی ہے اور اس کی بقا تب ہی ممکن ہے جب ہم میں سے ہر فرد اردو زبان کو فروغ دینا اپنی ذاتی ذمے داری تصور کرے۔ انھوں نے کہا کہ اردو نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں قائدانہ رول ادا کیا مگر افسوس کہ آزادی کے بعد اس کے ساتھ سوتیلا سلوک روا رکھا گیا جو ملک کی بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے او ایس ڈی مسٹر فرحت علی خاں نے کہا کہ کسی بھی زبان کا فروغ تب ہی ممکن ہے جب اسے پرائمری سطح سے تعلیم میں لازمی قرار دیا جائے اور اس کے اسناد یافتگان کے لیے سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھولے جائیں۔ اس سے قبل حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے جامعہ اردو علی گڑھ کے ڈائرکٹر جسیم محمد نے اتر پردیش کی صوبائی حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ ملک کی سب سے بڑی ریاست میں ایک بھی انٹر کالج یا ہائی اسکول اردو میڈیم میں نہیں ہے۔ اس موقعے پر مسٹر محمد ادیب کو مولانا آزاد ایجوکیشن ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ جامعہ اردو میں یو ڈی سی مسٹر فرید خاں کو پروگرام کی کامیابی میں ان کے تعاون پر شال اوڑھا کر سرفراز کیا گیا۔ جامعہ اردو کے رجسٹرار شمعون رضا نقوی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت مصائد قدوائی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 ستمبر 2013

ہے۔ فراق جتنے عظیم انسان تھے اتنے ہی عظیم شاعر بھی تھے۔ فراق کا کہنا تھا کہ وطن پرستی کے لیے وطن پرست ہونا ضروری نہیں ہے۔ ضروری یہ ہے کہ وطن بھی ہمارے اندر ہو یہ باتیں وہ علامہ اقبال کا ترانہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' سن کر اکثر کہا کرتے تھے۔ مسٹر فاطمی نے مزید کہا کہ محرومی، مایوسی اور غم زدگی شاعر کا بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔ عمومیت اردو شاعری میں فراق کی انفرادیت

تھی۔ شرکا میں کامریڈ ضیاء الحق، ڈاکٹر اشرف علی بیگ، ڈاکٹر یاسمین سلطانہ، ڈاکٹر فخر الکریم کے علاوہ شہر کے معزز اشخاص موجود رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 ستمبر 2013

اردو زبان وادب کے ارتقا پر لکچر کا اہتمام

وارانسی: منگل کو ڈی اے وی پی جی کالج میں طلبہ کے تربیتی پروگرام کے تحت ایک لکچر کا اہتمام کیا گیا جس

کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سچد یو سنگھ نے کی اور بی ایچ یو شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر یعقوب یاور مہمان خصوصی تھے۔ پروفیسر یاور نے کلیدی خطبہ دیا۔ پروگرام کے منتظم اور ڈی اے وی پی جی کالج میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر حبیب اللہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اپنے خطاب میں پروفیسر یعقوب یاور نے کہا کہ اردو عوامی رابطے کی زبان ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان عوام میں اپنی سلاست، روانی، سادگی اور دلکشی کی وجہ سے جگہ بنائے ہوئے ہے۔ برطانوی زمانے میں اس زبان کو لے کر سیاست کی گئی اور اس کے تحت ہندو اور مسلمانوں کو بانٹنے کی کوشش کی گئی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اردو کی ابتدا، ترقی اور اس کے مختلف ادوار پر مفصل روشنی ڈالی، ان کا لکچر خسرو، دکن، میر تقی میر، غالب اور فورٹ ولیم کالج کی خدمات اور سیاست سے ہوتے ہوئے اردو زبان کی موجودہ حالت اور مستقبل میں اس زبان میں مواقع کا بھی احاطہ کر رہا تھا۔ انھوں نے ہر پہلو سے اس زبان کی تاریخ و ترویج پر سیر حاصل گفتگو کی۔ کلیدی خطبہ سے قبل بی اے سال سوم کے ایک طالب علم غفران حکیم نے غزل پیش کی۔ اس موقعے پر پروفیسر یعقوب یاور نے اپنی دو غزلوں اور راکیش دویدی نے ایک غزل سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 ستمبر 2013

فکشن مطالعات اور نئے تنقیدی جہات

علی گڑھ: ''عصر حاضر میں شاعری سے دلچسپی کم ہوئی ہے اور فکشن سکہ رائج الوقت ہوگیا ہے۔ ناول صنعتی نظام کی پیداوار ہے۔ حالانکہ داستان کے ساتھ کلچر اور اخلاقیات کی روایت وابستہ تھی۔'' ان خیالات کا اظہار دہلی یونیورسٹی کے سابق استاد اور ممتاز ناقد پروفیسر عتیق اللہ نے اردو اکادمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریسرچ ایسوسی ایشن شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام بروز 17 اکتوبر 2013 کو 'فکشن مطالعات اور نئے تنقیدی جہات' کے موضوع پر منعقدہ خصوصی لیکچر کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ بلاغت میں

فکشن کی کوئی جگہ نہیں لیکن فکشن کو جس طرح عصر حاضر میں مقبولیت حاصل ہوئی اس نے تنقید نگاروں کو فکشن کی اصناف، مزاج اور ہیئت پر توجہ دلائی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ

نے سائنس فکشن کے تعلق سے کہا کہ معیاری سائنس فکشن کو ادب میں جگہ دی جاسکتی ہے اور قرۃ العین حیدر کا 'روشنی کی رفتار' اس کی مثال ہے۔ عتیق اللہ نے فکشن کے اجزا کے موضوع پلاٹ، کہانی، کردار وغیرہ کے تعلق سے کہا کہ فنکار کے اندر جتنی تخلیقی صلاحیت اور کرافٹ کا فن ہوگا وہ اتنی ہی معیاری تخلیق پیش کرے گا۔ ریسرچ ایسوسی ایشن، شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ اس پروگرام کا آغاز حسب روایت تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ایسوسی ایشن کے نومنتخب سکریٹری محمد سلمان بلرام پوری نے ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور نظامت کے فرائض بخوبی انجام دیے۔ اس کے بعد پروگرام کنویز پروفیسر صغیر افراہیم نے اس خصوصی لیکچر کی نوعیت پر روشنی ڈالی اور پروفیسر عتیق اللہ کی شعبۂ اردو کے جلسے میں آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ جوائنٹ سکریٹری اکرم وارث نے مہمان خصوصی پروفیسر عتیق اللہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عتیق اللہ بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں اور اپنی ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے شاعری سے کیا اور آگے چل کر انھوں نے تحقیق، تنقید اور ادبی اصطلاحات کی فرہنگ پر بڑی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر عقیل احمد نے صدارتی کلمات میں فکشن کے حوالے سے کہا کہ آج ہم لوگ واقعہ بن گئے ہیں اور اسٹوری ہماری سائکی کا اہم جز بن گئی ہے۔ صدرِ شعبہ نے ریسرچ ایسوسی ایشن کی نئی روایت (خصوصی لیکچر) کا آغاز کرنے پر خوشی کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، پروفیسر صغیر افراہم، کنویز ریسرچ ایسوسی ایشن، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 8 اکتوبر 2013

سرسید: حیات وافکار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادارۂ تہذیب الاخلاق ونشانات کی جانب سے 'سرسید: حیات و افکار' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ممتاز افسانہ نگار اور چیف انکم

سید محمد اشرف 'سرسید: حیات وافکار' پر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے

ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف نے کہا کہ 1857 کے غدر کے فوری ردِ عمل میں سرسید نے جس فراست، ہمت، بصیرت، صداقت اور تجزیے کی قوت کا ثبوت دیا وہ ان کے جید معاصرین غالب، کارل مارکس اور ڈپٹی نذیر احمد سے

اردو زبان اور روزگار کے مسائل

لکھنؤ: آئین اور ملکی نظام کے دوسرے حصوں میں جو مراعات لسانی سطح پر اقلیتوں کو دی گئی ہیں اگر انھیں ایمانداری کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے تو ملک نہ صرف معاشی لحاظ سے مستحکم ہوگا بلکہ سماجی سطح پر بھی خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ ان خیالات کا اظہار یہاں لکھنؤ کے سہکارتا بھون میں اردو زبان اور روزگار کے مسائل پر منعقدہ کنونشن میں دانشوروں اور سماجی شخصیات نے کیا۔ سمنانتا، لکھنؤ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، مسیحا اردو سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کنونشن کا اہتمام کیا تھا۔ واضح رہے کہ اس کنونشن میں اتر پردیش کے تقریباً ساٹھ اضلاع کے نمائندے شریک ہوئے اور انھوں نے اردو روزگار اور زبان سے متعلق اپنے تجربات بھی پیش کیے۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر منظور احمد نے کی اور نظامت

مسیحا اردو سوسائٹی اور لکھنؤ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پروفیسر نصیر احمد خاں کو مومنٹو پیش کیا گیا

ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے کہا کہ ہر شخص کو اپنی مادری زبان سیکھنے کا حق ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اردو کو اپنی زندگی کے تمام کاموں میں بروئے کار لائیں۔ معروف اردو اسکالر پروفیسر نصیر احمد خاں نے مہمانوں اور مندوبین کا استقبال کیا اور کہا کہ اردو کے بارے میں یہ پروپیگنڈا بالکل غلط ہے کہ اتر پردیش میں اردو مر چکی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ گزشتہ مردم شماری میں تین کروڑ سے زیادہ لوگوں نے اتر پردیش میں اپنی مادری زبان اردو لکھوائی ہے۔ اوشا سنہا نے کہا کہ مادری زبان سے محبت کے بغیر ہم کسی دوسری زبان کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ ذاتی سطح پر ہم اپنی زبان کے بارے میں کس قدر حساس ہیں یہ قابل غور پہلو ہے۔ انھوں نے پروجیکٹ کی اہمیت اور افادیت پر بھی اظہارِ خیال کیا۔ اطہر نبی نے کہا کہ یہ اردو کا پہلا جلسہ ہے جس کے عنوان سے ہی امید کی کرن نظر آرہی ہے۔ آگرہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور سبھارتی یونیورسٹی میرٹھ کے وائس چانسلر پروفیسر منظور احمد نے مادری زبان کے ساتھ ساتھ کسی دوسری زبان کے سیکھنے پر بھی زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ فکری بلندی کے لیے مادری زبان کی واقفیت ضروری ہے۔ کنونشن کے دوسرے اجلاس میں عصمت ملیح آبادی، ڈاکٹر احمد عباس ردولوی، ڈاکٹر عباس رضا نیر، ڈاکٹر سرفراز احمد خاں، ڈاکٹر شاہ محمد فائز، ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر اہل لکھنؤ بطور خاص مسیحا اردو سوسائٹی، لکھنؤ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ نے پروفیسر نصیر احمد خاں کی خدمت میں مومنٹو پیش کیا۔ لکھنؤ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے فعال منیجر رفیع احمد اور مسیحا اردو سوسائٹی کے جنرل سکریٹری مسیح الدین خاں نے تمام مندوبین اور شرکا کا بطور خاص شکریہ ادا کیا جن کی آمد اور سرگرم شرکت سے یہ پروگرام کامیاب ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اکتوبر 2013

بالکل منفرد تھا اور ان بدلے ہوئے حالات میں جدید تعلیم کے پس منظر میں قوم کے مفادات کے تحفظ کا جو احساس تھا، ان کے دوسرے ساتھی ان کی گردِ پاک کو بھی نہیں پہنچے۔ انھوں نے اپنی مادرِ علمی کے طلبہ اور اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ اپنے عمل و گفتار میں مزید فراستِ مومنانہ اور مزید ہمتِ مردانہ کا امتزاج پیدا کریں۔ صداقت و بصیرت کو اپنے رویے میں عام کریں اور تجزیے کی قوت کو اپنے روزمرہ کا محاورہ بنالیں۔ یہ سب شامل حال ہوگا تو پھر جذبوں کی گلابی آنچ سے دلوں کے خرابے ضرور روشن ہوں گے۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) سید احمد علی نے سرسید کے مختلف اقتباسات کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ زبردست محبّ وطن تھے۔ انھوں نے ایک ایسے مکتب فکر کی بنیاد رکھی جس میں دین کے ساتھ عقل، تہذیب و تمدن، فطرت اور مادی ترقی کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ پروفیسر مسعود احمد نے تہذیب الاخلاق کے مدیر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کی

کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ انھوں نے مشاہیر علی گڑھ شائع کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس موقعے پر مشاہیر علی گڑھ کی چھٹی جلد کا اجرا پروفیسر شمیم جیراجپوری، ساتویں جلد کا اجرا سید محمد اشرف اور سید محمد طارق محمود، صائمہ ساجد اور ساجد نعیم کی کتاب 'ساکنانِ مراد آباد سے مراسم سرسید' کا اجرا پروفیسر مسعود الحسن نے کیا۔ تہذیب الاخلاق کے مدیر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے مہمانوں کا استقبال کا اور ڈاکٹر محمد جلال الدین نے نظامت کی۔ سرسید نمبر کا اجرا قائم مقام وائس چانسلر بریگیڈیر سید احمد علی نے کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اکتوبر 2013

انگریزی شاعر کا اردو ہندی سے رجوع

امروہہ: ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت اردو زبان ہے۔ ایک وقت میں ملک کی مادری زبان کہلائی جانے والی اس زبان نے ایک بار پھر ہندوستانی سماج میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کر لی ہے، اس وقت صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ مغربی ممالک میں اردو زبان بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے، غیر مسلم دانشور نہ صرف اردو شاعری کر رہے ہیں بلکہ اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں، اسی سلسلہ میں دہلی کے سندیپ سائکس کا بھی شمار ہوتا ہے جنھوں نے انگریزی زبان میں کئی سال تک شاعری کرنے کے بعد اردو زبان کی جانب رخ کیا اور اب اس سلسلہ میں ان کی کئی اہم غزل کی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں، رونائیں خیال و سادہ خیال کے نام سے منظرعام پر سندیپ سائکس کی غزلیہ تصنیف ہے جس میں سادگی کے ساتھ سماج کو جوڑنے کا پیغام دیا گیا، سائکس کی اس شاعری کو پاکستان کے مقبول صوفی سنگر شفقت علی خاں نے اپنی آواز بھی دی ہے اور ہندوستان میں ٹائمس میوزک نے اس کو لانچ کیا ہے۔ سندیپ بتاتے ہیں کہ وہ ایک عیسائی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے والد اردو لکھنا جانتے تھے، مرزا غالب کی سرزمین آگرہ میں پیدا ہوئے اور فراق گورکھپوری سے متاثر سندیپ نے بھی انگریزی شاعری کے بعد ہندی و اردو شاعری میں قدم رکھا، اسی لیے معروف شاعر منورانا نے ان کو دورِ حاضر کا فراق گورکھپوری کے خطاب سے نوازا، حالانکہ سندیپ ندافاضلی، منورانا کی شاعری سے متاثر ہے لیکن ان کی کوشش ہندی و اردو شاعری کے ذریعے انسانی زندگی کو ایک تسبیح کے دانوں کی طرح جوڑنے کی ہوتی ہے، سندیپ بتاتے ہیں کہ شاعری ان کا پیشہ نہیں بلکہ ایک شوق ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 ستمبر 2013

بہار:

گریڈیہہ میں اردو بیداری مہم

انجمن ترقی اردو گریڈیہہ کی پانچ رکنی اردو بیداری مہم کمیٹی کے ذریعے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں مختلف اردو بستیوں کا دورہ کیا۔ جناب عبدالعزیز عرف داؤد علی نے 'اردو زبان کی بیداری مہم' کو ایک بہت اچھا اور کارگر قدم بتایا۔ شمیم عالم اور الحاج محمد ادریس نے اس مہم میں اپنی بھرپور معاونت دینے کا اظہار کیا۔ انجمن کی اس ذیلی کمیٹی کے رکن الحاج انعام الحق نے اپنی مختصر تقریر میں شرکا اور سامعین کو اردو زبان کو مزید ترقی دینے کی ترغیب دی۔ ساتھ ہی محمد مبین الحق صاحب نے حالاتِ حاضرہ اور اردو زبان کے ساتھ پیش آنے والی دشواریوں کا تذکرہ کیا۔ انجمن ترقی اردو گریڈیہہ کے سکریٹری سید علی عباس نے شرکا اور جلسہ کو خطاب کیا۔

پریس ریلیز، سکریٹری انجمن اردو ترقی، جھارکھنڈ، 23 ستمبر 2013

امام اعظم ابوحنیفہ پر بین الملکی سیمینار

پٹنہ: امام اعظم ابوحنیفہؒ پر بین الملکی سیمینار کا انعقاد وزارت اطلاعات وفرہنگ کے کانفرنس ہال میں 17 ستمبر 2013 کو 10 بجے ہوا جس میں افغانستان کے علاوہ کئی ممالک کے علما و دانشور اور مشائخ شریک ہوئے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ہندوستان سے خانقاہ شاہ ارمانی پٹنہ کے زیب سجادہ اور ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرا کے لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کے ڈائرکٹر

پروفیسر سید شاہ حسین احمد مدظلہ مدعو تھے۔ وزیر اطلاعات و فرہنگ ڈاکٹر سید مخدوم رہین نے صدارت کی۔ پروفیسر صبغت اللہ مجددی، سابق صدر افغانستان اور پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ سیمینار کے پہلے سیشن میں پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے اپنا مقالہ پیش کیا جس کا موضوع تھا 'امام ابوحنیفہ کی مقبولیت ہندوستان میں' پروفیسر موصوف کے مقالہ پر افغانستان کے معروف عالم دین مولانا قیام الدین کشاف، رئیس شوریٰ علما افغانستان نے کہا کہ ''پروفیسر سید شاہ حسین احمد صاحب کا مقالہ پرمغز جامع اور نہایت ہی معلوماتی ہے۔'' سیمینار کے دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر سید شاہ حسین احمد اور قاضی محمد نذیر حنفی نے فرمائی۔ اس سیشن میں مفتی محمد سیر القادری (پاکستان) اور کئی دوسرے ممالک کے دانشوروں نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ دوسرے دن یعنی 18 ستمبر کا سیمینار امام ابوحنیفہ کے آبائی وطن شہر چارے کا ولایت پروان میں منعقد ہوا۔

پریس ریلیز خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی قدس سرہ، بہار، 23 ستمبر 2013

پنجاب:

مالیر کوٹلہ میں افسانہ کلب کا جلسہ

مالیرکوٹلہ: افسانہ کلب (رجسٹرڈ) کی طرف سے ایک ادبی اور سماجی تقریب عیدملن کا اہتمام اردو اکادمی کی عمارت میں کیا گیا جس کی صدارت مالیرکوٹلہ کے صدر میونسپل کمیٹی نریندر پال سنگھ نے کی۔ جناب چیتن سنگھ

(دائیں سے بائیں) شفیق احمد خان، پریم گوئیل، بشیر مالیرکوٹلوی، محمد جمیل الرحمٰن، نریندر پال سنگھ، ظہور احمد ظہور، عظمت علی خاں، چیتن سنگھ و صاحب صدر کو اعزیزی ٹرافی دیتے ہوئے

اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھاشا وبھاگ پنجاب، جناب پریم گوئیل سناتن دھرم سبھا مالیرکوٹلہ، جناب عظمت علی خاں سینئر ایڈوکیٹ اور سابقہ صدر میونسپل کمیٹی، جناب جمیل الرحمٰن اور جناب ظہور احمد ظہور چیئرمین اردو رابطہ کمیٹی (پنجاب) مہمانِ خصوصی تھے۔ اس تقریب کی خاصیت یہ تھی کہ عیدملن کے موقعے پر مالیرکوٹلہ کے سبھی مذاہب کے نمائندگان رونق افروز تھے۔ کلب کے سکریٹری ناصر آزاد نے مہمانانِ گرامی اور صدر اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے افسانہ کلب کے بارے میں بتایا۔ کلب کے نائب صدر اور افسانہ نگار سالک جمیل براڑ نے کلب کے چودہ سال کی رپورٹ پیش کی۔ چائے کے وقفہ کے بعد افسانہ کلب کے تخلیق کار ممبروں کی طرف سے رسمی طور پر ایک ایک افسانچہ پیش کیا گیا۔ افسانچہ نگاروں میں انیس قریشی نے افسانچہ 'توبہ'، جناب آزاد نے افسانچہ 'جواب'، جناب محمد شفیق قریشی نے پنجابی افسانچہ 'آبھل یاداں'، 'جناب ارشد منیم نے اپنا افسانچہ 'کامیاب'، جناب رشید عباس

نے پنجابی افسانچہ 'اندر دا اُبال'، جناب سالک جمیل براڑ نے افسانچہ 'معاوضہ' اور آخر میں کلب کے صدر پنجاب کے سینئر افسانہ نگار جناب بشیر مالیرکوٹلوی نے اپنا افسانچہ 'نصیحت' پیش کیا۔ جناب ظہور احمد ظہور چیئر مین اردو رابطہ کمیٹی نے کلب کی سرگرمیوں اور نوجوان افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر اطمینان ظاہر کیا اور دعا کی ہمارے یہ بچے اردو ادب میں بلند مقام حاصل کریں۔ شری پریم گوئل نے حاضرین کو بتایا کہ آپ اردو کے آدمی ہیں۔ گوئل صاحب نے اردو کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی اور کلب کے صدر اور روح رواں بشیر مالیرکوٹلوی کو مبارک باد دی۔ افسانہ کلب کے بانی اور صدر بشیر مالیرکوٹلوی صاحب نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے پنجاب اردو اکادمی کو فعال بنانے کی ضرورت پر زور دیا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، افسانہ کلب، مالیرکوٹلہ، پنجاب، 14 اگست، 2013

کرناٹک :

اردو مجلس ٹرسٹ، میسور کی ادبی نشست

میسور: ادارہ ادبِ اسلامی کرناٹک کے دفتر واقع تراب علی اسٹریٹ، اردو مجلس ٹرسٹ، میسور کے زیرِ اہتمام ایک نثری نشست اور غیرطرحی مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ نثری نشست الحاج سید رفیع اللہ حسینی صدر مجلس کی صدارت میں بعد نمازِ مغرب منعقد ہوئی۔ اس نشست میں مہمانانِ خصوصی پروفیسر ریاض احمد صاحب، جناب سید شفیع اللہ اور الحاج ایس معین الدین پاشاہ رہے۔ جناب رحمت اللہ نے صدر، مہمانانِ خصوصی اور سامعین کا خیرمقدم کیا اور نثری نشست کی نظامت کی۔ جناب مشتاق سعید نے اردو مجلس ٹرسٹ کی کارکردگیوں کی رپورٹ پیش کی۔ فاروق نشتر صاحب 'جاگتے رہو' کے عنوان پر بہت ہی خوبصورت انداز میں حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالی۔ الحاج معین الدین پاشاہ صاحب نے نواب حیدر علی خان بہادر پر ایک تحقیقی مضمون سنایا جسے بے حد سراہا گیا۔ ایس پاشا، مشتاق سعید وغیرہ نے بھی اپنے مضامین سے داد حاصل کی۔ نثری نشست کے بعد ایک شعری نشست کا بھی انعقاد عمل میں آیا۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 30 اگست 2013

مہاراشٹر :

ناگپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام

ناگپور: راشٹرسنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کو حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اردو شعبہ کے قیام کی منظوری مل گئی جس سے علاقۂ ودربھ کے اردو داں طبقہ میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ناگپور یونیورسٹی کے تحت کالجز کے اساتذہ نے گزشتہ دنوں آرٹی ایم ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ولاس سپکاڑ سے ملاقات کی اور انھیں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ ناگپور یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈی کے چیئرمین ڈاکٹر اظہر حیات کی قیادت میں ایک وفد نے وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا اور انھیں مبارکباد دی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر ولاس سپکاڑ نے مبارکباد کے جواب میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ سال رواں (14-2013) سے یونیورسٹی میں اردو شعبہ کا قیام عمل میں آجائے گا۔ اس سلسلے میں موصوف نے یونیورسٹی کی جانب سے ہر ممکنہ مدد کا یقین دلایا نیز امید ظاہر کی کہ اردو طبقہ بھی یونیورسٹی سے تعاون کرے۔

بذریعہ ڈاک: اسرار احمد، ناگپور، 1 جون 2013

اعزاز و اکرام :

پروفیسر عبدالستار دلوی

ممبئی: پیپلز آرٹس سینٹر ممبئی کی جانب سے اردو ادب کے نامور محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر عبدالستار دلوی کو اعزاز وایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ پیپلز آرٹس سینٹر نے مہاراشٹر اسٹیٹ کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے چند افراد کے اعزاز میں گزشتہ دنوں ایک جلسہ اور 'مراٹھی سنگیت رجنی' کا انعقاد کیا۔ یہ جلسہ رابندرناتھ ٹیگور ناٹیہ مندر، دادر میں منعقد ہوا۔

اس پروقار تقریب میں 7 معزز شخصیتوں کی عزت افزائی کی گئی۔ ان میں ایک پدم شری ڈاکٹر تاتیاراؤ لہانے ہیں، جنھیں ان کی طبی خدمات کے عوض ایوارڈ دیا گیا۔ دوسرا نام سندھوتائی سکپال کا ہے جو 'مائی' کے نام سے مشہور ہیں۔ تیسرا نام نڈر اور بے باک صحافی نکھل واگلے کا ہے۔ چوتھا انعام مشہور نوجوان ہدایت کار چندرکانت کلکرنی کو دیا گیا جنھوں نے کئی کامیاب مراٹھی ڈراموں اور فلموں کی ہدایت دی ہے۔ پانچواں انعام ڈاکٹر عبدالستار دلوی کو دیا گیا جو اردو ادبی و تعلیمی دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں مراٹھی سے اردو میں اور سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ وہ ممبئی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ مراٹھی کے مشہور و معروف غزل گائیک بھیم راؤ پنچاڑے کو چھٹا انعام دیا گیا۔ آخری اور ممتاز نام ویشالی ساولکر کا تھا جو کسی بھی کھیل میں نہیں ہاریں۔ قومی سطح پر انھیں 2012 میں نابینا کھلاڑیوں میں بہترین کھلاڑی کا انعام دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 ستمبر 2013

قمر گونڈوی کو غزل ایوارڈ

سیتاپور: ادبی حلقوں میں سرگرم عمل بزم اردو سیتاپور کے بارہویں طرحی مشاعرہ کا غزل ایوارڈ ضلع گونڈہ کے استاد بزرگ شاعر قمر گونڈوی کو دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ بزم اردو کے ذریعے کیا گیا ہے۔ غور طلب ہے کہ قمر گونڈوی بائیس کتابوں کے مصنف ہیں جس میں شعلہ شوق، ربط بہار، یادوں کا سفر، میر سنگ میل، آئینہ جگر مرادآبادی، کرشن چندر حیرت گونڈوی، شخص و شاعر وسیم بریلوی کے علاوہ غزلیوں کا مجموعہ البم خاصے مقبول ہیں۔ انھوں نے ایک نعتیہ مجموعہ بھی شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے سفر حرم اسیر بتاں۔ 1948 سے شعر و ادب میں وابستگی رکھنے والے قمر گونڈوی نے ضلع بہراج کے ممتاز شاعر واصف ناناپاروی سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔ خوشتر رحمانی نے بتایا کہ بزم اردو گزشتہ بیالیس برسوں سے ادبی فضا کو زندہ و جاوید بنائے رکھنے میں سرگرم عمل رہی ہے۔ اپنے ادبی سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے بزم اردو نے اب تک سیکڑوں مشاعرے، سیمینار اور اردو زبان و ادب کی بقا کے لیے مقابلہ جاتی پروگرام منعقد کیے ہیں۔ موجودہ وقت میں طرحی مشاعرہ اور اس میں پیش کیے اور ڈاک سے بھیجے جانے والے کلام پر بہترین غزل کا انتخاب کر کے اس کے تخلیق کار شاعر کو غزل ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔ خوشتر رحمانی کے مطابق ہندوستان میں یہ اپنے طریقہ کا پہلا مشاعرہ ہے جس میں ڈاک اور ای میل کے ذریعے دنیا کے مختلف ممالک کے قلمکار اپنا کلام بھیج کر شرکت کر رہے ہیں اور مشاعرہ کو بین الاقوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ مشاعرہ میں شامل شعرا کے کلام کو دنیا بھر میں پھیلے اردو دوست انٹرنیٹ پر ویڈیو کے ذریعے سنتے اور دیکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بزم اردو کی یہ کوشش جس طرح پروان چڑھ رہی ہے اور اس کی ستائش کے پیغامات موصول ہو رہے ہیں وہ خوش آئند ہیں اور اس بات کا ثبوت بھی کہ اردو ہندوستان میں بھلے ہی زوال پذیر

صحافت کے لیے نئی دنیا ایوارڈ

نئی دھلی: زندہ قومیں ماضی نہیں بلکہ حال اور مستقبل پر نظر رکھتی ہیں، مایوس قطعی نہیں ہونا چاہیے اور اپنے حقوق کے لیے جدو جہد جاری رکھنی چاہیے اور جب حق مل جائے تو اس کا صحیح استعمال بھی کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار آج اردو ہفت روزہ نئی دنیا کی اشاعت کے 40 سال مکمل ہونے کے موقعے پر اردو صحافت میں نمایاں کارکردگی کے لیے کانسٹی ٹیوشن کلب میں 'نئی دنیا ایوارڈ' پیش کرنے کے بعد اپنے خطاب میں نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری

نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں منعقد تقریب میں نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے ہاتھوں نئی دنیا ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے (دائیں سے) زاہد علی خاں، احمد سعید ملیح آبادی، سعید احمد، ونود مہتہ، عرفان، سنجیو سراف اور شکیل حسن شمسی

نے کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کے کام کا اعتراف ہے، جو بہت اہم بات ہے۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر مملکت برائے زراعت طارق انور نے کہا کہ آج کے دور میں اخبار نکالنا اور وہ بھی اردو اخبار ایک بہت بڑا کام ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ شاہد صدیقی نے مولانا عبدالوحید صدیقی کی وراثت کو نہ صرف قائم رکھا، بلکہ اسے وقعت بخشی ہے۔ ہفت روزہ نئی دنیا کے چیف ایڈیٹر شاہد صدیقی نے محمد حامد انصاری کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ نئی ٹیکنالوجی وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس ٹیکنالوجی نے اردو صحافت کو ایک نئی زندگی بخشی ہے۔ آخر میں اظہار تشکر کرتے ہوئے بزرگ صحافی کلدیپ نیر نے کہا کہ انھیں فخر ہے کہ انھوں نے اپنی صحافت کا آغاز اردو صحافت سے ہی کیا تھا حالانکہ بعد میں انگریزی کی جانب چلا گیا۔ لیکن اردو آج بھی میرا پہلا پیار ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر انعام یافتگان کو مبارکباد دی۔ تقریب میں نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری کے ہاتھوں روزنامہ سیاست کے ایڈیٹر زاہد علی خان کو 'عظمت صحافت ایوارڈ' سہارا اردو پبلی کیشنز اینڈ عالمی سہارا ٹی وی چینل کے گروپ ہیڈ سید فیصل علی کو 'آداب صحافت ایوارڈ''، اردو ٹائمز ممبئی کے سعید احمد کو 'تزئین صحافت ایوارڈ' روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر شکیل حسن شمسی کو 'وقار صحافت ایوارڈ' اردو ویب سائٹ ریختہ شروع کرنے کے لیے سنجیو سراف کو 'فروغ اردو ایوارڈ' اردو صحافت میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے اصغر علی انجینئر مرحوم کو (ان کے بیٹے عرفان انجینئر نے وصول کیا) 'قومی ایکتا ایوارڈ' اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ونود مہتہ کو 'قومی یکجہتی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ آخر میں بزرگ اردو صحافی اور آزاد ہند کولکاتہ کے چیف ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی کو اردو صحافت کی عظمت اور وقار کو بلند کرنے اور بے انتہا خدمات کے عوض 'لائف ٹائم اچیومنٹ' ایوارڈ، سے نوازا گیا۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے انعام یافتگان کا تعارف پیش کیا۔ بعد ازاں 'ہندوستان میں اردو صحافت کا مستقبل' کے عنوان سے ایک مذاکرہ کا انعقاد بھی کیا گیا اور آخر میں ممتاز گلوکارہ انیتا سنگھوی نے غزلیں پیش کیں۔ اس موقعے پر موجود دیگر اہم شخصیات میں مرکزی وزیر چودھری اجیت سنگھ، راجیہ سبھا کے رکن امر سنگھ، سابق مرکزی وزیر سی کے جعفر شریف، پاکستان کے سفیر سلمان بشیر، سید شاہد مہدی، آل انڈیا کانگریس کے ترجمان م افضل، کانگریس اقلیتی شعبہ کے سکریٹری انیس درانی، سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی، معروف وکیل مجید میمن، آل انڈیا امام آرگنائزیشن کے صدر امام عمیر الیاسی، آریہ سماجی رہنما سوامی اگنی ویش، بی جے پی کے لیڈر وجے جولی، معروف صحافی چندن مترا، سنتوش بھارتی، فاروق ارگلی، محمد احمد کاظمی، موسیٰ رضا اور جمیل انجم سمیت جیوری کے ممبران، کئی ممبران پارلیمنٹ اور بڑی تعداد میں صحافی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 ستمبر 2013

ہو رہی ہے مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ دنیا بھر میں اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 ستمبر 2013

نفیس بانو شمع

سیتاپور: بزم اردو کے تیرہویں طرحی مشاعرہ کا غزل ایوارڈ دہلی کی ممتاز اور کہنہ مشق شاعرہ سیدہ نفیس بانو شمع دہلوی کو پیش کیا جائے گا۔ یہ اطلاع مشاعرہ کنوینر خوشتر رحمانی نے دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ گزشتہ مشاعرہ میں بکھر کر وہ سنورتا جا رہا ہے مصرع طرح پر شمع دہلوی کی غزل سب سے عمدہ غزل پائی گئی ہے جس پر بزم اردو کے بورڈ نے انھیں غزل ایوارڈ سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شمع دہلوی کا شمار دنیائے ادب میں باوقار شاعرہ کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے شعرگوئی میں نکھار لانے کے لیے ڈاکٹر تابش مہدی کو اپنا استاد مانا ہے۔ 16 مئی 1956 میں اتر پردیش کے غازی پور میں پیدا ہوئی شمع دہلوی کے ناول سماج کو اتر پردیش اردو اکادمی سے 1986 میں ایوارڈ حاصل ہو چکا ہے جب کہ سوانح جنت سے نکالی ہوئی حوا کو 1998 میں اتر پردیش اردو اکادمی کے علاوہ بنگال اردو اکادمی نے بھی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جن کے نام کائنات بھر سناٹا اور کچھ درد کے صحرا سے کافی مقبول ہوئے نعتیہ مجموعہ جان کونین 2008 میں شائع ہو چکا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 ستمبر 2013

اظہر حیات

ناگپور: راشٹر سنت تکڑ بی مہاراج ناگپور یونیورسٹی ناگپور کی جانب سے پروفیسر ڈاکٹر اظہر حیات کو بیسٹ ٹیچر ایوارڈ 2013 کا اعزاز تفویض کیا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں 5 ستمبر کو یومِ اساتذہ کے موقعے پر ایک شاندار و پروقار تقریب

میں وزیر اعظم کے سائنس شعبے کے صلاح کار، آئی آئی ٹی کانپور کے ڈائرکٹر پروفیسر ڈاکٹر سنجے دھانڈے کے دست مبارک سے دیا گیا۔ جلسے کی صدارت ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ولاس سپکاڑ نے فرمائی۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر ڈاکٹر مہیش کمار اینکی، رجسٹرار اشوک گوماسے اور مینجمنٹ کونسل کی رکن ڈاکٹر ارچنا نیرکر کے علاوہ تمام فیکلٹی کے ڈین، تمام شعبے کے صدور اور کالج کے پروفیسرز اور طلبا و طالبات بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر اظہر حیات ناگپور میں یشودا گرلز آرٹس اینڈ کامرس کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹیڈی کے چیئرمین اور اکیڈمک کونسل کے

رکن بھی ہیں۔ موصوف کی اب تک چھ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف موضوع پر 50 سے زائد مضامین و مقالے بھی منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ ان کی دو کتابیں یونیورسٹی میں اردو کے نصاب میں شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک: اسرار احمد، ناگپور، 5 ستمبر 2013

حسین احمد شیرازی

نئی دہلی: انسان کے ایک دوسرے کے قریب آنے اور آپس میں ملنے جلنے سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور انسان کئی الجھنوں سے نجات پا سکتا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے ادبا کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کریں جس سے کہ ہندوستان و پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے نزدیک آئیں اور خطے سے شدت پسندی، نفرت، بھوک وغیرہ جیسے بڑے مسائل کا خاتمہ ہو سکے۔ ان خیالات کا اظہار پاکستان کے معروف طنز و مزاح نگار حسین احمد شیرازی نے بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکیڈمی میں ایک استقبالیہ تقریب میں کیا جو انڈین کلچرل سوسائٹی نے ان کے اعزاز میں منعقد کی تھی۔ اس موقعے پر حسین احمد شیرازی کے مزاحیہ مضامین کے مجموعہ 'بابونگر' پر مذاکرہ و محفل طنز و مزاح کا بھی

حسین احمد شیرازی کے مزاحیہ مجموعہ 'بابونگر' کا رسم اجرا کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سینئر صحافی اسد رضا، منظور عثمانی، عظیم اختر و دیگر

انعقاد کیا گیا اور 'بابونگر' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ اس ادبی پروگرام کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی جب کہ راشٹریہ سہارا اردو کے سینئر صحافی اسد رضا، منظور عثمانی اور عظیم اختر نے بطور مہمان اعزازی و مہمان ذی وقار نے شرکت کی۔ پروگرام کی ابتدائی نظامت میکش امروہوی نے کی۔ بعد ازاں نظامت غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ پروگرام کے آغاز میں انڈین کلچرل سوسائٹی کے روح رواں و میزبان کے ایل نارنگ ساقی نے تمام مہمانان وشرکا کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے معروف طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا۔ معروف شاعر متین امروہوی نے مزاحیہ کلمات ادا کیے اور حسین احمد شیرازی و بابونگر کی منظوم تعریف کی۔ اس موقعے پر راشٹریہ سہارا اردو کے سینئر صحافی اسد رضا نے حکومت ہند و پاک سے واگھہ باڈر پر طنز و مزاح کی محفلیں منعقد کرانے کی مانگ کی۔ منظور عثمانی نے پنجاب کی علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کا چھٹا دریا 'دریائے ظرافت' ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں پاکستانی رسائل و جرائد کی پابندی سے ہندوستان تک نہ پہنچنے پر افسوس کا اظہار کیا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 7 اکتوبر 2013

فنکار اکادمی کا چوتھا دلیپ کمار ایوارڈ

شہنشاہ جذبات دلیپ کمار اور اُن کی بیگم سائرہ بانو کی اجازت سے فنکار اکاڈی' کلکتہ گزشتہ چار برسوں سے مختلف شعبۂ حیات کی اہم شخصیات کو دلیپ کمار ایوارڈ سے نوازتی آرہی ہے۔ حسب روایات امسال بھی فنکار اکادمی نے بڑے اہتمام کے ساتھ اتوار 15 ستمبر 2013 کی شام 5 بجے 'گیان منچ ہال' کلکتہ میں دلیپ کمار ایوارڈ کی تقریب منعقد کی۔ جس کی صدارت نامور تاجر شری ہری پرساد کنوڑیہ نے فرمائی۔ مہمانانِ خاص کی حیثیت سے فارورڈ بلاک کے لیڈر محترم معین الدین شمس' معروف تاجر شری سریش اگروال اور شری پریش کوشل شریک ہوئے۔ جب کہ نظامت کے فرائض فنکار اکادمی کے سکریٹری جناب فراغ روہوی اور مشہور شاعرہ محترمہ شگفتہ یاسمین غزل نے انجام دیے۔

تقریب کے آغاز میں فنکار اکادمی کے وائس چیئر مین ایس ایم راشد صاحب نے معزز مہمانان اور صاحبانِ اعزاز کا خیر مقدم کیا اور فنکار اکادمی کی گزشتہ کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے دلیپ کمار صاحب کی ہشت پہلوی شخصیت اور خدمات پر بھر پور روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پندرہ حضرات چوتھے دلیپ کمار ایوارڈ سے نوازے گئے ان میں جناب کلیم الدین شمس مرحوم (بعداز مرگ)

(سیاست داں)، عزت مآب محترمہ فرزانہ عالم (ڈپٹی میئر، کولکاتا کارپوریشن)، محترمہ ریحانہ خاتون (کانسلر وارڈ-44) استاد صابر خان صاحب (طبلہ نواز)، شری رام کرشن پال (وائلن ماسٹر)، جناب انجم عظیم آبادی (صحافی)، جناب رفیق انجم (ڈرامہ نگار)، جناب انیس النبی (افسانہ نگار) جناب شبیر احمد (افسانہ نگار و ترجمہ نگار) جناب افضل حسین افضل (شاعر) جناب اکبر حسین اکبر (شاعر)، جناب ضمیر یوسف (شاعر)، جناب سوشیل چودھری (مین آف دی ایئر)، شری سنجے ڈبری وال (بزنس مین) اور عبدالخالق عرف بابو بھائی (سماجی کارکن)، کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر اعزاز یافتگان کی خدمات میں پہلے گلہائے محبت پیش کیے گئے، پھر اُن کی شال پوشی کی گئی، اس کے بعد خوبصورت ٹرافی پیش کر کے اُن کی پذیرائی کی گئی۔ ایوارڈ کے تقسیم کے دوران فنکار اکادمی کے روح رواں یعنی پلے بیک سنگر عارفی عالم اور مس مینو نے سامعین کے ذوق کی تسکین کے لیے فراغ روہوی، محب شادانی اور مرحوم احمد رئیس کے لکھے ہوئے نغموں کو گا کر خوب دادِ تحسین حاصل کی۔ مہمان اداکار جونیئر محمود نے بھی اپنے فن سے حاضرین کے دلوں کو جیت لیا۔ اور کہا کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم نے دلیپ کمار صاحب اور مرحوم محمد رفیع صاحب کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ انھیں چھوا بھی ہے۔ اللہ دلیپ کمار جیسی شخصیت کی عمر دراز کرے۔ وہ صرف اداکار ہی نہیں، ایک حساس دل انسان بھی ہیں۔

پریس ریلیز، فراغ روہوی، سکریٹری، فنکار اکادمی، کولکاتا، 19 ستمبر 2013

رسم اجرا:

ترشح

جلگاؤں: بھساول کے بزرگ وکہنہ مشق شاعر احسان رسولپوری کی نظموں کے مجموعہ 'ترشح' کی رونمائی گزشتہ دنوں الحرا اردو اسکول میں عبدالکریم سالار کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ اس موقع پر منعقدہ جلسہ کی صدارت مدیر انقلاب جناب شاہد لطیف نے کی۔ طالب علم عمار احمد نے تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز کیا۔ بعد ازیں معروف قلم کار شمس اعجاز کے لیے اظہار تعزیت کیا گیا۔ پروگرام کے کنوینز حاجی انصار نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے اردو قلمکاروں کے ساتھ ہونے والے سوتیلے سلوک پر اظہار افسوس کیا۔ عبدالمتین احسان نے

مہمانان کی گل پوشی کی۔ اس موقعے پر مدیر انقلاب جناب شاہد لطیف نے شرکا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو بہت مالدار زبان ہے۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی بہت وسیع ہے مگر سیکڑوں الفاظ متروک ہوتے جارہے ہیں جنھیں استعمال کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ احسان صاحب کی نظموں میں جہاں بے پناہ فنی محاسن ہیں وہیں یہ نظمیں بے عیب بھی ہیں۔ عبد الکریم سالار نے 'ترشح' کی 50 جلدیں خریدنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اردو کاز کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔ صاحب اعزاز احسان رسولپوری نے اپنے مختصر ترین خطبہ میں اردو دوستوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے ان کی پذیرائی کی۔ اس موقعے پر حاجی انصار اور صابر پرواز نے اظہار خیال کے دوران کہا کہ 'احسان صاحب خالص نظم کے شاعر ہیں اور ان کی نظموں میں زمین کے مسائل کو آسمان والے کے سامنے بڑی خوبصورتی سے رکھا گیا ہے۔' قیوم اثر نے صاحب اعزاز شاعر کی متعدد نظموں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ 'یہ نظمیں پرانی ہوتے ہوئے بھی جدید دور کے تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتی ہیں بلکہ ان کی عکاس بھی ہیں۔' احمد کلیم فیض پوری نے اپنے مقالہ میں اس بات کا اعتراف کیا کہ 'احسان صاحب کی نظمیں رواں دواں بھی ہیں اور زندہ وجاوید بھی۔' رشید قاسمی، ڈاکٹر ساجد قادری اور ڈاکٹر شکیل احمد نے بھی احسان رسولپوری کی فنی صلاحیتوں کو نہ صرف سلام کیا بلکہ ان کے کلام میں پوشیدہ پیغام کو اجاگر کرتے ہوئے دور حاضر میں ایسی شاعری کی ضرورت کا تذکرہ بھی کیا۔ مشتاق کریمی نے نظامت کی۔ احمد کلیم فیض پوری کے شکریہ پر جلسہ ختم ہوا۔

پریس ریلیز، مشتاق کریمی، جلگاؤں، 18 ستمبر 2013

فکر آزاد

امروهه: ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور کانگریس کے سب سے نوجوان صدر بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد کی 125 ویں یوم ولادت کے موقعے پر شہر امروہہ کے محلّہ پیرزادہ میں کارپوریٹر قدیر احمد صدیقی کی رہائش گاہ پر مولانا ابوالکلام کی شاعری پر مبنی حسن آرا ٹرسٹ کی پیش کش 'فکر آزاد' کی رونمائی پرتھما بینک کے ڈائرکٹر شاہد خاں و شہر کارپوریشن کے چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز و دیگر معززین کے ہاتھوں اتر پردیش اردو ادب سوسائٹی کی جانب سے عمل میں لائی گئی۔ رسم رونمائی تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر چندن نقوی نے کہا کہ بیگم فرخ ناز و حسن آرا ٹرسٹ کی کوشش سے مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کی ایک اور نئی خوبی ان کی شاعری منظر عام پر آچکی ہے، اس کتاب میں مولانا کا تمام کلام شائع کیا گیا ہے جو صرف لائبریری میں محفوظ تھا لیکن اب یہ کلام منظر عام پر آگیا ہے۔ اتر پردیش اردو ادب سوسائٹی کے بانی صدر کوثر علی عباس و اتر پردیش کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اقبال احمد خاں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ حسن آرا ٹرسٹ کی تازہ پیش کش ایک ادبی شاہکار ہے۔ شہر کارپوریشن کے صدر ڈاکٹر افسر پرویز نے کہا کہ مولانا آزاد کو حکومت ہند کی جانب سے بھارت رتن اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا۔ یہ سال مولانا کی یوم ولادت کا 125 واں سال ہے، افسانہ نگار شکیل جاوید و پرتھما بینک کے ڈائرکٹر مشاہد خاں نے اپنی تقریر میں بتا گیا کہ ہندوستان کے تمام ثقافتی مرکز مولانا آزاد کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 ستمبر 2013

اوراق گل

رامپور: دارالسرور رامپور میں 1944 میں ضمیر احمد ہاشمی کے ذریعے مرتب کتاب 'اوراق گل' کا جسے رضا لائبریری نے شائع کیا ہے، کی رسم اجرا ریاست دہلی کے اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر حسین خاں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ رسم اجرا کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے صفدر حسین خاں نے کہا کہ جب دہلی اور لکھنؤ سے اردو اور ادب کے قدردان اجڑے تو رام پور نے انھیں پناہ دی اور ریاست رامپور نے اس دور کے عظیم شاعروں کو نہ صرف پناہ دی بلکہ ان کے کلام کو زندہ رکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اوراق گل نئی نسل کے لیے نیک فال ہوگی کیوں کہ اس میں روحانی شاعری موجود ہے۔ انڈ و پاک کے شاعر اظہر عنایتی نے کہا کہ ضمیر احمد ہاشمی نے 1944 میں اوراق گل مرتب کی جن شعرا کا اس میں تذکرہ ہے ان میں سے کچھ تقسیم وطن کے وقت پاکستان منتقل ہوگئے۔ انھوں نے کتاب کی طباعت میں آئی کچھ خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید عزیز الدین ہمدانی نے بتایا کہ ریاست رامپور میں تاریخی مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں عظیم شعرا حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ریاست رامپور کے وزیر اعظم کرنل بشیر حسین زیدی نے نواب رضا علی خاں کو مشورہ دیا کہ وہ ان عظیم شاعروں کی تاریخ مرتب کرائیں چنانچہ 1944 میں یہ ذمہ داری ضمیر احمد ہاشمی کو دی گئی جنھوں نے 'اوراق گل' مرتب کی۔ تقریب کی نظامت احداللہ خاں نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 ستمبر 2013

نظام شاہی توپ ساز محمد بن حسن رومی خان

اسلامیات کے ممتاز اسکالر مولانا انور خان ندوی نے کہا کہ اسلاف کے قابل قدر کارناموں کی روشنی کو نسل در نسل منتقل کرنا ایک فرضِ منصبی ہے اور یہ کام محقق اور ناقد جناب اسلم مرزا نے نہایت احسن طریقے سے انجام دیا ہے۔

تصویر میں (دائیں سے بائیں): شیخ عبدالستار، اسلم مرزا، مولانا انور خان ندوی، عبدالسلام، ڈاکٹر اکرام خان، ایڈووکیٹ مرزا عبدالعزیز

مولانا انور خان ندوی، حلقہ احباب اردو ادب، احمد نگر کے زیر اہتمام 22 ستمبر 2013 کو منعقد پروگرام میں معروف محقق، ناقد، شاعر اور مترجم جناب اسلم مرزا کی تاریخی و تحقیقی کتاب 'نظام شاہی توپ ساز، محمد بن حسن رومی خان (ملکِ میدان اور دیگر توپوں کے حوالے سے)' کے اجرا کے بعد اپنا صدارتی خطبہ پیش کررہے تھے۔ محمد یہ ایجوکیشن سوسائٹی کے چیئرمین جناب

عبدالسلام نے کتاب کا اجرا کرنے کے بعد اپنے مخاطبت میں کہا کہ اسلم مرزا نے اپنی بے مثال تحقیق اور جستجو سے احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت کے سولہویں صدی عیسوی کے شب و روز کو اکیسویں صدی کے قارئین کے لیے نئی آب و تاب کے ساتھ زندہ جاوید کردیا ہے۔ ڈاکٹر اکرام خان، شیخ عبدالستار موظف اسسٹنٹ کمشنر آف پولس، ڈاکٹر سید نذیر احمد، ڈاکٹر قمر سرور، چاند سلطانہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب ابوالناصر، جناب انور مرزا (ممبئی) اور ایڈووکیٹ مسز مسرت پٹیل نے بھی خطاب کرتے ہوئے اسلم مرزا کی تحقیقی، تخلیقی اور ادبی سرگرمیوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

بذریعہ ڈاک: اسرار حسین، سکریٹری شعبۂ نشر و اشاعت، 27 ستمبر 2013

شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں تین کتابوں کا اجرا

میرٹھ: 2 اکتوبر کو شعبۂ اردو نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں اپنا 11 واں یوم تاسیس منایا۔ اس موقعے پر تین کتابوں کا اجرا عمل میں آیا، جس میں ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ (شعبۂ اردو، جی بی یو، نوئیڈا) کی کتاب 'قرۃ العین حیدر کے نمائندہ افسانے'، سراج فاروقی (ممبئی) کا پہلا افسانوی مجموعہ 'تم اب بھی'، ساجد علی کی کتاب 'اردو صحافت' شامل ہیں۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے، جب کہ نظامت ڈاکٹر آصف علی نے کی۔ پروگرام میں پی وی سی جے کے پنڈیر نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ مہمان مکرم مولانا سید محمد اطہر کاظمی، ممبر مدرسہ عربی فارسی بورڈ اتر پردیش اور مہمان ذی وقار سید فیصل علی رہے۔ اس موقعے پر 'ایک شام کہانی کے نام' عنوان سے ایک افسانہ کی محفل بھی منعقد کی گئی، جس میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے افسانہ نگار، مشرف عالم ذوقی (دہلی)، خورشید حیات (بلاس پور، چھتیس گڑھ)، اشتیاق سعید (ممبئی)، سراج فاروقی (ممبئی)، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (میرٹھ) نے افسانوں کی قرأت کی۔ پروگرام میں ذی شان احمد خان، آفاق احمد خاں، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر فرحت جہاں، آصف سیفی وغیرہ خصوصی طور پر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' 3 دہلی، اکتوبر 2013

منٹو کی کہانیوں کا پنجابی ترجمہ

علی گڑھ: پنجابی زبان ایک شیریں اور پیاری زبان ہے جو دنیا بھر میں بولی جاتی ہے اور ڈاکٹر کرانتی پال اس امر کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو کے ممتاز کہانی کار سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کے مجموعہ کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پرو وائس چانسلر برگیڈیئر (ریٹائرڈ) سید احمد علی نے ڈاکٹر کرانتی پال کی پنجابی کتاب 'منٹو کی مشہور کہانیاں' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ علی گڑھ موومنٹ کے مدیر اعلیٰ جسیم محمد نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لسانی اتحاد کی علامت ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا بھر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس کے کثیر لسانی اتحاد کی علمبردار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ماڈرن انڈین لینگویجز شعبہ میں پنجابی زبان کے استاد اور 'منٹو کی مشہور کہانیاں' کے مترجم ڈاکٹر کرانتی پال نے کہا کہ سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم قلم کار تھے اور میری خواہش تھی کہ میں ان کی کہانیوں کا پنجابی زبان میں ترجمہ کروں تاکہ اس زبان کے لوگوں کو بھی منٹو جیسے عظیم قلم کار کو سمجھنے کا موقعہ مل سکے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کسی زبان سے بندھا نہیں ہوتا اور اگر میرا اے ایم یو سے رشتہ نہیں ہوتا تو شاید یہ کام ممکن نہیں تھا۔ ماڈرن انڈین لینگویجز شعبہ کے سابق سربراہ پروفیسر شیخ مستان نے کہا کہ ڈاکٹر کرانتی پال نے ادب کو زبان سے بلند تر رکھ کر اردو کے ایک ممتاز ادیب کو پنجابی زبان میں زندہ کیا ہے جو ان کا بڑا کارنامہ ہے اور اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروکٹر ڈاکٹر جمشید صدیقی بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 13 ستمبر 2013

'دکن کا نقشہ جاتی خاکہ'

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی' ہارون خان شیروانی مرکز برائے مطالعاتِ دکن کے زیر اہتمام 'دکن کا نقشہ جاتی خاکہ' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب کی رسم اجرا جناب نجیب جنگ لیفٹیننٹ گورنر کے ہاتھوں انجام پائی۔ پروفیسر محمد میاں' وائس چانسلر نے صدارت کی۔ بحیثیت مہمانِ خصوصی اپنے خطاب کے دوران جناب نجیب جنگ نے کہا کہ ہندوستانی تہذیب کا خمیر سیکولرزم سے عبارت ہے۔ انہوں نے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں اس قدر

'دکن کا نقشہ جاتی خاکہ' کے اجرا کا منظر

اہم تحقیقی کام کی انجام دہی پر ارباب جامعہ کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ محض خواندہ ہونے کے لیے تعلیم حاصل نہ کریں بلکہ حصول علم کی خاطر تدریس و تعلیم کے مراحل طے کریں۔ پروفیسر محمد میاں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی اپنے مقاصد کی سمت تیزی سے گامزن ہے اور یہاں سے جو طلبہ فارغ ہوں گے وہ ملک و قوم ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے کارآمد ثابت ہوں گے۔ تقریب کے آغاز میں ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد' پرو وائس چانسلر نے مہمانِ خصوصی جناب نجیب جنگ' عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر دہلی کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر وی رام کرشنا نے مطالعات دکن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جغرافیائی اعتبار سے دکن کا خطہ منفرد خصوصیت کا حامل ہے۔ یہاں مختلف النوع تہذیبی عناصر موجود ہیں۔ دکن کی سیاسی تاریخ پر تو کچھ تحقیق ہوئی ہے لیکن یہاں کی ثقافت' ادب' فن تعمیر اور مقامی روایات وغیرہ پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سلمیٰ احمد فاروقی' اعزازی ڈائرکٹر' مرکز برائے مطالعاتِ دکن نے کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ اس میں 10 مختلف زبانوں کے 135 ایسے قدیم نقشے موجود ہیں جن میں خطۂ دکن کا تذکرہ ہے۔ کتاب کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر فہیم الدین احمد' اسسٹنٹ پروفیسر ترجمہ نے کیا۔ تقریب میں یونیورسٹی کے اساتذہ' طلبہ اور غیر تدریسی عملے کے علاوہ شہر حیدرآباد کی کئی اہم شخصیتیں موجود تھیں۔ جناب عابد عبدالواسع' اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر نے نظامت انجام دی۔

پریس ریلیز، عابد عبدالواسع، اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر 20 ستمبر 2013

'برار میں اردو زبان وادب کا ارتقا'
'پیکر اور پرچھائیاں'

ناگپور: علاقہ برار میں تخلیق ہونے والے ادب کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے اپنی کتاب 'برار میں اردو زبان وادب کا ارتقا' میں پیش کر کے ایک تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اکادمی

کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد اسداللہ جو بنیادی طور پر ایک انشائیہ نگار ہیں اور اسی حیثیت سے ملک بھر میں پہچانے جاتے ہیں، ان کی کتاب 'پیکر اور پرچھائیاں' جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے شائع ہوئی ہے، اس میں بھی علاقہ ودربھ کے بھی قلم کاروں پر مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر اسداللہ نے مراٹھی اور اردو ادب میں موجود طنز ومزاح اور شاعری کے رجحانات کا بھی تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ اس لحاظ سے یہ دونوں کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف محقق وناقد ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اپنی تقریر کے دوران کیا۔ موصوف گلستان کالونی ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقدہ جلسہ میں اظہارِ خیال فرما رہے تھے۔ اس تقریب میں ان دونوں کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ مقامی ایم ایل اے شری سدھاکر راؤ دیشمکھ نے اردو اور مراٹھی زبان کے ادبی تراجم کو قومی یکجہتی اور سماجی رشتوں کے لیے مفید قرار دیتے ہوئے اس قسم کی کوششوں میں اضافہ کرنے کی اپیل کی۔ اس موقعے پر مقامی کارپوریٹر محترمہ بینا تائی تڑکے کے علاوہ جناب الحاج شیخ اسرائیل، شمیم افسر، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد اسداللہ نے بھی اپنے تاثرات بیان کیے۔

پریس ریلیز، گلستاں ویلفیئر ایسوسی ایشن، ناگپور، 9 ستمبر 2013

پوسٹ مارٹم

امروہہ: زندہ دلانِ امروہہ کی جانب سے طنز ومزاح کے مشہور شاعر ڈاکٹر نشتر امروہوی کے مجموعۂ کلام 'پوسٹ مارٹم' کا رسم اجرا ڈاکٹر شفاعت فہیم، ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، مسرور جوہر، شانِ حیدر بیباک، ڈاکٹر لاڈلے رہبر، ڈاکٹر رضی امروہوی کے دست مبارک سے برمکان آل مصطفین (چندن) محلّہ منڈی چوب عمل میں آیا۔ محفل کی صدارت ڈاکٹر شفاعت فہیم نے فرمائی اور نظامت کے فرائض شیبان قادری نے بخوبی انجام دیے۔ محفل کو خطاب کرتے ہوئے زندہ دلانِ امروہہ کے سرپرست ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ طنز ومزاح کی شاعری یقیناً ایک نازک فن ہے اور ڈاکٹر نشتر امروہوی اسے بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ نشست کا آغاز یاور علی نے مرزا ساجد کی نعت پاک پڑھ کر کیا۔ اس موقعے پر چندن نقوی، ماسٹر عمران، ندیم نقوی، ابنِ بن نشتر، احمد وغیرہ کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگ موجود رہے۔ آخر میں چندن نقوی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 اکتوبر 2013

وفیات

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند

ممبئی: بتاخیر ملنے والی اطلاع کے مطابق اُردو کے مشہور ادیب اور مجاہدین جنگ آزادی پر انگریزی اور اُردو میں تحقیقی کتابیں لکھنے والے ڈاکٹر وِدیا ساگر آنند گزشتہ جمعہ 27 ستمبر کو لندن میں انتقال کر گئے۔ پروفیسر یونس اگاسکر کے مطابق ڈاکٹر وِدیا ساگر آنند ایک مدت سے سرطان جیسے عارضے میں مبتلا تھے جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ڈاکٹر ودیا ساگر آنند یکم ستمبر 1939 کو پنجاب کے ایک قصبے شاہ پور میں پیدا ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ ان کے والد شیو دیال فرخ اپنے وقت میں اُردو فارسی کے ایک اچھے استاد اور اردو کے معروف شاعر تھے۔ ڈاکٹر وِدیا ساگر آنند برطانیہ منتقل ہونے سے قبل دہلی کی انجمن ترقی پسند مصنّفین سے وابستہ رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے قریبی دوست پروفیسر عارف نقوی (جرمنی) انجمن ہٰذا کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے جامعہ لندن سے 'انٹرنیشنل ریلیشن' میں ڈگری لی اور 'جرمنی میں مقیم ہندوستانی انقلابی' کے زیرعنوان مقالہ لکھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے 'ہندوستانی مجاہدین' کو ایک مستقل موضوع کے طور پر اپنا لیا۔ ڈاکٹر وِدیا ساگر آنند کا شعری مجموعہ 'مٹے آنند' 1993 میں منظر عام پر آیا۔ جس کا دوسرا ایڈیشن 2000 میں شائع ہوا۔ پیر کے اُردو ٹائمز میں ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی کتاب 'مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر مضامین' پر قارئین نے تبصرہ پڑھا ہوگا۔ جسے پریم گوپال متل نے مرتب کیا ہے۔

پریس ریلیز، ندیم صدیقی، ممبئی، 30 ستمبر 2013

خراج عقیدت

حکیم عبدالحمید کی یاد میں جلسہ

نئی دہلی: ہمدرد کے بانی و ملک کو قوم کے سچے خدمت گار و ہمدرد حکیم عبدالحمید کی سالگرہ اور جامعہ ہمدرد کے یوم تاسیس کے موقعے پر آج ہمدرد یونیورسٹی میں خصوصی پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس کے تحت یہاں کنونشن سینٹر میں 'حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر' کا انعقاد ہوا۔ اس موقعے پر حکیم عبدالحمید (مرحوم) کی ایک ملک

وقوم کے تئیں طبی، علمی وسماجی خدمات کو یاد کیا گیا اور انھیں 19 ویں صدی کی عظیم شخصیت قرار دیا گیا۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر ڈاکٹر جی این قاضی نے 'حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر' پیش کیا اور اپنے خطاب میں کہا کہ حکیم عبدالحمید کی ملکی اور ملی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حکیم عبدالحمید ایک بلند پائے کے مفکر، دانشور، انتہائی دوراندیش اور قوم وملت کے سچے خیرخواہ تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کی خاطر ہمدرد یونیورسٹی کی شکل میں تعلیم کی ایک ایسی جوت جلائی، جس سے آج مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مستفید ہو کر ملک و ملت کا نام روشن کر رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حکیم عبدالحمید (مرحوم) کے یوم پیدائش 14 ستمبر کی مناسبت سے یہ پروگرام ہر سال منعقد کیا جاتا ہے۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر جی این قاضی نے جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید حامد کی خدمات کا بھی اعتراف کیا اور اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر وائس چانسلر نے جامعہ ہمدرد کی جانب سے ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر سید حامد کو اعزاز سے بھی نوازا اور انھیں ایک مومنٹو پیش کیا۔ 'حکیم عبدالحمید میموریل لیکچر' میں حکیم عبدالحمید (مرحوم) کے بیٹے و ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر عبدالمعید، جامعہ ہمدرد کے رجسٹرار فردوس اے وانی، ثمر حامد کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبا، اساتذہ و دیگر سرکردہ شخصیات بھی موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 ستمبر 2013